دِلّی والے

(جلد سوم)

مرتبہ
ڈاکٹر صلاح الدین

اردو اکادمی دہلی

Collection of Prof. Muhammad Iqbal Mujaddidi
Preserved in Punjab University Library.

پروفیسر محمد اقبال مجددی کا مجموعہ
پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ شدہ

Marfat.com

Marfat.com

دلّی والے

(جلد سوم)

(''دِلّی والے'' سمینار میں پڑھے گئے خاکوں/مضامین پر مشتمل)

مرتّبہ

ڈاکٹر صلاح الدین

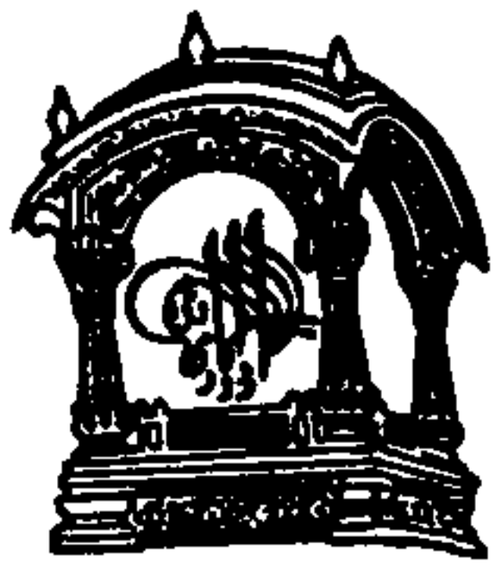

اُردو اکادمی دہلی

Marfat.com

سلسلہ مطبوعات اردو اکادمی دہلی نمبر ۱۳۰

129529

DILLI WALEY

Edited by
Dr. Salahuddin

Published by
URDU ACADEMY, DELHI

Prints
2004
Rs.75.00

ضابطہ

سنِ اشاعت
۲۰۰۴ء
چھہتّر روپے
اے۔آر۔انٹر پرائزز، کوچہ چیلان، دریا گنج، نئی دہلی
اردو اکادمی، دہلی۔۵۔ شام ناتھ مارگ، دہلی ۱۱۰۰۵۴

ISBN: 81-7121-133-X

Marfat.com

فہرست

حرفِ آغاز	سکریٹری اکادمی	۷
عرضِ مرتب	ڈاکٹر صلاح الدین	۱۱
(شاہ) ابوالحسن زید فاروقی	پروفیسر شریف حسین قاسمی	۲۰
امداد الرشید صابری	ڈاکٹر تنویر احمد علوی	۲۹
استاد چاند خاں	استاد اقبال احمد خاں	۳۵
(ڈاکٹر) اجمل اجملی	جعفر عباس	۴۴
افضل پشاوری	ڈاکٹر محمد اسلم جاوید	۴۸
(کرنیل) بشیر حسین زیدی	سید شریف الحسن نقوی	۵۷
تاج الدین	ڈاکٹر محمود فیاض	۶۵
جاوید دوشٹ	سید ضمیر حسن دہلوی	۷۳
(پروفیسر) خواجہ اَحمد فارُوقی	ڈاکٹر صلاح الدین	۸۲
دھرم پال گپتا وفا	حیات لکھنوی	۱۰۵
رشید خاں صاحب	حاجی انیس دہلوی	۱۱۰
(امام) سیّد حمید صاحب	سراج پراچہ	۱۱۹
سیّد عزیز حسن بقائی	انور علی دہلوی	۱۲۵
صالحہ عابد حسین	سیدہ سیدین	۱۳۰
(شیخ) عبدالحق پراچہ	مولانا اخلاق حسین قاسمی	۱۳۵

حاجی علی جان	مسلم احمد نظامی	۱۴۳
فکر تونسوی	مجتبیٰ حسین	۱۵۴
قیصر حیدری دہلوی	مخدوم زادہ مختار عثمانی	۱۶۴
کمار پاشی	مخمور سعیدی	۱۶۹
کوثر چاندپوری	پروفیسر ظفر احمد نظامی	۱۷۷
گوپال متل	کنور سین	۱۸۵
مالک رام	ایم حبیب خاں	۱۹۴
(پروفیسر) مونس رضا	شارب ردولوی	۲۰۲
محمد مسلم	محفوظ الرحمٰن	۲۰۸
محمد عتیق صدیقی	پروفیسر نثار احمد فاروقی	۲۱۷
(شیخ) محمد عمر لیس والے	ریاض عمر	۲۲۶
(کنور) مہندر سنگھ بیدی سحر	نارنگ ساقی	۲۴۰
ناز انصاری	پروانہ ردولوی	۲۵۱
نریش کمار شاد	من موہن تلخ	۲۵۹
ہنس راج رہبر	نند کشور وکرم	۲۶۵

☆☆☆

Marfat.com

حرفِ آغاز

دلّی ہمیشہ ہندوستان کے دل کی دھڑکنوں کا محور و مرکز رہی ہے۔ اسی لیے عالم میں انتخاب اس شہر بے نظیر کی تاریخ و تہذیب، علم و فن اور زبان و ادب کو پورے ملک کی نمائندگی کا شرف حاصل ہے۔ آزاد ہندوستان کی یہ تاریخی راجدھانی بجا طور پر اردو زبان و ادب کی راجدھانی بھی کہی جاسکتی ہے۔ اسی کے گرد و نواح میں کھڑی بولی کے بطن سے زبانِ دہلوی یا اردو نے جنم لیا جو اپنی دھرتی کی سیاسی، سماجی، تہذیبی اور معاشرتی ضرورتوں کے زیرِ سایہ نشو و نما پا کر اس عظیم تہذیب کی ترجمان بن گئی جسے ہم گنگا جمنی تہذیب کا نام دیتے ہیں اور جو ہماری زندہ و تابندہ تاریخی وراثت ہے۔

دلّی کے ساتھ اردو زبان اور اردو ثقافت کے اسی قدیم اور اٹوٹ رشتے کے پیشِ نظر ۱۹۸۱ء میں دہلی اردو اکادمی کا قیام عمل میں آیا اور ایک چھوٹے سے دفتر سے اکادمی نے اپنی سرگرمیوں کا آغاز کیا۔ آج دہلی اردو اکادمی کا شمار اردو کے فعّال ترین اداروں میں ہوتا ہے۔ اردو زبان و ادب اور اردو ثقافت کو فروغ دینے کے لیے اکادمی مسلسل جو کوششیں کر رہی ہے، انھیں نہ صرف دہلی بلکہ پورے ملک نیز بیرونی ممالک کے اردو حلقوں میں بھی کافی سراہا گیا ہے۔

اکادمی کے دستورالعمل کی رو سے دہلی کے لیفٹننٹ گورنر پہلے اکادمی کے چیئرمین ہوتے تھے، دہلی میں منتخب حکومت کے قیام کے بعد اکادمی کے چیئرمین دہلی کے وزیرِ اعلیٰ ہوگئے ہیں جو دو سال کے لیے اکادمی کے اراکین کو نامزد کرتے ہیں۔ اراکین کا انتخاب دہلی کے ممتاز ادیبوں، شاعروں، صحافیوں اور اساتذہ میں سے کیا جاتا ہے جن کے مشوروں کی روشنی میں چیئرمین کی منظوری سے اکادمی مختلف کاموں کے منصوبے بناتی اور

Marfat.com

انھیں رو بہ عمل لاتی ہے۔ اکادمی اپنی سرگرمیوں میں دہلی اور بیرونِ دہلی کے دیگر اردو اداروں سے بھی باہمی مشورت اور تعاون قائم رکھتی ہے۔

اردو اکادمی، دہلی اپنی جن گوناگوں سرگرمیوں کی وجہ سے پورے ملک میں اپنی واضح پہچان قائم کرچکی ہے، ان میں ایک اہم سرگرمی اکادمی کی طرف سے ایک معیاری ادبی رسالے ماہنامہ ''ایوانِ اردو'' اور ''بچوّں کا ماہنامہ امنگ'' کی اشاعت کے ساتھ ساتھ اعلیٰ معیار کی علمی اور ادبی کتابوں کی اشاعت بھی ہے۔

اکادمی کی یہ روایت رہی ہے کہ اس کی جانب سے منعقدہ سمینار میں پڑھے گئے مقالات کو کتابی شکل میں شائع کیا جاتا ہے۔ ''دلّی والے'' اسی سلسلۂ پیش کش کا حصہ ہے۔ یہ سہ روزہ سمینار اردو اکادمی نے نومبر ۱۹۹۶ء میں منعقد کیا تھا۔ اس سمینار کے ڈائرکٹر ڈاکٹر صلاح الدین تھے، جنھوں نے بڑی محنت اور جانفشانی سے اُن دلّی والوں پر خاکے/مضامین تیار کرائے جو اس شہر کی ادبی، سیاسی، سماجی، کاروباری اور تہذیبی زندگی کا ایک اہم حصہ رہے تھے۔ ڈاکٹر صلاح الدین نے کتاب کے شروع میں ''عرضِ مرتب'' کے عنوان سے جو مقدمہ لکھا ہے اس میں انھوں نے بہت خوبصورت انداز سے دہلی کی تاریخ، اور اس شہر کی گنگا جمنی تہذیب کا حال بیان کیا ہے۔ ہم ڈاکٹر صلاح الدین کے شکر گزار ہیں کہ انھوں نے اکادمی کے اشاعتی ذخیرے میں ایک بیش بہا اضافہ کیا ہے۔

ہم اردو اکادمی دہلی کی چیئرپرسن محترمہ شیلا دکشت کے ممنون ہیں جن کی سرپرستی اکادمی کی کارکردگی میں معاون ہوتی ہے۔ اکادمی کے وائس چیئرمین اور دیگر ممبران کے سرگرم تعاون اور مفید مشورے ہمارے لیے رہنمائی کا کام کرتے ہیں جس کا اعتراف ضروری ہے۔

ہمیں یقین ہے کہ زیرِ نظر کتاب وقت کی ایک اہم ضرورت پوری کرنے کے ساتھ ساتھ ادبی حلقوں میں پسند کی جائے گی۔

مرغوب حیدر عابدی
سکریٹری

Marfat.com

عرضِ مرتب

صاحبو! دلّی کا نام آتے ہی ایک ایسے شہر کا تصور دل و دماغ پر ابھرتا ہے جو محض اینٹ گارے پتھر کا نہ ہو کر، ہزاروں سالہ تہذیبی اقدار، معاشرت، رسومات اور تہذیب و تمدن کے بیش بہا خزانے اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ اس شہر میں گزشتہ ایک ہزار سال سے ہندو مسلم اتحاد کے نتیجے میں پیدا ہونے والی شاندار ثقافت، زبان و ادب، مخصوص معاشرت اور تمدن، مختلف فنونِ لطیفہ اور یادگارِ زمانہ عمارات کے حسین، دلفریب اور دلکش نقوش چپے چپے پر مشاہدہ کیے جا سکتے ہیں۔ اس کی اس خصوصیت اور صفت کو دوبالا کرنے میں ہندو مسلمان دونوں نے ہی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔ پھر جب کمپنی بہادر کی عملداری کا عہد شروع ہوا تو انگریزوں نے بھی اس شہر کو مزید نکھار سنوار کے اس کے حسن پر اور چار چاند لگائے، انھوں نے قدیم دلّی کے پہلو بہ پہلو نئی دلّی بسائی۔ پارلیمنٹ، راشٹر پتی بھون اور انڈیا گیٹ کی تعمیر کی۔ کشادہ سڑکیں بنوائیں اور ان کے دونوں جانب مختلف نوع کے سرسبز شاداب درخت لگائے۔ سبزہ زار تیار کیے اور دلّی کی وجاہت و حشمت میں اضافہ کیا۔

دلّی کی آب و ہوا ہمیشہ ہمیش سے مردم خیز بھی رہی ہے اور مردم خیز بھی، یہاں کی مٹّی میں جاذبیت کا یہ عالم ہے کہ جو یہاں آتا ہے اور بستا ہے پھر وہ یہیں کا ہو کر رہ جاتا ہے۔ یعنی یہ شہر واقعتاً اسم با مسمّٰی ہے اس کو ''دلی لی'' یعنی دل لے لینے والی کہا جاتا ہے جو ہر آنے والے کے دل کو موہ لیتی ہے، شاید اس شہر کی اسی کشش ثقل کی بنا پر اسے 'حضرتِ دلّی' بھی کہا جاتا رہا ہے۔ صدیوں اور قرنوں سے اس تہذیبی شہر کی شہرت چار دانگ پھیلی ہے۔ اس شہرِ بے مثال کو شہرِ انقلاب بھی کہا جاتا ہے کیوں کہ یہ بار بار اجڑی اور بار بار بسی ہے۔ دنیا کی درجنوں زبانوں میں

Marfat.com

درجنوں کتابیں اس کی تاریخ وثقافت پر لکھی جا چکی ہیں۔ اردو زبان وادب کے تعلق سے تو اس شہرِ لازوال کی اہمیت مزید براں کے مصداق ہے، اتنے شہر آشوب اور اسی قدر کتابیں موجود ہیں۔ سرسید احمد خاں کی ''آثار الصنادید'' اور مولوی بشیر الدین کی ''واقعاتِ دارالحکومت'' سے لے کر نہ جانے کتنی کتابیں اس شہر کی قصیدہ خواں ہیں۔ ہندوستان میں ایسے کسی دوسرے شہر کی نظیر ملنا دشوار ہے، یہ شہرت، یہ عزت، یہ محبت صرف اور صرف دلّی کے حصے میں آئی ہے اور یہ عظمت وحشمت صرف اسی شہر کا مقدر بنی ہے۔ اس کی تمدنی تاریخ لگ بھگ تین ہزار سال پر محیط ہے، اس نے سینکڑوں بادشاہوں اور راجاؤں کے عہد بنتے اور بگڑتے دیکھے ہیں، بیسیوں تہذیبوں کے عروج وزوال کا مشاہدہ کیا ہے۔ کتنے ہی رشیوں اور جگت گروؤں نے یہاں گرہن استھان کیا ہے، کتنے ہی صوفیائے کرام نے یہاں رہ کر بلا امتیاز مذہب وملت محبت وآشتی کا درس دیا ہے، انسانیت اور انسانی بھائی چارے کی تعلیمات کو عام کر کے اپنے قول وفعل سے اس شہر کی زینت کو بڑھایا اور پھیلایا ہے جبھی تو دلّی کو بائیس خواجگان کی چوکھٹ سے تعبیر کیا جاتا ہے، یہ کتنے ہی علمائے کرام اور بزرگانِ دین کا مسکن رہا ہے... اس کی مشترکہ تہذیب کے پنپنے، پھلنے اور پھولنے کا یہ عمل کل بھی جاری تھا، آج بھی جاری ہے اور آنے والے کل میں بھی جاری وساری رہے گا۔ یہاں کی سماجی زندگی اور معاشرت کے مختلف النوع رنگ وقت گزرنے کے ساتھ مزید گہرے ہوتے چلے جائیں گے۔ اس شہر کی جغرافیائی ثقافت کی تاریخ قابلِ ذکر بھی ہے اور قدیم وعظیم بھی ہے۔ یہاں کے چاروں اطراف میں پھیلی ہوئی سینکڑوں تاریخی عمارتیں اس کی پوری تاریخ کو بیان کرتی ہیں جو اس شہرِ بے مثال کے شاندار ماضی اور جاندار حال کی غماز ہیں۔ اس کی کشادہ سرسبز وشاداب سڑکیں اور باغات آج بھی باعثِ کشش اور قابلِ دید ہیں۔

دلّی نہ جانے کتنی بار مٹی اور کتنی بار بنی، لیکن دلّی اور دلّی والوں کی تہذیب آج بھی تاریخ کا سب سے سنہری اور دیدہ افروز صفحہ ہے۔ دلّی کی رونق بقول مرزا غالبؔ ''کئی ہنگاموں پر مشتمل تھی، قلعہ، چاندنی چوک، ہر روز بازار مسجد جامع کا، ہر ہفتے سیر جمنا کے پل کی، ہر سال میلہ پھولوں والوں کا''۔ رنگینیٔ طبع، شوخیٔ مزاج، زندہ دلی اور وسعتِ قلبی، یہاں کے رہنے والوں کی اقدار وعقائد کا محور ومرکز رہا ہے۔ دلّی اب چاہے وہ دلّی نہ رہی ہو جس کی ستائش ہم مورخین اور ادباء کی زبانی سنتے آئے ہیں لیکن خاکِ پاک دلّی کا اگر بغور مشاہدہ کیا جائے تو ان عناصر کے نقوش آج بھی کہیں مدھم کہیں گہرے، زندہ وپائندہ نظر آجاتے ہیں۔ یہاں کے ٹوٹے پھوٹے

آثاراور نقوش فصیل شہر کے اندر پائے جانے والے ثقافتی آثاراب بھی زبانِ حال سے دلّی مرحوم کا فسانہ سنا کر مولانا حالؔی کے اس قول کی تائید کرتے ہیں کہ:

چپّہ چپّہ پہ ہے یاں گوہر یکتا، تہ خاک
دفن ہوگا نہ کہیں ایسا خزانہ ہرگز

مغلیہ تہذیب وتمدن کی آخری بہار ۱۸۵۷ء تک کی دلّی تھی مگر اس کے مدھم نقوش تقریباً اگلے سو سال یعنی ۱۹۴۷ء تک پائے جاتے تھے اور یہ نقوش پژمردہ ہونے کے باوجود بھی بعض اعتبار سے انتہائی دلکش تھے۔ منشی فیاض الدین کی ''بزمِ آخر'' پر نظر ڈالی جائے جس میں انھوں نے دلّی کے دو آخری بادشاہوں اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ ظفر کا طریقِ معاشرت بیان کیا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ خواب و خیال کی ایک ایسی دنیا تھی جس میں سب مگن تھے۔ لال قلعہ کی سیاسی مرکزیت تو ختم ہو چکی تھی لیکن اس کی تمدنی اور تہذیبی مرکزیت اور بھی نمایاں ہوگئی تھی، یہاں کے جشن، میلے ٹھیلے، ادبی محفلیں، مشاعرے اور مزاجیے پورے شہر کے تہذیبی اور معاشرتی مزاج کو متعین کرتے تھے۔ ایسے عالم میں بھی لال قلعے کا دربار ہندو مسلم مشترکہ تہذیب کا بہترین آئینہ دار تھا۔ یہاں نوروز بھی ہوتا تھا، مدار کی چھڑیاں بھی، محرم بھی۔

حضرت غوث الاعظم کی گیارہویں شریف بھی، شب برأت بھی، ہولی بھی، دسہرہ بھی، دیوالی بھی، راکھی اور سلونے بھی، بسنت بھی اور پھولوں والوں کی سیر بھی... عظیم تاریخی ارتقاء کا یہ شہر ایسے بے حد پرتمول تہذیبی ورثے کا نشان ذیشان تھا۔ اس کے پُر شکوہ گنبد، پُر عظمت مینار، شاندار مسجدیں، خوبصورت مندر اور گرودوارے، حسین حویلیاں، پُر پیچ اور طلسم ہوشربا گلیاں و پُر رونق بازار اور کوچے بقول شاعر ''اوراق مصوّر'' تھے۔ علم وفن کی روایتوں کے امین مدرسے، شانتی کا اُپدیش دینے والے آشرم اور پُر تقدیس خانقاہیں اس ثقافتی اور تہذیبی روایات کا عکس پیش کرتے ہیں، جس نے اس شہر کی محرابِ زندگی کو قوس وقزح کے نیم دائرے کی طرح ہفت رنگ بنا دیا تھا۔

مہذب انسانوں کی طرح ہر تہذیبی شہر کا بھی ایک مزاجِ زندگی بن جاتا ہے جس کا تعلق صدیوں سے ہوتا ہے۔ دلّی کا علاقہ وہ خطۂ زمین ہے جہاں ارضیاتی طور پر عظیم ہمالیائی اور اراولی پہاڑیوں کے سلسلے ملتے ہیں اور لسانی اعتبار سے یہاں راجستھانی، میواتی، ہریانوی، برج اور کھڑی بولیاں ایک دوسرے سے ملتی اور مختلف زبانوں میں ایک دوسرے کو متاثر کرتی نظر آتی ہیں... شاید تہذیبی طور پر ثقافتی وتمدنی طور پر اور لسانی طور پر اشتراک وہم آہنگی کا ایک بڑے مرکز

Marfat.com

کے طور پر یہاں فروغ پانا اور ہندوستان بھر کی تہذیبی تمدنی تاریخ کے بڑے نقشے میں دھنک کے سے یہ رنگ بھرنا اس سرزمین کا مقسوم تھا۔

دلّی کی آرام و مصائب کی کہانی دہرانے والے نہ جانے کتنے واقعات تاریخی کتابوں میں موجود ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ عیش و عشرت اور زندہ دلی کے رنگین حاشیے بھی ان داستانوں کی زینت ہیں جیسا کہ مذکور کیا گیا ہے کہ دلّی کی زندگی مجموعی طور پر رنگین اور خوش باش پر مبنی تھی اور یہاں پر ہونے والے طرح طرح کے میلوں ٹھیلوں نے بڑی بوقلمونی اور نشاطیہ کیف پیدا کردی تھی، یہاں پر مختلف قسم کے نیم مذہبی اور سماجی میلے بھی ہوا کرتے تھے، خود محلات شاہی اور رؤساء کی حویلیوں میں آئے دن کوئی نہ کوئی جشن بپا رہتا تھا۔ کبھی تورے بندی، کبھی نوروز، کبھی رت جگے، کبھی آخری چہار شنبہ، کبھی خواجہ صاحب کی چھڑیاں، کبھی صوفیائے کرام کے مزارات کے عروس اور سماع کی محفلیں بسنت کے موقع پر قدم شریف میں مجمع لگتا تھا، سارا شہر دلہن کی طرح سجایا جاتا تھا۔ فرش بچھتے تھے، قوالیاں ہوتی تھیں، حال وقال کی محفلیں سجتی تھیں... ان سب چیزوں سے اہلِ دلّی کی عام رنگین مزاجی اور تفریح طبعی کے ثبوت فراہم ہوتے ہیں۔ سیاسی ابتلاء اور آزمائش کے اس دور میں بھی ایک طرف قلعہ معلّٰی فنونِ لطیفہ کی پرورش اپنے خونِ جگر سے کر رہا تھا اور دوسری طرف امراء و رؤساء کے دیوان خانوں میں علم و ہنر اور شعر و سخن کی پرورش کا سلسلہ نہ صرف جاری رہا بلکہ اس میں روز بروز ترقی ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے دلّی میں ہر طرف یکتائے روزگار ہنرمند اور بے مثال اہلِ حرفہ نظر آنے لگے۔

دلّی کا سب سے عظیم الشان کارنامہ وہ تہذیب ہے جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے مشترکہ کلچر سے وجود میں آئی۔ ہندو مسلمان سب کی زندگی میں یہاں ایک طرح کے آداب و رسوم رائج تھے، ساتھ ہی دونوں نے مشترکہ علمی اور ادبی ذوق بھی پیدا کرلیا تھا۔ مشترکہ تہذیب و ثقافت کا یہ سلسلہ تقریباً ایک ہزار سالوں میں پھیلا ہوا ہے۔ اس دلآویز تہذیب کو بنانے سنوارنے میں ان سینکڑوں سالوں میں ہزاروں لاکھوں شخصیتوں نے شعوری اور لاشعوری دونوں طور پر حصہ لیا ہوگا۔ یہاں آکر بسنے والوں اور یہاں پیدا ہونے والوں میں ہر مذہب، ہر رنگ، ہر طبقۂ فکر اور ہر شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والی ان گنت شخصیات رہی ہوں گی جنھوں نے اپنے اپنے خونِ دل سے اس مشترکہ تہذیب کی آبیاری کی ہوگی...

ہمارے عہد اور ماضی قریب میں بھی ایسے بے شمار لوگ رہے ہیں جنھوں نے دلّی کی تہذیبی

Marfat.com

وتمدنی، ثقافتی، ادبی، سماجی، معاشی اور معاشرتی زندگی کے کسی نہ کسی پہلو کو اجاگر کرنے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ دلّی کے حوالے سے ایسی شخصیات کی نشاندہی کرنے کی ادنیٰ سی یہ کاوش اردو اکادمی، دہلی کے پلیٹ فارم سے ہونے والے ''دلّی والے'' سمینار (سلسلۂ سوم) کے ذریعہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے:

گر قبول افتد زہے عز و شرف

شخصیتیں اپنے اپنے دائرے میں کسی خاص تہذیب، کسی دور کی تاریخ وثقافت اور کسی عہد کے فکر وفن کو پیش کرتی ہیں لیکن ایک ہی طرح نہیں بلکہ الگ الگ انداز کے ساتھ... کچھ شخصیتیں بڑی تہذیبوں کی علامت ہوتی ہیں، ہم ان شخصیتوں میں اس تہذیب کو بھی بالکل ایسا ہی سمٹا ہوا دیکھتے ہیں جیسے آنکھ کے تل میں آسمان سمٹا ہوا نظر آتا ہے۔

ہمارے موجودہ عہد میں حضرت مولانا اخلاق حسین قاسمی صاحب اور جناب سکندر بخت صاحب ایسی ہی شخصیات ہیں۔ اس کو اگر ہم ایک دوسرے دائرے میں دیکھنا چاہیں تو خشونت سنگھ، حضرت خواجہ حسن ثانی نظامی، جناب گلزار دہلوی، پروفیسر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر خلیق انجم اور سیّد ضمیر حسن دہلوی جیسی شخصیتوں میں ہم نئے عہد کے رجحانات کو بھی دیکھ سکتے ہیں اور اس تاریخی روایت کو بھی جو صدیوں کے تسلسل میں پھیلی ہوئی ہے... ایک نقطۂ نظر سے ابھی ماضی قریب میں اگر بیرسٹر نورالدین، لالہ شام ناتھ، مرزا محمود بیگ، برجموہن دتاتریہ کیفی اسی تسلسل کی کڑیاں تھے تو دوسرے زاویۂ نگاہ سے بیرسٹر آصف علی، حکیم اجمل خاں، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، مولانا احمد سعید، مفتی کفایت اللہ، مولانا محمد مسلم، مہیشور دیال جی، جناب عبدالحمید اور جناب میر مشتاق کی دلآویز شخصیتیں بھی ابھر کر سامنے آئی ہیں اور جب ہم سیاق وسباق کو کچھ بدل دیتے ہیں تو مسز اروناآصف علی، مسز اندرا گاندھی اور بیگم حمیدہ سلطان سامنے آتی ہیں... کچھ ایسی شخصیتیں بھی ہوتی ہیں جن کے نمایاں اور پُرکشش خدوخال کو ہم ایک خاص زاویے سے دیکھتے ہیں، ایسی شخصیات کبھی اپنے پیشوں، کبھی برادریوں یا کسی فن میں ہنرمندی اور مہارت حاصل ہونے کی وجہ سے پہچان بنالیتی ہیں۔ خدا بخشے استاد رسا دہلوی، بادشاہ پہلوان، کالے بابا کبابی، بھائی تاج الدین (شیریں بھون والے) مالودودھ والے، کریم الدین (کریم نعمت کدہ والے)، چھتمن بادرچی، اومی چاٹ والے، چورسیا پان والے، سلطان چاندی والے حاجی نورو مسالے والے، شبراتی نہاری والے اور اس قبیل کے بے شمار افراد اس شہر کی ثقافتی اور معاشرتی تہذیب

Marfat.com

کے سلسلے درسلسلے کا بیش قیمت حصہ ہیں اور اپنے اپنے میدان میں نمایاں اہمیت کے حامل ہیں۔ صدیوں کی تاریخ کے امین اس شہر دلپذیر میں ایسی نسبتوں سے پنپنے اور نمو پذیر ہونے والے کردار اپنی منفرد شناخت کے ساتھ شہر کے ہر محلے اور بازار اور ہر گلی کوچے میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ ایسی شخصیتوں کے بظاہر بہت عمومی خدوخال میں دہلوی تہذیب کے مرئی اور غیر مرئی عکس جھلکتے ہیں، لہٰذا اس طرح کی شخصیتوں کو بہت عام اور بہت عمومی نگاہ سے نہیں دیکھنا چاہیے۔ ان کے رویے، ان کی وضع داریاں اور ان کی اپنی شخصی انفرادیت الگ ہوتی ہے۔ ہمیں ان کی طرف الگ سے سفر کرنا پڑتا ہے، اگر ہم اپنی ادبی تاریخ پر نظر ڈالیں تو ہمیں مرزا ظاہر دار بیگ یا خوجی کے کردار اور آگے چلے جایئے تو خواجہ سگ پرست کی فرضی شخصیات نظر آئیں گی۔ کیا یہ اور ان جیسی دوسری شخصیات ایسی نہیں ہیں جن میں ہمیں اپنی بھولی بسری تہذیبوں کے کچھ خدوخال آج بھی نظر آجاتے ہیں۔

''دلّی والے'' کے عنوان سے یہ سمینار اور اس سے پیشتر کے دو اور سمینار ایسی ہی شخصیات کی کھوج اور حوالے سے جڑے ہوئے ہیں۔ ان سمیناروں کی وساطت سے دلّی جیسے عظیم الشان شہر کے ان تمام خدوخال کی شناخت کرانا بھی مقصد تھا جن کے امتیازات پر ایک عام نگاہِ انتخاب کبھی پڑتی ہے کبھی نہیں پڑتی ہے۔

جس طرح تعمیرات کی کہانی اپنی ایک شناخت ہوا کرتی ہے اور اپنے دور کی تہذیب و ثقافت اور تخریب و تعمیر کی کہانی بھی ہوتی ہے ایسی عمارتیں یا ان کے کھنڈرات ہی نہیں بلکہ ان کی کوئی محراب، کوئی ستون، کوئی جالی یا کوئی پتھر بھی کلیدی حیثیت میں سامنے آتا ہے اور بہت سے ایسے حقائق کو نمایاں کر دیتا ہے جو بظاہر ہماری نگاہوں سے اوجھل رہتے ہیں یا چھپ گئے ہوتے ہیں۔

ان سمیناروں میں پیش کی جانے والی شخصیتوں پر کی جانے والی گفتگو دراصل پچھلی کئی صدیوں کی تاریخ پر ایک نگاہ عکس ریز ڈالنے کی سمت ایک قدم ہے اور جن شخصیات پر جن اہلِ قلم حضرات نے قلم اٹھایا ہے یہ وہ اصحابِ قلم ہیں جن کو متعلقہ شخصیات سے یا تو قربت رہی ہے یا ایک طرح کا تعلقِ خاطر رہا ہے پھر جن شخصیات کو سمینار کا موضوع بنایا گیا ہے ان کا تعلق بھی یا تو دلّی کی مخصوص تہذیب سے رہا ہے یا پھر ان شخصیات کو ملک کی تاریخ کے بڑے سیاق و سباق میں دیکھا اور پہچانا گیا ہے۔

جب میر یہ کہتے ہیں کہ میرے کلام کی سند جامع مسجد کی سیڑھیاں ہیں تو وہ ان ''اوراقِ

Marfat.com

مصور" کی تردید نہیں کر رہے تھے، جن کا ذکر وہ اپنے اس شعر میں کر چکے ہیں:

دلّی کے نہ تھے کوچے، اوراقِ مصور تھے
جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

بلکہ وہ تو شہر اور قلعے کے درمیان جو دیکھے اَن دیکھے ذہنی اور لسانی رشتے موجود تھے اور جن ثقافتی روابط کو تاریخ نے جنم دیا تھا... جامع مسجد کی سیڑھیاں انھیں سمبلائز کر رہی تھیں اور دیکھا جائے تو آج بھی یہی صورتِ حال ہے اور شاید کل بھی رہے، کیوں کہ ان سیڑھیوں سے بادشاہ بھی مسجد میں داخل ہوتا تھا اور ایک دَرویش بے نوا بھی۔ اہلِ خانقاہ بھی آتے تھے اور اہلِ دربار بھی۔ تاجر پیشہ لوگ بھی آتے تھے اور فقرائے باب اللہ بھی... اس لیے اگر اس پس منظر میں دیکھا جائے تو بات سمجھ میں آتی ہے... جامع مسجد کی سیڑھیوں کو سند کا درجہ دینے والا صرف دو چار بے جان اور بے حس پتھروں کی طرف اشارہ نہیں کر رہا بلکہ فکر و نظر کے اس قافلے اور خیال و خواب کے ان کاروانوں کا نام لے رہا ہے جو یہاں سے گزرے ہیں اور جن کی گواہ جامع مسجد کی یہ سیڑھیاں ہیں۔

اصل میں تہذیبیں تین سطحوں پر زندہ رہتی ہیں ایک اپنے عہد کے فنونِ لطیفہ کے نمونوں میں، دوسری علمی کتابوں کے نمونوں میں اور تیسری تہذیبی شخصیتوں کی صورتوں میں اور ایسی ہی شخصیتوں کا تعارف اس کتاب کے ذریعہ آپ کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے۔ ان کے بارے میں سوچتے جایئے، تاریخ کے گمشدہ اوراق کھلتے جائیں گے اور داستانوں کے کردار نہیں، زندگی کی داستان کے کردار سمجھ میں آئیں گے۔ دلّی کو" جہاں آباد" کہا جاتا تھا اور دکن والے اسے ہندوستان کہتے تھے۔ ہم جب دلّی کی شخصیتوں کا ذکر کرتے ہیں تو درحقیقت پورے ہندوستان کا دل اس میں دھڑکتا ہوا دیکھا جا سکتا ہے۔ جیسے درخت ایک دوسرے کو اپنی آب و ہوا سے زندہ رکھتے ہیں اسی طرح بڑی تہذیبوں سے وابستہ شخصیتیں بڑی تہذیبوں کے خدوخال کو آئینہ بنا دیتی ہیں۔ جب میر یہ کہتے ہیں:

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ صرف اپنے بارے میں نہیں کہہ رہے ہیں بلکہ ایک تہذیبی علامت کے طور پر ایسا کہہ رہے ہیں۔ وہ جس تہذیبی وراثت کو پیش کر رہے ہیں یہاں ایسی ہی شخصیتوں کا

ذکر کیا جارہا ہے جو صرف دلّی کو ہی Reperesent نہیں کرتیں بلکہ ان قافلوں کی نمائندگی بھی کرتی ہیں جنھوں نے دریائے جمنا کے کنارے آکے وضو یا اشنان کیا۔ آپ کو ان شخصیتوں میں وہ خدوخال بھی نظر آئیں گے جو بڑی تہذیبوں کے باقی ماندہ خدوخال ہوتے ہیں۔

میں امید کرتا ہوں کہ جو مقالے، جو خاکے یا جو تعارف نامے اس سمینار میں پیش کیے گئے تھے اس میں دلّی کا کوئی نہ کوئی عکس ضرور ابھرا ہوگا۔ اس شہر کی تہذیب، یہاں کی فن کاری، یہاں کی شرافت، یہاں کی زبان دانی اور زبان سازی کا کوئی نہ کوئی ایسا پہلو ضرور سامنے آیا ہوگا جو دلّی کی روایتوں کو دور تک پھیلاتا ہوا اور دیر تک اس کا ساتھ دیتا ہوا نظر آئے گا۔ اس کتاب میں شامل تمام شخصیتیں خود اپنی ذات میں ایک انجمن تھیں اور اس لیے تھیں کہ یہ دلّی کے دھڑکتے ہوئے دل کی آئینہ داری کرتی تھیں۔ دلّی کا کہانیوں، قصوں، داستانوں اور شاعری میں ذکر آتا ہے۔ یہاں کی عمارتیں بھی Language of the city ہیں، لیکن اس کا چلتا پھرتا، جیتا جاگتا متحرک اور غیر منقسم عکس ہمیں ان شخصیات میں بھی نظر آتا ہے۔

سکندرِ اعظم سے لے کر سکندر بخت تک دلّی والوں نے ہزاروں سال کا سفر طے کیا ہے اور ہند آریائی، ہند یونانی اور ہند ایرانی تہذیب کے تصور، حسن اور تصویرِ حال و خیال سے گزرتے رہے ہیں لیکن مذکورہ شخصیات کو پڑھ کر کچھ وقت کے لیے نگاہیں اپنا سفر بند کر دیتی ہیں اور ایک نکتۂ خیال پر مرکوز ہو کر رہ جاتی ہیں۔ ان شخصیات کے بغور مطالعے سے یہ بھی سمجھ میں آتا ہے کہ دلّی اور دہلویت کیا ہوتی ہے، ان کے بارے میں گفتگو سنی جائے تو پھر آنکھوں کے ساتھ کان بھی گواہی دیتے ہیں کہ صرف زبانوں کی نہیں، تہذیبوں کی موسیقی کیا ہوتی ہے۔

بہ عنوان ''دلّی والے'' کے مقالات، مضامین (جلد سوم) کی شکل میں شائع ہو کر آپ کے سامنے ہیں۔ خاکے یا مضامین کیسے ہیں اس کا فیصلہ تو قارئین کریں گے، لیکن اس سمینار کو انعقاد کرانے کے حوالے سے میں اپنی اخلاقی اور بنیادی ذمہ داری سمجھتا ہوں کہ میں سب سے پہلے اپنے مکرم و محترم جناب سکندر بخت صاحب اور اپنے برادر محترم اور شفیق دوست جناب سراج پراچہ صاحب اور پھر استاد محترم پروفیسر گوپی چند نارنگ صاحب کا شکریہ ادا کروں جن کی مساعی جمیلہ سے سمینار منعقد ہو سکا۔ اس سمینار کو انعقاد کرانے سے لے کر اشاعت کی منزل تک پہنچانے میں اکادمی کے سابقہ اور موجودہ سکریٹریز اور ان کے رفقائے کار کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض عین سمجھتا ہوں کیوں کہ ان عزیزانِ گرامی کے سرگرم عملی تعاون کے بغیر اس سمینار کا ہونا اور اشاعت

کے مراحل کا پایۂ تکمیل تک پہنچانا ممکن نہیں تو دشوار ضرور تھا۔ اس کتاب میں شامل خاکوں اور مضامین کی ترتیب حسب سابقہ حروف تہجی کے اعتبار سے رکھی گئی ہے۔ آخر میں ان تمام خاکہ نگاروں اور مضمون نگاروں کا شکریہ ادا کرنا بھی میرے فرائض میں شامل ہے کہ جن کی تحریریں اس کتاب کی زینت بنی ہیں یہ سب حضرات اور ان کی تحریریں ہمارے لیے معتبر بھی ہیں اور خاصے کی چیز بھی ہیں۔ میں اپنی طرف سے اور اردو اکادمی، دہلی کے ارباب حل وعقد کی جانب سے ایک بار پھر ان سب کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

(ڈاکٹر) صلاح الدین

Marfat.com

پروفیسر شریف حسین قاسمی

شاہ ابوالحسن زید فاروقی

دلّی ایک عجیب وغریب شہر ہے۔ یہ محض ایک شہر اور آبادی نہیں، بلکہ ایک تہذیب، ایک تمدن اور ایک شاندار تاریخ کا نام ہے۔ اسے عرصۂ دراز سے ہندوستان کا سیاسی مرکز ہونے کا شرف حاصل ہے، اسی وجہ سے اسے ''حضرتِ دہلی'' کہا گیا ہے۔ بادشاہوں کے درباروں میں اگر یہاں ایک طرف ہندوستان کی سیاسی تقدیر لکھی جاتی رہی، تو دوسری طرف یہاں کے گلی کوچوں میں، درباروں سے بے نیاز، اپنی اپنی درسگاہوں اور خانقاہوں میں گوشہ نشین علماء، صوفیا اور مشائخ علم ومعرفت کی شمعیں روشن کیے رہے۔ اس وجہ سے مورخین اور اہلِ علم نے دہلی کو قبۃ الاسلام، بغدادِ ہند، خردِ مکہ وغیرہ کے محترم خطابات سے یاد کیا ہے۔ دلّی کو اگر کبھی سیاسی زوال کا منہ دیکھنا پڑا تو اصل علم نے اس کے علمی وقار کو کبھی ٹھیس نہیں پہنچنے دی۔ دلّی ہر زمانے میں علم و معرفت کا مرکز رہی۔ تشنگانِ علم یہاں آکر اپنی پیاس بجھاتے رہے۔ دلّی کی انھی قدیم علمی روایات کی حامل خانقاہ شاہ ابوالخیر، اس کے متوسلین اور وابستگانِ ترکمان دروازے اور چتلی قبر کے درمیان اسی مقام پر شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی کے وابستگان سکونت پذیر رہے۔ حضرت شاہ ابوالحسن زید فاروقی بھی، جن کا ذکر اس وقت مقصود ہے، اس خانوادۂ علم ومعرفت کے چشم وچراغ تھے۔

شاہ ابوالحسن زید فاروقی صاحب کے والد حضرت شاہ محی الدین عبداللہ ابوالخیر مجددی فاروقی، جو سلسلۂ مجددیہ کے ایک بلند پایہ عالم اور صاحبِ طریقت بزرگ تھے، دلّی منتقل ہوئے اور اسی خانقاہ میں ۱۶ر فروری ۱۹۳۳ء کو ان کا وصال ہوا۔ حضرت شاہ ابوالحسن زید صاحب نے اپنے خاندان کی ایک مفصل تاریخ ''مقاماتِ خیر'' کے عنوان سے تالیف کی ہے

جو شائع ہو چکی ہے۔ زید صاحب نے میرے والد محترم جناب مولانا اخلاق حسین قاسمی صاحب کے کہنے پر چند صفحات پر مشتمل اپنے حالات خود اپنے قلم سے لکھے اور انھیں بھیجے تھے۔ حضرت شاہ ابوالحسن زید فاروقی صاحب کے احوالِ زندگی کے بارے میں یہ چند صفحات بیشتر انھی دو مآخذ پر مبنی ہیں۔

حضرت شاہ صاحب کی ولادت ۲۵ رمضان المبارک ۱۳۲۴ھ مطابق ۱۳ نومبر ۱۹۰۶ء کو درگاہ شاہ ابوالخیر میں ہوئی، جہاں ان کا خاندان سکونت پذیر تھا۔ ابتدا میں افغانستان کے علماء اور صلحاء نے آپ کی تربیت کی۔ آپ کے والد کی ہدایت کے مطابق خاندان کے بچوں کو ہر کسی سے ملنے جلنے کی اجازت نہیں تھی۔ زید صاحب کو جن حضرات نے دیکھا یا جنھیں ان سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے وہ اس حقیقت کا اعتراف کریں گے کہ آپ نے آخر تک الگ تھلگ زندگی گزاری اور یہ اسی ابتدائی تربیت کا نتیجہ تھا۔ خود شاہ صاحب نے اس بارے میں اپنے مسلک کا ذکر کیا، جو بعد میں بیان کیا جائے گا۔

زید صاحب کو اردو، حساب وغیرہ کی تعلیم کے لیے ایک مدرسے میں داخل کرا دیا گیا، جہاں آپ نے ساتویں کلاس تک تعلیم حاصل کی۔ اسی کے ساتھ ساتھ آپ گھر پر بھی مختلف علماء سے دینیات کا درس لیتے اور قرآن حکیم حفظ کرتے تھے۔ تعلیمی مشاغل کی کثرت کی وجہ سے آپ بہرحال قرآن کریم حفظ نہیں کر سکے، جس کا آپ کو ساری عمر افسوس رہا۔

آپ کے والد صاحب کے علاوہ مولانا محمد عمر، جناب ملّا امان اللہ صاحب، مولوی خیر محمد صاحب وغیرہ نے آپ کو کافیہ، نحو میر، رقعاتِ عالمگیری اور علم عروض کی تعلیم دی۔ ۱۳۴۴ھ/ ۱۹۲۴ء میں آپ کو مدرسہ عبدالرب، کشمیری گیٹ میں داخل کر دیا گیا۔ آپ نے دو سال تک اس درسگاہ میں معارفِ اسلامی کی تعلیم حاصل کی۔ ذاتی صلاحیت کی وجہ سے آپ کے اساتذہ آپ ہی سے کلاس میں درسی کتب کی قرأت کراتے تھے۔ اس درسگاہ میں آپ کے اساتذہ جہاں معارف اسلامی کے تبحر عالم تھے وہیں صاحبِ نسبت بزرگ بھی تھے۔ آپ نے ''مقاماتِ خیر'' میں اپنے بعض اساتذہ کا مختصر ذکر کیا ہے جو اس لیے بھی اہم اور تاریخی ہے کہ غالباً ان میں سے بعض اساتذہ کا مختصر ذکر کیا ہے جو اس لیے بھی اہم اور تاریخی ہے کہ غالباً ان میں سے بعض کے احوال کسی دوسری جگہ مشکل ہی سے دستیاب ہوں گے۔

مدرسہ عبدالرب سے فراغت کے بعد زید صاحب کا علمی شوق انھیں مصر میں جامعہ ازہر لے

گیا۔آپ نے اپنے چھوٹے بھائی شیخ ابوالسعد سالم کے ساتھ ہفتہ ۲۲ر ذی قعدہ ۱۳۴۹ھ/ ۱۱ر اپریل ۱۹۳۱ء کو دہلی سے بمبئی کے لیے روانہ ہوئے اور بمبئی سے منگل ۳ر ذی الحجہ ۱۳۴۹ھ مطابق ۲۱ر اپریل ۱۹۳۱ء کو سمندری جہاز سے مصر تشریف لے گئے۔ مصر میں آپ نے متعدد علماء سے کسب فیض کیا۔ وہاں سے حج پر بھی گئے۔ اس سفر کے دوران زید صاحب نے مختلف مشہور معتبر علماء سے علمی استفادہ کیا اور اجازت نامے حاصل کیے۔ واپسی پر آپ نے دنیائے اسلام کے اہم مراکز کا دورہ بھی کیا۔ تل ابیب، بیروت، دمشق، بغداد وغیرہ تشریف لے گئے۔ ۱۶ر جنوری ۱۹۳۶ء کو آپ سمندری راستے سے کراچی تشریف لائے۔ وہاں کچھ روز قیام کیا اور ۲۰ر جنوری ۱۹۳۶ء کو دہلی پہنچے۔ اس کے بعد آپ یہاں نقشبندیہ مجددیہ سلسلے کی ترویج و اشاعت میں مصروف ہوگئے۔ ۱۹۶۶ء سے تاحیات آپ نے دلّی کی شاہی عیدگاہ میں امامت کے فرائض انجام دیے۔ ابھی عرض کیا گیا کہ مولانا زید صاحب تکمیل علم کے لیے مصر تشریف لے گئے تھے۔ مجھے اس سلسلے میں ایک واقعہ یاد آتا ہے۔ یہ مقام جسے آج خانقاہ ابوالخیر کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، کوئی معمولی جگہ نہیں۔ اس جگہ سے مولانا زید صاحب کے خاندان کے علماء ومشائخ نے علم ومعرفت کی روشنی پھیلائی تھی۔ دور دراز علاقوں سے طالبانِ علم کسب فیض کے لیے یہاں حاضر ہوتے تھے۔ شاہ عبداللہ غلام علی دہلوی حضرت مظہر جانِ جاناں کے مرید و خلیفہ تھے۔ سارے عالمِ اسلام میں ان کے علم وفضل کی شہرت تھی۔ مولانا خالد کردستان کے ایک معروف عالم تھے، لیکن انھوں نے علم ومعرفت میں اپنی تکمیل کے لیے شاہ غلام علی دہلوی سے کسب فیض کو ضروری سمجھا۔ دہلی آئے، ایک سال آپ کی خدمت میں رہے، نقشبندی سلسلے میں بیعت ہوئے۔ شاہ غلام علی دہلوی نے آپ کو اپنی خلافت عطا کی۔ انہی مولانا خالد کرد کی متعدد خانقاہیں اور تکیے دنیائے عرب کے بیشتر علاقوں میں رشد وہدایت کی روشنی پھیلانے میں آج بھی سرگرمِ عمل ہیں۔

مولانا زید صاحب کو مطالعے سے خاص دلچسپی تھی۔ آپ نے ایک گرانقدر کتب خانہ جمع کرلیا تھا اور اس کے لیے خانقاہ کے احاطے میں ایک عمارت بھی تعمیر کرالی تھی۔ شاہ صاحب چوں کہ بہت کم کہیں آتے جاتے تھے، ہر کس وناکس سے ملتے جلتے بھی نہیں تھے، اس لیے انھیں مطالعے کا کافی وقت ملتا تھا۔ خود مولانا کے بقول ان کتابوں کی بدولت انھیں خلوت میں جلوت کا لطف حاصل تھا، ''نہ باکسی کاری ونہ ازکسی باری''۔ خود مولانا زید صاحب نے اپنے مسلک اور

129529

Marfat.com

طرزِ زندگی کی ایک جگہ وضاحت کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس پُر آشوب دور میں ان کا مسلک ایک حدیث شریف پر تھا، جس کا اردو ترجمہ یہ ہے:

"رسول ﷺ نے حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص سے فرمایا: تم کیا کرو گے جب ایسے بے خبر لوگوں میں رہ جاؤ گے کہ ان میں نہ ایفائے وعدہ ہوگا اور نہ امانت۔ ان میں اختلاف ہوں گے اور اپنے احوال کے اعتبار سے اس طرح ہوں گے اور آپ نے اپنے مبارک ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسائیں۔ عبداللہ نے کہا: میرے لیے آپ کا کیا ارشاد ہے، آپ نے فرمایا: تم ان امور کے پابند رہو جن کو تم جانتے ہو اور جس کو نہیں جانتے اس کو چھوڑ دو۔ تم صرف اپنے نفس کی فکر کرو عوام الناس سے اپنے کو بچاؤ۔ اور ایک روایت میں ہے تم اپنے گھر کے ہو رہو، اپنی زبان کو قابو میں رکھو جو تم کو معلوم ہے، اس کو لو اور جس کو نہیں جانتے اس کو چھوڑ دو، تم اپنے نفس کی فکر کرو، عوام کو ان کے احوال پر چھوڑ دو"۔

مولانا زید صاحب اپنے دور کے بارے میں کیا سوچتے تھے، اس امر کا تجزیہ بھی آپ نے اس حدیث شریف کے ذریعہ بیان کر دیا ہے۔ بہر حال مولانا صاحب کو قدما کی تالیفات کے مطالعے کا خاص شوق تھا۔ انہی علمائے سلف کی تالیفات سے بعض فوائد جمع کر کے آپ نے عربی، فارسی اور اردو زبانوں میں درج ذیل تقریباً ۲۶ کتابیں تالیف کی ہیں۔

ان میں سے بعض شائع ہو گئی ہیں اور کچھ خطی نسخوں کی شکل میں موجود ہوں گی۔ کوشش کرنی چاہیے کہ وہ زیورِ طبع سے آراستہ ہو سکیں۔

۱۔ الاسانید العالیہ مع صور الشہادۃ: عربی میں ہے شائع نہیں ہوئی۔

۲۔ الخیر المزید فی اعراب الآیۃ و کلمۃ التوحید: عربی میں ہے۔ ۱۳۶۰ھ میں تالیف ہوئی۔ شائع نہیں ہوئی۔

۳۔ القول السنی فی الذات عن الشیخ عبدالغنی: فارسی میں ہے، ۱۳۶۰ھ میں تالیف ہوئی۔ چھپی نہیں ہے۔

۴۔ الحجۃ فی مسئلۃ اللحیۃ والقبضۃ: ۱۳۶۶ھ میں تالیف ہوئی۔ فارسی زبان میں ہے اور شائع نہیں ہو سکی۔

۵۔ بزم خیر از زید در جواب بزم جمشید: اردو میں ہے، ۱۳۷۳ھ میں لکھی گئی۔ شائع

Marfat.com

ہوچکی ہے۔

۶۔ مجموعۂ خیرالبیان: اردو میں ہے، شائع ہوچکی ہے۔

۷۔ مناہج اسیر ومدارج الخیر: فارسی میں ہے، چھپ چکی ہے۔

۸۔ تقویم خیری: ۱۳۷۶ھ میں لکھی گئی، شائع نہیں ہوئی۔

۹۔ رسالہ خیرالمقال فی رویۃالھلال: ۱۳۷۸ھ میں تالیف ہوئی اور شائع ہوئی۔

۱۰۔ ماذا قال الایمہ فی ابن تیمیہ: یہ اردو کی کتاب شائع ہوگئی ہے۔

۱۱۔ مسئلہ ضبط ولادت: یہ اردو میں ایک رسالہ ہے جو ۱۳۸۹ھ میں تالیف ہوا اور شائع ہوا۔

۱۲۔ منہج الاطباء فی السلام علی الانبیا والرضا عن الاولیا: فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شائع ہوا۔

۱۳۔ رسالہ وحدۃالوجود: ۱۳۹۰ھ میں مکمل ہوا اور اردو میں شائع ہوا، لیکن اس کا فارسی متن شائع نہیں ہوسکا۔

۱۴۔ النبقات من الطبقات: عربی میں ہے، شائع نہیں ہوئی۔

۱۵۔ مقاماتِ خیر: شائع ہوچکی ہے۔

۱۶۔ مقاماتِ اخیار: فارسی میں ہے، افغانستان کے متوسلین کے لیے تالیف ہوئی، شائع ہوچکی ہے۔

۱۷۔ ایک علمی مقالہ: یہ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں پڑھا گیا، جو حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی کی حیات اور کارناموں سے متعلق ہے۔

۱۸۔ حضرت مجدد اور ان کے ناقدین: شائع ہوچکی ہے۔

۱۹۔ سوانح حیات شاہ بلال: اردو میں ہے شائع ہوچکی ہے۔

۲۰۔ مولانا اسماعیل اور تقویۃ الایمان: شائع ہوچکی ہے۔

۲۱۔ مسألۃالمساجد المھجورہ: عربی میں ہے۔

۲۲۔ صویرالیرا لارتشاف حمیّا السّماع: شائع نہیں ہوا۔

۲۳۔ مقدمۃالقول الجلی فی ذکر آثار الولی۔شائع ہو چکا ہے۔
۲۴۔ مقدمہ تصوف، حصہ اول: شائع ہو چکا ہے۔
۲۵۔ آپ کی ایک کتاب ذکریات ایامِ زید نامکمل رہ گئی۔

ان کتابوں کے علاوہ مولانا زید صاحب نے دو بیاضیں تیار کی تھیں۔ایک عربی فارسی اور دوسری اردو میں ہے۔یہ دونوں مختارات وتحریرات کا مجموعہ ہیں۔

آپ کی تالیفات کا طرۂ امتیاز یہ ہے کہ وہ تحقیقی ہیں۔آپ نے اپنی تالیفات میں حتی الامکان محتاط رویہ اختیار کیا ہے۔اس کے باوجود مولانا شاہ زید صاحب کی دو ایک کتابوں پر اعتراض بھی ہوا ہے۔یہ اعتراض علمی نوعیت کا ہے اور ایک حد تک اس اختلاف کی وجہ مسلک بھی ہے۔میں اس طرح کے اعتراضات واختلافات کے بارے میں خود شاہ ابوالحسن زید صاحب کے عالمانہ رویہ اور عقیدہ کا اظہار کرنا چاہوں گا۔آپ نے ایک جگہ لکھا ہے:

''کسی امر میں اختلاف کا ہونا مذموم نہیں بلکہ شانِ علم اور وسیلۂ رحمت ہے۔البتہ یہ سمجھ لینا کہ جو کچھ اپنی سمجھ میں آیا ہے وہی حق ہے اور دوسروں نے جو کچھ سمجھا ہے وہ غلط ہے، اسی پندار کو علم کا حجابِ اکبر کہا گیا ہے''۔

شاہ صاحب کی فارسی تالیفات کے بارے میں یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ جس دور میں آپ فارسی کتابیں تالیف فرما رہے تھے، اس وقت ہندوستان میں ندرت ہی سے فارسی میں لکھی جارہی تھیں۔فارسی کے علما اور دانشور اب انگریزی یا اردو میں اپنے خیالات کا اظہار کررہے تھے۔زید صاحب نے فارسی میں ضرورتاً بھی لکھا، اس لیے کہ آپ کے متوسلین کی بہت بڑی تعداد افغانیوں کی تھی اور ان میں اکثریت کی زبان فارسی ہے۔زید صاحب نے سادہ اور خوبصورت فارسی لکھی ہے۔فارسی میں آپ کی تالیفات اس زبان پر آپ کے عبور کی گواہ ہے۔راقم فارسی کا طالب علم ہے، اور آپ کی فارسی تالیفات کو ہندوستان میں آزادی کے بعد معرضِ وجود میں آنے والی فارسی تالیفات میں ایک اہم مقام کا حامل سمجھا جاتا ہے۔

سالہا گوشِ جہان زمزمہ زخواہد بود
زیں نواہا کہ دریں گنبد گردوں زدہ است

حضرت مولانا شاہ ابوالحسن زید فاروقی صاحب تاحیات پوری توجہ اور شفقت سے اپنے وابستگان کی رہنمائی میں ہمہ تن مشغول رہے۔اور جمعرات ۱۷ر جمادی الآخر ۱۴۱۴ھ مطابق

۲ر دسمبر ۱۹۹۳ء کو صبح ساڑھے نو بجے واصل بہ حق ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

آپ نے موزوں طبیعت پائی تھی۔ اپنے والد مکرم کے اشارے پر آپ نے شعر کہنا شروع کیا اور والد ہی کے ارشاد کے مطابق اپنا نام "زید" تخلص کے طور پر اختیار کیا۔

ابتدا میں آپ اردو میں شعر کہتے تھے بعد میں آپ نے عربی اور فارسی میں طبع آزمائی کی۔ خود شاہ صاحب کے بقول "یہ عاجز احیاناً کچھ کہتا ہے اور یہ کہنا اپنے اختیار میں نہیں ہے، بلکہ آمد پر موقوف ہے"۔ تینوں زبانوں میں آپ کا مختصر کلام زیادہ تر مذہبی نوعیت کا ہے۔ آپ کے بعض تاریخی قطعات اہمیت کے حامل ہیں۔

مجھے شاہ ابوالحسن زید صاحب کی خدمت میں حاضر ہونے کا شرف حاصل ہوا ہے۔ میں چند دفعہ اپنے ایرانی دوستوں کے ہمراہ اور ایک بار پیرس کے ایک پروفیسر Gobareau صاحب کے ساتھ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ آپ نے ایرانیوں سے فارسی میں بلا تکلف گفتگو فرمائی۔ ان کے مختلف سوالات کے متانت سے مدلل جواب دیے۔ چوں کہ آپ کا زیادہ تر وقت مطالعے میں گزرتا تھا، اس لیے کتابوں کے حوالے کے ساتھ آپ علمی گفتگو کرتے تھے اور سائل مطمئن ہو کر لوٹتا تھا۔

زید صاحب کے دوستوں، احبابوں کا حلقہ بہت محدود تھا۔ جناب قاضی سجاد صاحب مرحوم بہر حال آپ کے بے تکلف دوستوں میں تھے۔ مجھے قاضی صاحب کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع بھی ملتا تھا۔ ایک بار میں نے زید صاحب کو قاضی صاحب کے گھر پر بھی دیکھا، دونوں کو بے تکلف گفتگو کرتے اور ہنسی مذاق کرتے دیکھا۔

زید صاحب اپنے مریدوں اور متوسلین کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ ان کی خوشی اور غم میں برابر کے شریک رہتے۔ جو لوگ خدمت میں حاضر ہوتے، ان سے محبت سے بات کرتے اور دعاؤں کے ساتھ رخصت کرتے۔

مجدد الف ثانی کے خاندان کا یہ چشم و چراغ نہایت سنجیدہ طبیعت کا مالک تھا۔ آپ سادہ مگر ستھرا لباس پہنتے، ٹھہر ٹھہر کر گفتگو کرتے۔ آپ کے چہرے سے علم و معرفت کا جلال ٹپکتا تھا۔ ایسا احساس بھی ہوتا تھا کہ آپ دوسروں سے گفتگو تو کر رہے ہیں، لیکن دل کہیں اور ہے، ذکرِ خداوندی میں مشغول۔ اسی ذکر و ریاضت کے نور نے آپ کو مرجع خلائق بنا دیا تھا۔ آپ کو دیکھ کر محسوس ہوتا تھا کہ:

Marfat.com

وہ اہلِ دل کے جو چہروں پہ نور ہوتا ہے
کوئی ملال ، کوئی غم ضرور ہوتا ہے

میں اس وقت ایک اور واقعہ کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو زید صاحب کے علمی ذوق وشوق اور طالب علموں کی رہنمائی کی خواہش کا ثبوت بہم پہنچاتا ہے۔ مجھے حضرت مجدد الف ثانی کا ایک معروف رسالہ معارف الدنیہ مرتب کرنا تھا۔ یہ فارسی زبان میں نسبتاً مختصر رسالہ ہے۔ حضرت مجدد صاحب نے اس میں مدلل طریقے پر وحدت الشہود کی وکالت فرمائی ہے۔ اس کے متعدد نسخے ہندوستان کے کتاب خانوں میں محفوظ ہیں۔ مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ میں اس کے دو نسخے ہیں۔ راقم نے ان دونوں نسخوں کی مدد سے معارف الدنیہ کا متن مرتب کیا۔ اس کے مطالب کا سمجھنا آسان نہیں اور عرفان وتصوف کی اصطلاحات نے اسے اور بھی مشکل بنا دیا ہے، اس لیے مجھے یہ خیال آیا کہ اگر میں یہ رسالہ حضرت شاہ ابوالحسن زید صاحب کے سامنے ایک بار پڑھ لوں تو اشکال دور ہو جائیں۔ میں نے اپنے والد محترم سے ایک تعارفی خط لیا اور خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے خط پڑھا، خوش ہوئے اور فوراً اجازت دے دی کہ میں روز صبح ان کی خدمت میں حاضر ہوں اور اس رسالے کی قرأت کروں۔ رمضان کا مہینہ تھا۔ میں صبح دس بجے حاضر ہوتا اور ایک بجے تک آپ سے استفادہ کرتا۔ آپ نے اپنی لائبریری سے بھی دو نسخے سامنے رکھے میں متن پڑھتا تھا، آپ اپنے نسخوں کی مدد سے میرے مرتبہ متن کی تصحیح کرتے اور کہیں کہیں میرے مرتبہ متن کو صحیح قرار دیتے اور اپنے نسخوں میں اسی کے مطابق تصحیح کرتے تھے۔ آپ نے میرے استفادہ کے لیے رسالے میں موجود متعدد اصطلاحات کی وضاحت فرمائی۔ اس طرح راقم معارف الدنیہ کا متن تصحیح کرنے میں کامیاب ہوا۔

ظاہر ہے کہ تصوف کے ہر ہر پہلو پر آپ کی نظر تھی۔ خود آپ کی زندگی نقشبندی مجددی دبستانِ تصوف کے ضوابط کے مطابق گزر رہی تھی، ان کے لیے اس رسالے کے مطالب کا ادراک نسبتاً آسان تھا۔ افغانستان میں حضرت مجدد الف ثانی کے ماننے والوں کی کثیر تعداد ہے۔ مولانا شاہ ابوالحسن زید فاروقی صاحب مرحوم اپنے دور میں اس نقشبندی مجددی سلسلے کے سربرآوردہ بزرگ تھے۔ افغانستان سے متوسلین بڑی تعداد میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ افغانستان میں چند سال قبل مولانا صبغت اللہ مجددی، صدر مملکت کی حیثیت سے برسرِ اقتدار تھے۔ مجددی صاحب ایک بار اسی دوران دہلی آئے اور آپ سے ملنے خانقاہ میں بھی

Marfat.com

تشریف لائے۔

مولانا زید صاحب اللہ کو پیارے ہو چکے۔ یہ صرف دتی اور دتی والوں کا نقصان نہیں آپ کی وفات نے جہانِ علم و معرفت میں ایک خلا پیدا کر دیا، جس کا ہمیشہ احساس ہوتا رہے گا۔ خدا ان کے جانشینوں کو توفیق عطا فرمائے کہ وہ خانقاہِ ابوالخیر کی علمی و عرفانی روایات کو زندہ رکھ سکیں۔

☆☆☆

Marfat.com

ڈاکٹر تنویر احمد علوی

امداد الرشید صابری

اگر دیکھا جائے تو مولانا کا پورا نام ان کی چہار جہتی شخصیت کا آئینہ دار ہے۔ مولانا خود بھی عالم تھے اور انھوں نے اپنی علمی زندگی کا آغاز ہی ایک مذہبی تصنیف سے کیا تھا۔ وہ مولانا شرف الحق صابری کے بیٹے تھے، جن کو حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی مدنی اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کی ذات سے ایک تعلقِ خاص تھا، اس لیے انھوں نے اپنے فرزند دلبند کے نام میں یہ دونوں اسمائے گرامی شامل کر دیے۔

صابری حضرت علاء الدین صابر کلیری سے روحانی رشتے کو ظاہر کرتا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ مولانا امداد صابری کی زندگی پر علم، علم، تصوف اور روحانیت کے ان رشتوں کی چھاپ تھی۔

مولانا سادہ مزاج اور اپنی طبیعت کے ستھرے پن کے اعتبار سے بہت ہی پاک صاف انسان تھے، ہمیشہ کھدر کا سفید لباس پہنتے تھے، جس میں کوئی داغ دھبہ برداشت نہیں کرتے تھے۔ اونچی باڑھ کی سفید کھدر کی ٹوپی ان کی خاص شناخت تھی، سر پر بال کم تھے، مگر مولانا زندگی میں فارغ البالی شاید ہی کبھی آئی ہو۔ پاؤں میں ایک سادہ سا چپل پہنا کرتے تھے، آہستہ چلتے کہ ان کی ایک ٹانگ میں ہلکا سا لنگ بھی تھا ویسے غیر معمولی طور پر متحرک انسان تھے، ہمیشہ کچھ نہ کچھ کرتے اور سوچتے رہتے تھے اور جو کچھ سوچتے تھے وہ دوسروں کی بھلائی کے لیے ہوتا تھا۔

گفتگو کے وقت کا ان کا لہجہ دھیما ہوتا تھا، جس میں کھرے پن کا ایک احساس ملتا تھا۔ اسٹیج

پر مولانا بہت چیختے تھے اور اپنی بات کو دور دور تک پہنچانا چاہتے تھے۔ انھوں نے بہت چھوٹی عمر سے اپنے لیے سیاست کو پسند کیا تھا۔ ان کی زندگی کے سیاسی سفر میں کئی موڑ آئے مگر جوڑ توڑ کے وہ قائل نہیں تھے وہ سیاست میں مجاہدانہ اسپرٹ کے ساتھ آئے تھے۔ سیاست کو کاروبار بنانے کے لیے نہیں۔

مولانا کی زندگی میں ڈر، خوف اور دہشت کو کوئی دخل نہ تھا۔ سچ کہنے اور واشگافانہ انداز میں کہنے کے وہ ہمیشہ عادی رہے اور اس میں اپنی روش کو کبھی نہیں بدلا۔ مولانا نے کبھی کبھی تجارت میں اور وہ بھی کتابوں کی تجارت میں دلچسپی کا اظہار کیا مگر اس میں کچھ پایا نہیں بلکہ ہمیشہ نقصان ہی اٹھایا۔

مولانا کی رہائش گاہ چوک چوڑی والان سے چند قدم کے فاصلے پر تھی۔ اونچی سی ڈیوڑھی اس کے سامنے ایک زینہ اور برابر میں گھر کا دروازہ اسی کے بغل میں مولانا کی بیٹھک رہتی تھی۔ آنے جانے والوں کے لیے اس کا راستہ باہر سے تھا۔ گھر میں قرآن پڑھنے والی چھوٹی چھوٹی بچیوں کی وجہ سے کبھی کبھی ہلکا سا شور بھی سننے میں آتا تھا، یہ اس وقت ہوتا تھا جب وہ زور زور سے قرآن پڑھتی تھیں۔

جب بھی کوئی شخص مولانا کا دروازہ کھٹکھٹاتا تو اندر پنجرے میں بند طوطا بول اٹھتا تھا اور دروازہ پر بندھی بکریاں منمنانے لگتی تھیں۔ پڑھنے والی کوئی بچی باہر آتی پوچھتی آپ کون ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں؟ آپ کا نام کیا ہے؟ مولانا اگر گھر میں ہوتے تو آنے والے کو بیٹھک میں بلا لیا جاتا۔ بیٹھک بہت مختصر سی تھی مولانا کی نشست کسی گدّے یا چٹائی پر ہوتی تھی، پاس ہی کوئی ڈیسک یا کبھی کبھی تپائی رکھی ہوتی تھی۔

ایک دو پنسلیں معمولی سے فاؤنٹین پین یا قلم دوات مولانا کے آس پاس ہوتے تھے جس میں مولانا اخباروں، رسالوں یا پھر کتابوں سے اقتباس نقل کرتے رہتے تھے۔ قلم باریک تھا اس لیے چھوٹے کاغذ کے پرزے پر بھی بہت کچھ لکھ لیتے تھے اور اس طرح کے پرزے جمع کرتے جاتے تھے اور یہی پرزے کتاب لکھتے یا مضمون ترتیب دیتے وقت نسخۂ کیمیا کی طرح ان کے کام آتے جو کچھ ان کاغذوں کے پرزوں میں ہوتا تھا اس سے کچھ زیادہ مولانا کے دماغ میں رہتا تھا اسی لیے کتاب جلد تیار ہو جاتی تھی۔

مولانا کی اکثر کتابوں کی کتابت بہت معمولی سی رہی اس لیے کہ زرد کاغذ پر زعفرانی رنگ کی

Marfat.com

روشنائی سے لکھی ہوتی تھی، آف سیٹ پر مولانا کی کوئی کتاب شاید ہی چھپی ہو۔ اتنا خرچ وہ کہاں سے لاتے۔ اسی بیٹھک میں مولانا کی کتابوں کی الماری بھی تھی جس میں اندر اور باہر بہت سی نئی اور پرانی کتابوں کو دیکھا جا سکتا تھا Rare books کو وہ اندر کہیں رکھتے یہ نادر و نایاب کتابیں مولانا کو اپنے والد مولانا شرف الحق سے ملی تھیں۔

مولانا شرف الحق مذہبی مناظرے کرتے تھے۔ مولانا امداد صابری نے سیاسی مناظرے زیادہ کیے مگر بات ہمیشہ سچی کہی اسی لیے ان کے لہجہ میں ایک خاص طرح کا کھرا پن دیکھنے کو ملتا تھا، جھوٹ بولنا جیسے وہ جانتے ہی نہیں تھے ہاں جھوٹی توقعات قائم کر لیتے تھے۔ پبلک کی خدمت میں یقین رکھتے اور پبلک کے سوچنے کا ہمیشہ اپنا ایک انداز رہا ''چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی'' مولانا ہوا کا رُخ پہچاننے کی کوشش نہیں کرتے تھے وہ سچ کے ساتھ رہتے تھے خلوص اور خدمت کا جذبہ انھیں ایک اسٹیج سے دوسرے اسٹیج کی طرف تک لے آتا تھا لیکن ان کی نظر ہمیشہ دوسروں کی بھلائی پر رہتی تھی۔

مولانا کو سیاست میں کامیابی بہت کم ہوئی یہ الگ بات ہے کہ تمام عمر وہ ناکامیوں سے کام لیتے رہے۔ کبھی کبھار ہی ایسا ہوا کہ وہ الیکشن میں جیتے ہوں لیکن پبلک کی خدمت گزاری میں وہ ہمیشہ آگے رہے سیٹ نکلے یا نہ نکلے مگر مولانا اپنی جگہ پر قائم رہتے تھے۔ خدمت کا ایسا والہانہ جذبہ اور ایسا ناقابلِ انکار یقین کم دیکھنے کو ملتا ہے۔ مولانا کو بڑی سے بڑی کامیابی سیاسی زندگی میں یہ ہوئی کہ وہ کارپوریشن میں ڈپٹی میئر بنائے گئے۔ سیاسی زندگی کے بدنما سائے وہاں بھی مولانا کا پیچھا کرتے رہے میں مولانا سے ایک بار ملنے گیا تو معلوم ہوا کہ ''زندہ باد''، ''مردہ باد'' کے نعرے بلند ہو رہے ہیں اور لوگوں نے ان کا گھیراؤ کر رکھا ہے جب کہ وہ معاملہ ان سے متعلق بھی نہ تھا۔

اس زمانہ میں بعض متمول لوگ جو مولانا سے فائدے اٹھانا چاہتے تھے وہ لوگ یہ کہتے بھی نظر آئے تھے کہ مولانا ہمیں بھی خدمت کا موقع دیجیے کبھی ہماری گاڑی کو بھی یہ فخر حاصل ہونا چاہیے کہ یہ مولانا کے قدموں سے لگی ہے۔ مولانا اکثر ٹال جاتے تھے کبھی بہت ضرورت میں گاڑی منگا بھی لیتے تھے اب جیسے ہی ڈپٹی میئر شپ ختم ہوئی پٹرول مہنگا ہو گیا اور گاڑی کے پہیے ہی نہیں پُرزے تک جام ہو گئے۔

ایسا نہ تھا کہ مولانا لوگوں کو سمجھتے نہ ہوں ان کے لہجہ میں چھپی مکاری پر مولانا کی نظر نہ جاتی ہو

مگر وہ جذبۂ خدمت سے اتنے سرشار رہتے تھے کہ انھیں کبھی اس کا خیال بھی نہ آتا تھا کہ جو اپنا کام نکلوا کر واپس ہوا ہے وہ شاید آئندہ ان کو سلام بھی نہیں کرے گا۔ ویسے یہ کہنے والے بہت کم تھے کہ مولانا ہمارے تو بس آپ ہی ہیں اور جب آپ سے ہم کہہ دیں گے تو اللہ کے حکم سے کام ہو ہی جائے گا۔

مولانا جب لوگوں کے فارموں کی تصدیق کرتے تھے تو اکثر جیب میں قلم، مہر اور مہر لگانے کا پیڈ ڈال کر نکلتے تھے اور جہاں کسی نے ان کو فارم پیش کیا اور کبھی کبھی تو لوگ کئی کئی فارم ایک ساتھ لاتے تھے اپنا بھی اور دوسروں کا بھی۔ مولانا بے چارے جس حالت میں بھی ہوتے دستخط کرتے۔ مہر لگاتے اور فارم ان کو دے دیتے تھے۔ میں مولانا سے کہتا کہ مولانا آپ انھیں اتنی زحمت بھی نہیں دینا چاہتے کہ یہ آپ کی بیٹھک یا آفس تک پہنچ جائیں۔ فرماتے کہ تنویر صاحب اس میں ان کا وقت خراب ہوتا اب بے چاروں کا کھڑے کھڑے کام ہو گیا۔

مولانا یہ سب برداشت کر کے اس دشت وفا سے گزر گئے محض اس لیے کہ ان میں خدمت کا جذبہ غیر معمولی تھا۔ وہ کسی سے کچھ نہیں چاہتے تھے۔ ان کا ہاتھ دینے کے لیے اٹھتا تھا، لینے کے لیے نہیں۔

مولانا جب دنیا سے رخصت ہوئے تو انھیں مختلف حیثیتوں سے الگ الگ سطح پر قوم کی خدمت کرتے ہوئے نصف صدی سے زیادہ گزر چکی تھی اس لمبے عرصے میں انھوں نے کبھی بھی کسی سے کچھ نہ لیا۔

ذرا خیال کیجیے کہ جن لوگوں نے ۱۹۴۷ء کے بعد پارٹیاں بنائیں، انجمنیں قائم کیں، سیاسی ہتھکنڈوں سے کام لیا وہ کہاں سے کہاں پہنچ گئے کیا سے کیا ہو گئے اور مولانا صرف خدمت کرتے رہے محلہ بہ محلہ، دروزاہ بہ دروازہ اور شہر بہ شہر آتے جاتے دوسروں کے دُکھ درد میں شریک رہتے اور اپنا سارا دُکھ درد خود برداشت کرتے رہے۔ مجھے مولانا کی اس سیاسی خدمت گزاری کا انداز کبھی پسند نہ آیا کہ اس سے مولانا کے دُکھوں اور تکلیفوں میں اضافہ ہوتا تھا۔ لوگ ان کو چھوڑ کر آسانی سے دوسروں کے ساتھ لگ جاتے تھے، جہاں بھی اپنا فائدہ دیکھتے تھے اُدھر کا رُخ کر لیتے تھے اور مولانا ان کے غم میں مرے جاتے تھے۔

عوام کا لفظ ان کی زبان پر بہت آتا تھا اور اس میں زیادہ تر ان لوگوں کے دُکھ درد میں شریک ہوتے تھے جو طبقاتی درجہ بندی میں بہت نچلی سطح پر آتے تھے اسٹیج پر تقریر کرتے وقت ان کا سارا

Marfat.com

جوش اور جذبہ ان کی آواز اور جذباتی سرچشموں سے بدلتے ہوئے لاوے میں بدل جاتا تھا اور عوامی خدمت کے وقت ان کے قدموں میں غیر معمولی قوت آجاتی تھی۔

گرمی کے موسم میں مولانا اپنا کرتا یا قمیض بھی اتار ڈالتے تھے اور ایک لنگی باندھے اپنی بیٹھک میں بیٹھے رہتے تھے اور اسی حالت میں چھوٹے بڑے اپنے اور بیگانے ملنے بھی آتے تھے، اہلِ علم کی صحبت ان کے یہاں کم دیکھنے کو ملتی تھی، زیادہ تر انھیں وہی لوگ گھیرے رہتے تھے، جنھیں ان سے کوئی کام ہوتا تھا اس کی تلافی کتابیں اور اخبار کرتے تھے، جن کو پڑھنے اور جن سے اقتباسات نقل کرنے میں خاصی دلچسپی ہوتی تھی وہ سادہ پہنتے تھے اور ان کا رہن سہن بھی بہت سادہ تھا اور ایسا ہی سادہ ان کا کھانا پینا بھی۔ اکثر ایسا بھی ہوتا تھا کہ وہ اپنا کھانا بیٹھک ہی میں منگوا لیتے جو ان کا ڈرائنگ روم بھی تھا اور ریڈنگ روم بھی۔

ان کا دسترخوان بھی درویشوں کی طرح بہت مختصر ہوتا۔ ایک مرتبہ میں نے دیکھا کہ ایک طوطا ان کے کندھے پر بیٹھا ہے، مولانا خود بھی کھاتے جاتے اور اس کو بھی کھلاتے جاتے ہیں اور اگر کوئی بات یاد آجاتی ہے تو اِدھر سے کوئی کاغذ کا پرزہ اٹھا کر اسے لکھ بھی لیتے ہیں۔

مولانا کو جانوروں سے بھی محبت تھی ممکن ہے درختوں سے بھی رہی ہو۔ چھوٹے چھوٹے پودے گملے میں لگے مولانا کے یہاں دو چار مل جاتے تھے۔ ان کی ڈیوڑھی میں اکثر بکریوں کا قبضہ رہتا تھا اور ان کے گھر میں گاہ گاہ مرغیاں اور کبھی کبھی کبوتر بھی دیکھنے کو ملتے تھے۔ میں سوچا کرتا تھا کہ مولانا نے کس طرح اپنے ذہن اور زندگی میں اتنی وسعت پیدا کر لی ہے کہ وہ بے شمار عوام کے ساتھ جانوروں اور بیل بوٹوں سے اتنی محبت کرتے ہیں۔

مولانا نے بہت کچھ لکھا بلکہ اتنا لکھا کہ کسی گفتگو میں آسانی سے اس کو سمیٹا بھی نہیں جاسکتا۔ ''تاریخ صحافتِ اردو'' پر مولانا کا کام بہت وقیع ہے اور اپنے دائرۂ کار کے اعتبار سے وسیع بھی۔ جلد اول سے لے کر جلد پنجم تک کتنے اخباروں اور رسالوں کا علمی اور تاریخی مطالعہ مولانا کے یہاں شامل ہے۔ ان کو بہت اخبار تو اپنے والد کی لائبریری سے مل گئے تھے جن میں کچھ نادر اخباروں کے شمارے اور ایک دو سال کے فائل بھی تھے، یہی صورت رسالوں کی بھی تھی۔ اپنے دوستوں سے ملنے جاتے ہوں یا کسی میٹنگ یا جلسے میں شریک ہونے کے لیے جہاں بھی مولانا جاتے وہاں کے کتب خانوں اور لائبریریوں میں ضرور بیٹھتے اور معلومات جمع کرتے۔

Marfat.com

''تاریخ صحافتِ اردو'' کے علاوہ جو صدہا صفحات پر پھیلی ہوئی ہے اور پانچ جلدوں میں ہے، مولانا نے گلدستۂ صحافت بھی مرتب کیا یہ ایک نئے انداز کا کام تھا اور مولانا کے کاموں میں شامل ہونے کے لائق ایک ادبی کارنامہ ہے۔

''تاریخ جرم وسزا'' بھی مولانا نے مرتب کی ''فرنگیوں کا جال'' بھی لکھی۔ انھوں نے دہلی کی تاریخی شخصیات پر بھی کتاب مرتب کی اور سیاسی رہنماؤں کی بیویوں اور ماؤں کا احوال بھی قلم بند کیا کہ انھوں نے اپنے شوہروں اور بیٹوں کے ساتھ کس کس طرح کا انسانی سلوک بلکہ حسنِ سلوک کیا۔ گوناگوں تکالیف برداشت کیں، مشقتوں اور زحمتوں سے گزریں اور اپنے خلوص، خدمت اور ایثار وقربانی سے اپنے شوہروں یا بیٹوں کی زندگی کو مصائب سے بچالیا۔

مولانا کا قاعدہ تھا کہ وہ اپنی کسی کتاب کو جس قابلِ احترام شخصیت سے معنون کرتے تھے صاحبِ انتساب کی سوانح اور سیرت پر اس کتاب میں ایک مبسوط تعارف نامہ بھی شامل کرتے تھے، انھوں نے کسی بڑے آدمی کی طرف اس نقطۂ نظر سے انتساب کے وقت رُخ نہیں کیا کہ اس طرح وہ اس سے قریب آکر کوئی دنیوی فائدہ اٹھالیں گے۔ دنیوی فائدوں سے تو بے نیازانہ گزر گئے البتہ دوسروں کو طرح طرح سے فائدے پہنچاتے رہے۔ میں تنویر احمد علوی خود ان سے علمی استفادہ کرنے والوں میں سے ہوں۔

جب شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ذوقؔ پر ریسرچ کر رہا تھا تو مولانا ہی کی خدمت میں استفادے کے لیے حاضر ہوا تھا۔ اس وقت مولانا نے اخبار ''کوہِ نور'' کا وہ نادر شمارہ مجھے دکھلایا جس میں ذوقؔ کی وفات اور اس پر اظہار رنج وملال کا حال رقم تھا۔

یہ شمارہ اس مضمون کی حد تک ''دہلی اردو اخبار'' کے مالک ومدیر ذوق مرحوم کے دیرینہ دوست اور مولانا محمد حسین آزاد کے والد تھے۔ اگر سچ پوچھیے تو مولانا کے عطا کردہ اور ان کی رہنمائی میں ''کوہ نور'' کے اس شمارے کی بدولت ہی ذوقؔ پر میری تحقیق میں ایک Turning point آگیا اور مجھے معلوم ہوا کہ اخذ نتائج کے لیے روایتوں کا تقابلی مطالعہ کتنا ضروری ہے۔

دہلی کی تاریخ اور تہذیب کے موضوع پر بھی مولانا نے بعض کتابوں کی طرف میری رہنمائی کی ان میں ''مرقع دہلی'' کو بھی شامل کیا جاسکتا ہے اور منشی رگھوناتھ سنگھ دہلوی کی اس بیاض کو بھی جس کے مطالعہ کے دوران مجھے معلوم ہوا کہ قلمی مآخذ میں اگر چھان بین کی جائے تو ذوقؔ کا

Marfat.com

نایاب کلام بھی مل سکتا ہے۔

مولانا کا دل کھلا ہوا تھا ان کے نزدیک علم کی روشنی سب تک پہنچنے کے لیے ہوتی تھی، وہ دوسروں کو بلا تکلف بتلاتے بھی تھے اور اسی طرح دوسروں سے معلومات حاصل کرنے میں بھی کوئی تکلف نہ کرتے۔ وہ سب کے شکر گزار رہتے تھے لیکن اپنے لیے یہ توقع بھی مشکل سے کرتے تھے کہ کوئی ان کا شکر گزار ہوگا۔

☆☆☆

Marfat.com

استاد چاند خاں

شمسِ موسیقی استاد غلام محمد خاں المعروف میاں ممن خاں صاحب کے یہاں جب دوسری بیٹی پیدا ہوئی تو ایک بزرگ اس وقت ممن خاں صاحب کے پاس بیٹھے تھے۔ انھوں نے کہا اس لڑکی کا نام فرخ النساء عرف چکور رکھو اس کے بعد چاند آئے گا۔ خدا کی کرم نوازی ایسی ہوئی کہ استاد چاند خاں اپنی والدہ امیر بیگم کے شکم میں آ گئے۔ کچھ ماہ کے بعد ایک فقیر صدائیں لگاتا ہوا آیا اور کہا کہ یہاں کوئی مائی حاملہ ہے؟ تو سب نے امیر بیگم کو اس کے آگے کھڑا کر دیا۔ فقیر نے کہا مائی تیرے پہلے بیٹا ہوگا اس کا نام چاند رکھیو اور خدا کا کرنا ایسا ہی ہوا کہ محرم شریف کا چاند دیکھنے امیر بیگم صاحبہ چاند رات کو اپنی چھت پر گئیں اور اسلامی تاریخوں کے لحاظ سے نیا سال بھی شروع ہو جاتا ہے۔ جب امیر بیگم صاحبہ نیچے تشریف لائیں تو استاد چاند خاں صاحب دنیا میں تشریف لے آئے۔ یہی وجہ ہے کہ چاند خاں نام رکھا گیا۔ تاریخ پیدائش میں ۱۸۹۷ء تو کہیں ۱۸۹۵ء لکھا ملتا ہے۔

استاد چاند خاں صاحب کو ان کے دادا عبدالغنی خاں صاحب نے اپنی سرپرستی میں لے لیا اور تین چار برس کی عمر میں ہی ان کو اپنے خاندانی عملی علمی اور اصول وقواعد کی بنیاد پر تعلیم دینی شروع کی۔ جب سات برس کے ہوئے تو ان کے والد استاد ممن خاں صاحب نے ان کو باقاعدہ اپنے ساتھ رکھنا شروع کر دیا اور تعلیم دینے لگے۔

جب ۱۹۱۱ء میں دہلی دربار میں جارج پنجم کی تاج پوشی کی تقریبات کا اہتمام کیا جا رہا تھا اور ایک بہت بڑی میوزک کانفرنس کا اہتمام بھی کیا گیا تھا۔ حیدرآباد دکن سے استاد چاند خاں کے والد اور استاد چاند خاں کے پاس اس میں شرکت کا دعوت نامہ بھیجا گیا۔ لال قلعہ کے پیچھے باؤلی

Marfat.com

کے میدان میں ایک بہت بڑا شاندار پنڈال بنایا گیا جس میں کئی ہزار آدمی جمع ہوسکیں۔ اس جشن کا پروگرام صبح سے شروع ہوتا تھا اور رات کو گیارہ بجے تک چلتا تھا، جس میں تمام راجا اور مہاراجہ نوابین بھی شامل ہوئے۔ استاد چاند خاں نے جب اس میں گایا تو وائسرائے بہادر نے ان کو ہزاروں افراد کے بیچ کئی میڈل اور نذرانہ وتحائف دیے اور توصیف وتعریف کی۔

۱۹۳۵ء میں جب استاد چاند خاں صاحب کے والد استاد ممن خاں صاحب کو فالج کا اثر ہوگیا تو وہ اپنے والد صاحب کو لے کر ریاست پٹیالہ سے دہلی آگئے اور پھر یہیں مستقل سکونت اختیار کی۔ دہلی آکر استاد چاند خاں صاحب نے اپنے والد کے حکم سے کچھ اصلاحی اقدام اس فنِ موسیقی کی بقا اور ترقی کے لیے اٹھائے۔

۱۹۳۷ء میں استاد چاند خاں صاحب نے ایک کتابچہ ''انکشافِ موسیقی'' کے نام سے چھپوا کر عوام کو فنِ موسیقی کے مختلف پہلوؤں سے روشناس کرایا۔ اپنے چھوٹے بھائی استاد جہاں خاں صاحب کے ساتھ ایک کتابچہ ''ہارمونیم ماسٹر'' کے نام سے چھپوا کر عوام کو گھر بیٹھے فنِ موسیقی سیکھنے کا آسان طریقہ اس کتاب کے ذریعہ بتلایا۔ ۱۹۴۷ء کا ہیبت ناک دور آگیا اور انسانیت ننگِ انسانیت بن گئی اور افراتفری کا دور شروع ہوگیا۔ ہر شخص کی جان و مال، عزت وآبرو خطرے میں پڑ گئی۔ استاد چاند خاں کے ساتھ کام کرنے والے آل انڈیا ریڈیو کے تمام اسٹاف کا تبادلہ پاکستان ہوگیا تھا۔ وہ لوگ چاہتے تھے کہ استاد چاند خاں بھی پاکستان چلتے، مگر استاد چاند خاں اس کے متعلق لکھتے ہیں کہ ہم نے اپنی جنم بھومی ۲۲ خواجہ کی چوکھٹ اس دلّی کی محبت میں پاکستان جانا بھی گوارا نہیں کیا اور وطن کو چھوڑنا مناسب نہیں سمجھا۔ استاد چاند خاں دہلی میں ہی رہے یہاں تک کہ پاکستان کے اخبار ''جنگ'' نے ایک کارٹون نکالا جس کا عنوان تھا'' استاد چاند خاں مولانا آزاد کا پرانا راگ'' اور کارٹون میں مولانا ابوالکلام آزاد کو سارنگی بجاتے اور استاد چاند خاں کو ناچتے ہوئے دکھایا گیا تھا اور نیچے لکھا تھا آل انڈیا ریڈیو۔

استاد چاند خاں صاحب لکھتے ہیں کہ جب وہ ہنگامی دور ختم ہوا اور دل و دماغ کچھ سوچنے کے قابل ہوا تو قدرت نے ہمارے دماغ میں یہ بات ڈالی کہ زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں، تمھیں جو بزرگوں سے فن کی دولت ورثہ میں ملی ہے اور جو تمھارے خاندان کی امانت ہے اسے صفحۂ قرطاس پر محفوظ کر دیا جائے تاکہ وہ اس کے حقداروں تک پہنچ سکے۔ اس خیال کے دل میں آتے ہی بزرگوں کے جمع کیے سرمایے کو جو نسل در نسل سینہ بہ سینہ چلا آرہا تھا اور ابھی تک قلمی جامہ نہیں پہنا تھا

کتابی شکل میں جمع کرنا شروع کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے مدد فرمائی۔ الحمدللہ آج وہ قیمتی امانت کا خزانہ کئی ضخیم جلدوں میں منتقل ہو چکا ہے۔

استاد چاند خاں کے معمولات میں ایک معمول یہ بھی تھا کہ رات کا کھانا کھا کر نمازِ عشاء سے فارغ ہو کر جامع مسجد جاتے تھے اور جامع مسجد کا طواف کر کے حضرت ہرے بھرے شاہ صاحب شاہ سرمد کے مزارات پر حاضری دیتے ہوئے حضرت شیخ کلیم اللہ کے آستانے پر حاضر ہوتے اور پھر واپسی میں جامع مسجد کے سامنے سعید ہوٹل میں دوست احباب کے ساتھ چائے پیتے اور اوپر حاجی ہوٹل میں اگر کوئی مہمان دوست فن کار ٹھہرا ہوتا تو اس سے مل کر پھر گھر آتے اور لکھنے میں مشغول ہو جاتے تھے اور تقریباً صبح کے تین چار بجے تک لکھتے رہتے تھے۔ صبح شاگردوں کو گھر پر تعلیم دیتے تھے، بلاوجہ کسی سے بات چیت نہ کرتے تھے نہ کبھی ان کا کسی سے جھگڑا ہوا نہ کوئی غیر اصولی بات ان سے ہوتے ہوئے دیکھی۔

استاد کو دستِ غیب بھی تھا کوئی کام ان کا بند نہیں ہوتا تھا۔ ۱۹۵۰ء سے گھر پر بیٹھے رہتے تھے۔ بہت کم آتے جاتے تھے۔ ایک اسکول آدرش سنگیت ودیالیہ میں جو پوسا روڈ پر تھا اور اس کے بعد گولف لنک، پھر لاجپت نگر میں ان کے ایک شاگرد پروفیسر پی این نگم نے کھولا تھا اس میں ہفتے میں دو بار شام کو جا کر کلاس لیتے تھے۔ فقط آل انڈیا ریڈیو کی نشریات پر اور شاگردوں کے نذرانوں پر ہی استاد کی گزر بسر تھی۔ محرم شریف کے ایام میں استاد چاند خاں فنِ موسیقی کو فنِ سوز خوانی میں تبدیل کر دیتے تھے اور تا چہلم حضرت امام حسین کی سوزخوانی کی مجالسوں میں زیادہ شرکت کرتے تھے اس کے بعد ۱۱ محرم الحرام کو استاد کے گھر میں محفلِ سوزخوانی کا اہتمام ہوا کرتا جو ۱۹۰۵ء سے آج تک ہوتا ہے۔ سوزخوانی سننے کے لیے دور دور سے عوام آتے تھے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ نیچے مردوں سے پورا گھر اور محلے کی گلی پوری بھری ہوتی تھی اور اوپر پردے میں عورتوں کے بیٹھنے کا انتظام ہوتا اور پھر یہ مجلس تقریباً نمازِ فجر تک چلتی تھی۔ حضرت حافظ قاری قاضی محمد سلیمان صاحب انبالوی نے استاد چاند خاں کے ادبی ذوق کو اور بڑھایا اور ان کی صحبت کے فیض سے استاد نے شاعری کے میدان میں قدم رکھا اور سب سے پہلے ۱۹۱۳ء میں اپنے والد استاد تمن خاں صاحب کے روحانی پیرِ طریقت حضرت قبلہ امیر شاہ صاحب چشتی صابری پر تضمین کہی۔

شاعری کا ذوق و شوق اتنا بڑھا کہ استاد چاند خاں پٹیالہ کے بڑے بڑے مشاعروں میں

Marfat.com

شرکت فرماتے رہے اور داد و تحسین حاصل کی۔ استاد چاند خاں صاحب کی ایک بحر میں تین انداز کی غزلیں ملتی ہیں۔ مثلاً غزل، نعتیہ غزل، مزاحیہ غزل۔

تقسیمِ ملک کے بعد جب خاندان کے بہت سے افراد اور شاگرد پاکستان چلے گئے جن کو اپنے ملک میں عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا اور جو اپنے اپنے فن میں منفرد مقام رکھتے تھے، ان افراد کے چلے جانے سے تنہا رہ گئے تو استاد چاند خاں کو کئی سال اپنے آپ کو سنبھالنے میں لگے۔ استاد چاند خاں صاحب نے تقریباً دہلی سے باہر جانا بالکل بند سا کر دیا تھا خاص خاص جگہ جاتے تھے اور لوگوں کے بہت اسرار پر ہی جاتے اور جلدی واپس آجاتے تھے۔ ہندوستان میں موجود استاد چاند خاں کے ہزاروں شاگرد ہیں۔ استاد چاند خاں صاحب کا تعلیم دینے کا اصول جداگانہ تھا۔ انھوں نے شاگردوں میں اور گھر کے بچوں میں کبھی امتیاز نہیں برتا، سب کو ایک ساتھ حلقے میں بٹھا کر سکھاتے تھے۔ تمام شاگرد اور گھر کے بچے ایک ساتھ بیٹھ کر سیکھتے تھے ان کی اس بات کی دوسرے لوگ بہت قدر کرتے تھے۔

استاد چاند خاں بڑی وضع قطع شخصیت کے مالک تھے۔ لباس ان کا سب فن کاروں سے جداگانہ ہوتا تھا۔ انھوں نے کبھی رنگ برنگے نیلے پیلے چمکدار کپڑے نہیں پہنے، وہ جس وقت ریاستوں میں جاتے آتے تھے تو اس وقت چوڑی دار پاجامہ، انگرکھا اور اس پر جودھپوری طرز کا صافہ ہوتا تھا، بعد میں وہ مستقل طور پر دہلی آگئے تو انھوں نے گرمی کے زمانے میں سفید پاجامہ صوفیانہ رنگ کی یا سفید رنگ کی شیروانی اور اس پر اسی کی ٹوپی یا شیروانی کے ساتھ پتلون اور اس پر میچ کرتی ہوئی ٹوپی، ہاتھ میں چھڑی یا بینت رکھتے تھے۔ جاڑے کے موسم میں گرم کپڑے کا وہی لباس، مگر اس پر فرغل چوغہ پہنتے تھے اور پھر غالب نما گول ٹوپی گرم یا اونی اوڑھتے تھے۔

چاند خاں کا مزاج صوفیانہ تھا، یہی وجہ ہے کہ ان کی صحبت میں رہنے والے جتنے بھی لوگ تھے وہ بھی سادہ منش اور صوفی طبیعت کے حامل تھے۔ عام قسم کے جلسوں اور کانفرنسوں میں جانا بند کر دیا تھا مگر خاص خاص سرکاری یا غیر سرکاری جلسوں میں شرکت کر لیتے تھے۔ مثلاً ۱۹۴۸ء میں ایک آل ایشیا یوتھ فیسٹول کا انعقاد ممبئی میں کیا گیا اس میں تمام ایشیا سے آئے ہوئے جوان فنکاروں کو استاد چاند خاں کا گانا سنوایا گیا۔ اس کی صدارت ڈاکٹر راجندر پرساد اس وقت کے صدر جمہوریۂ ہند نے فرمائی۔ ۱۹۵۰ء میں پہلی بار دہلی میں جشنِ جمہوریت کے موقع پر ایک کانفرنس لال قلعہ کے دیوانِ خاص میں منعقد کی گئی، اس میں اس استاد چاند خاں کا گانا ہوا۔

Marfat.com

۱۹۵۳ء میں بھارتیہ کلا کیندر کی جانب سے ایک کانفرنس ہوئی، جس میں استاد چاند خاں صاحب کو شرکت کے لیے بلایا گیا۔

بڑی خوددار طبیعت پائی تھی اور وہ اپنے آخری ایام میں تو بالکل دنیا سے بے نیاز ہو کر صرف نماز پڑھتے اور شاگردوں کو سکھاتے تھے۔

استاد چاند خاں کے توکل اور شان سے استغنا کا ایک واقعہ ان کی ڈائری سے نقل ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کا خط آیا اس میں لکھا تھا: ''خاں صاحب! آپ ہمارے پرانے دوست ہیں اور میں آپ جیسے دوستوں کی دعا سے آج صدر جمہوریۂ ہند کے عہدے پر ہوں، آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں اور آپ سے ملنے کا خواہش مند ہوں، جہاں مناسب ہو وہاں آپ سے ملاقات ہو سکتی ہے''۔ اس پر خاں صاحب کا تحریری جواب قابلِ غور ہے۔ ''عزیزم و محترم ذاکر صاحب! بے انتہا مسرت ہے کہ آپ کو پرانے تعلقات کا بدستور علم ہے، آپ اس وقت ہندوستان کے بادشاہ ہیں، میری تنگ گلیوں میں آنا آپ کی شان کے خلاف ہے اور میں اپنے فن کا بادشاہ ہوں میرا آپ کے راشٹر پتی بھون میں آنا اور اپنے لیے کچھ کہنا میری شان کے خلاف ہے، لوگ یہ کہیں گے کہ چاند خاں صدر جمہوریہ سے ملنے گیا ہے کوئی لالچ ہوگا میں تو اب اس شہنشاہوں کے شہنشاہ کے دربار میں حاضر ہونے کی تیاری میں ہوں۔ اگر اللہ کو منظور ہوا تو کسی موقع پر ضرور آپ سے نیاز حاصل کریں گے''۔ استاد چاند خاں کے کچھ جان پہچان کے لوگوں نے دونوں کی ملاقات کے لیے کوئی راہ نکالی اور ایک دن مقرر کر کے اس سے متعلق تمام پروگرام ترتیب دیے گئے اور دعوت نامے بھی لوگوں میں تقسیم ہو گئے۔ اس پروگرام اور ملاقات کا اہتمام کرایا گیا جامعہ ملیہ اسلامیہ میں مگر قدرت کو منظور نہ تھا کیوں کہ اچانک ذاکر صاحب کا انتقال ہو گیا اور استاد چاند خاں ان کے جنازے میں شرکت کرنے کے لیے میرے ساتھ جامعہ ملیہ اسلامیہ گئے، جہاں میں اس وقت زیرِ تعلیم تھا۔ چاند خاں صاحب نے ذاکر صاحب کی نمازِ جنازہ پڑھ کر ان کے جسدِ خاکی کو کندھا دینے کی کوشش کی مگر بھیڑ کی وجہ سے صرف اسے Touch کر پائے۔ مجھ سے جو اس وقت ان کے ساتھ کھڑا تھا فرمایا اپنی جیب سے وہ کارڈ نکالو جس پر ہماری اور ذاکر صاحب کی ملاقات کا وقت لکھا ہے۔ یہ دیکھ کر مجھے بہت ہی تعجب ہوا کہ یہی وقت، یہی تاریخ اور یہی دن ملاقات کا لکھا تھا۔ اللہ والوں کی باتیں اللہ ہی جانے کیا راز و نیاز ہوتے ہیں۔

Marfat.com

استاد چاند خاں صاحب کو دنیاوی جھوٹی شان کی طلب کبھی نہیں ہوئی۔ حالاں کہ جو جو کام اس فنِ موسیقی کی بقاو ترقی کے لیے استاد چاند خاں صاحب نے کیے، اگر ان کو قلم بند کیا جائے تو کئی ضخیم جلدیں تیار ہو سکتی ہیں مگر انھوں نے اس کارِ خیر کا کوئی معاوضہ حاصل کرنے کی طلب کبھی نہیں کی۔ یہی وجہ ہے کہ معمولی سے معمولی کام کرنے والے فن کاروں کو سرکاری اعزام پدم بھوشن، پدم وبھوشن وغیرہ دیے گئے مگر نہ تو خود ہی استاد نے کوشش کی اور نہ اس خادم نے ان کو کسی جھوٹی شان شوکت کے احسان تلے دبوایا۔ حالاں کہ ان کے کئی شاگرد سرکار کے اونچے اونچے عہدوں پر فائز رہے اور منسٹری تک میں تھے، مگر استاد چاند خاں پھر بھی اس سے بالاتر رہے۔ بلکہ ایک دفعہ اس سلسلے میں کچھ بات بھی نکلی تو فرمایا یہ اعزازات تو اب میرے بچوں کو ملیں گے میں تو اب "وہاں" کا پدم بھوشن ہونا چاہتا ہوں۔

۱۹۶۳ء میں ماہ اپریل کی ۱۲ تاریخ کو کانپور میں بھارتیہ سنگیت تھا للت کلا ودیا پیٹھ کی جانب سے آفتابِ موسیقی کا خطاب ان کو دیا گیا۔ ۱۹۶۹ء میں دہلی کی ساہتیہ کلا پریشد، دلّی پرشاسن نے دہلی کا سب سے پہلا اعزاز استاد چاند خاں کو برائے موسیقی دہلی میں خدمات کے سلسلے میں دیا۔

۱۹۷۰ء میں آندھرا پردیش گورنر نے استاد کو اعزاز سے نوازا۔ جب آل انڈیا ریڈیو کی گولڈن جوبلی منائی گئی تو سب سے پہلا ایوارڈ استاد چاند خاں صاحب کو نیلم سنجیوا ریڈیو آنجہانی صدر جمہوریۂ ہند کے دستِ مبارک سے وگیان بھون کے ہال میں پیش کیا گیا۔

۱۹۷۴ء میں استاد چاند خاں پر ہوا کا اثر ہو گیا تو وہ مستقل گھر پر ہی آرام کرتے تھے۔ جو بھی ان سے ملنا چاہتا وہ گھر آ کر ملتا تھا، شاگردوں کو سکھانا اور لکھنا ان کا اس عالم میں بھی جاری رہا بلکہ خدا کی عبادت میں اور زیادہ مصروف نظر آنے لگے تھے اور تسبیح ہر وقت ان کے ہاتھوں میں رہتی تھی۔ حالاں کہ گھر سے باہر نکلنا انھوں نے بالکل بند کر دیا تھا، نمازِ جمعہ کے لیے حسبِ معمول جامع مسجد ضرور جاتے تھے اور یہی وجہ تھی کہ انھوں نے جامع مسجد دہلی کی محبت کی وجہ سے اس شہر سے زیادہ دن کبھی اپنے آپ کو باہر نہیں رکھا۔

بروز جمعہ ۲۵ر دسمبر ۱۹۸۰ء کی رات میں حسبِ عادت استاد چاند خاں صاحب کے ساتھ لیٹا ہوا تھا۔ استاد نے مجھے موسیقی کے وہ رموز و نکات اور چند اہم باتیں اور خاص خاص نکتے اس فن کے ایسے بتائے کہ میں خود تعجب میں پڑ گیا کہ آج یہ مجھے اتنی ساری باتیں ایک ساتھ کیوں سکھا رہے ہیں اور موسیقی کے بہت سے پوشیدہ علمی پہلوؤں سے مجھ کو روشناس کرایا جو غالباً استاد ہی

Marfat.com

جانتے تھے۔ الغرض صبح کے چار بجے تک ہم دونوں باتیں کرتے رہے، رموز و نکات سمجھتا رہا اور پھر اچانک آنکھ لگ گئی۔ صبح دیر سے آنکھ کھلی۔ نمازِ جمعہ کی تیاری کی، استاد چاند خاں صاحب کو غسل کروایا اور پھر ان کے ساتھ جامع مسجد نمازِ جمعہ پڑھنے گیا۔ استاد چاند خاں صاحب نے نمازِ جمعہ ادا کی میں نے دیکھا کہ استاد چاند خاں نے جامع مسجد کے چاروں طرف بہت عجیب انداز سے نظریں ڈالیں پھر آسمان کو دیکھا، پھر شمال مشرقی دروازے کے دالان یا جہاں حضور آقا ﷺ کے قدمِ مبارک کے نشان ہیں وہاں گئے اور قدم شریف کو بوسہ دیا پھر مشرقی دروازہ کی جانب سے نیچے سیڑھیوں پر اترے۔ ہرے بھرے شاہ صاحب شاہ سرمد صاحب کے یہاں حاضری دی، حضرت شیخ کلیم اللہ پر حاضر ہوئے، اردو بازار سے ہوتے ہوئے واپس گھر کی طرف آئے، راستے میں ہمارے کچھ دوست مل گئے سلام دعا کرنے میں کچھ وقت لگنے لگا تو استاد نے فرمایا ہم آہستہ آہستہ چلتے ہیں تم آرام سے آؤ، ہم کو آنے میں تاخیر ہوئی مگر استاد چاند خاں صاحب آہستہ آہستہ گھر پہنچ گئے۔ گھر پر آپ نے تھوڑا آرام کیا عصر کی نماز پڑھی اور پھر حسب عادت اسی وضو سے مغرب کی نماز پڑھی۔ ہمیں ہمارے عزیز جناب سردار علی ایڈوکیٹ نے اپنے یہاں بلالیا۔ شام کو جب وہاں جانے کی تیاری کر رہے تھے تو استاد چاند خاں صاحب نے مجھ سے فرمایا میاں جلدی آجانا۔ مجھے بڑا تعجب ہوا کہ کبھی انھوں نے ایسی بات نہیں کی۔ اچانک عشاء کی اذان کے کچھ ہی دیر بعد ایک صاحب ہم کو پوچھتے ہوئے سردار علی صاحب کے مکان جو کہ اس وقت چاندنی محل، گنج میراں خاں اور سوئیوالان کے بیچ میں واقع تھا، آئے۔ ہم کو گھر لے گئے جب ہم نے گلی کی حالت دیکھی تو عجیب ویرانی سی تھی ہر ایک شخص ہم کو دیکھتا اور غمزدہ چہرہ بناتا اس کے آنسو نکل پڑتے ہمیں یہ ماجرا سمجھ نہیں آیا چوں کہ سب جانتے تھے کہ اس ناچیز نوا سے سے استاد کو کتنا پیار اور لگاؤ تھا۔ مگر جب ہم گھر پر آئے تو ماحول دوسرا ہی پایا معلوم ہوا کہ عشاء کی نماز پڑھتے ہوئے سجدہ میں ہی استاد چاند خاں اس خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ یہ لوگوں سے معلوم ہوا کہ عثمان خاں صاحب ان کی بیگم اور ہماری نانی اماں چاند خاں کی بیگم رمضانو آپس میں باتیں کر رہے تھے اور شکیل احمد خاں اس وقت ریاض کر رہے تھے ایک کونے میں اچانک انھوں نے چاند خاں صاحب کو سجدہ میں جاتے ہوئے دیکھا اور پھر دس منٹ تک سجدے سے سر نہ اٹھایا تو شکیل احمد نے ہمارے والد صاحب ظہور احمد خاں کو بلایا جو کہ سامنے کے کمرے میں رہتے تھے اور اس وقت موجود تھے۔ انھوں نے آکر ان کو آواز دی اور جیسے ان کو سیدھا کیا وہ یونہی آنکھیں بند کیے پڑے

Marfat.com

ہوئے تھے جیسے کہ سو رہے ہوں۔ ہمارے نزدیک کے ڈاکٹر وی پی ڈھینگرہ کو بلایا گیا جنھوں نے فرمایا کہ اب استاد چاند خاں صاحب دنیا میں نہیں رہے بلکہ جنت میں تشریف لے گئے ہیں۔ سارے گھر میں کہرام مچ گیا۔ محلے بازار اور جہاں جہاں بھی اخبارات، ریڈیو اور ٹی۔وی کی خبر کے ذریعہ لوگوں کو اطلاع ملتی رہی رات بھر لوگ آتے رہے جاتے رہے اور صبح دہلی کے تقریباً تمام اخبارات میں استاد چاند خاں کے انتقال کی خبر چھپ گئی اور لوگ ان کے جنازے میں شامل ہونے کے لیے آنے لگے۔ بعد نمازِ ظہر ان کا جنازہ گھر سے ترکمان گیٹ درگاہ فیض الٰہی کی مسجد سے میدان رام لیلا گراؤنڈ میں لے جا کر ان کی نمازِ جنازہ ہوئی، جس میں کئی سو افراد نے شرکت کی پھر ان کے جسدِ خاکی کو بستی حضرت نظام الدین اولیاء لے جایا گیا اور غیاث پورہ نامی اس بستی حضرت نظام الدین میں حضرت محبوبِ الٰہی کے قدموں کی جانب ان کے آبائی قبرستان میں ان کی وصیت کے مطابق ان کے والد کے پاس ان کی تدفین ہوئی۔

حضرت باقر حسین شاہجہانپوری نے قطعۂ تاریخ کہا:

غیور و نیک سیرت چاند خاں استادِ موسیقی
محبِ قوم و ملت چاند خاں استادِ موسیقی
ظہیرِ فن و فخرِ خاندانِ صابر و شاکر
مکینِ باغِ جنّت چاند خاں استادِ موسیقی
فدائے پنجتن کی لوحِ مرقد کے لیے باقر
کہو تاریخ رحلت چاند خاں استادِ موسیقی

۱۹۸۱ء ۱۴۰۱ھ

چاند خاں استادِ موسیقی کے اعداد ۱۴۰۱ھ نکلتا ہے۔

☆☆☆

Marfat.com

جعفر عباس

ڈاکٹر اجمل اجملی

چھوٹا قد، بھرا بھرا جسم، ہر وقت کچھ تلاش کرتی ہوئی آنکھیں، کھانستے، ہنستے اجمل بھائی آخر سب کو چھوڑ کر چلے ہی گئے۔ دائرہ شاہ اجمل کے سجادہ نشین حضرت مولانا شاہ سید احمد اجملی کے صاحبزادے اجمل اجملی کا جنم یکم مارچ ۱۹۳۲ء کو ہوا۔ صوفیوں کے گھرانے میں اور اللہ والوں کے خاندانوں میں زندگی گذارنے کا انداز عوام الناس سے ذرا الگ سا ہوتا ہے چونکہ صوفیوں کے گھرانوں میں ظاہر اور باطن میں کسی طرح کی تفریق کو جائز نہیں سمجھا جاتا اسی لیے جب ان کی تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا تو اس میں اس بات کا خیال خاص طور پر رکھا گیا کہ بچپن ہی سے اخلاق و کردار اور ظاہر اور باطن میں یکسانیت کا درس بچے کو دیا جاتا رہے۔ اجمل بھائی کو گھر اور مدرسے میں جتنی شخصیات ملیں انہوں نے زندگی کے بارے میں سوچنے اور عمل کرنے کا مخصوص انداز عطا کیا۔

لیکن میں جن اجمل بھائی یا اجمل اجملی کو جانتا تھا وہ اس سے بیحد مختلف تھے۔ خوش مزاج، نرم و نازک اور ہر چیز میں منطق تلاش کرتے ہوئے۔ چھوٹا قد، ہلکی بھوری آنکھیں، کمزور مگر وقت آنے پر ان کا یہ جسم سخت جان بھی ہو جایا کرتا تھا۔ اکثر سماجی اور ملکی مسائل میں الجھے ہوئے۔ ہر وقت کچھ تلاش کرتی ہوئی آنکھیں، کچھ تلاش کرتا ہوا ذہن۔ شعر و شاعری سے لے کر ادبی مذاکرات تک اور ادبی مذاکرات سے بچیوں کی شادی تک سب مراحل ایک دم بڑی خاموشی اور بڑی خوش اسلوبی سے انجام دے دئے۔

دراصل اجمل بھائی کئی حصوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ایک مترجم کے طور پر ان سے ملاقات کرنی ہو تو ان کی وہ تحریریں دیکھئے جو آج بھی، میرا داغستان اور دوسری کتابوں کی شکل میں موجود ہیں، بحیثیت رومانوی انسان کو دیکھنا ہے تو ان کے پہلے اور آخری مجموعے کلام پر نظر ڈالیں جو

Marfat.com

زادِراہ کی شکل میں چھپا اور لائبریریوں کی زینت بنا۔ آج کل کا یہ عجیب المیہ ہے کہ کتابیں اب لوگوں کے گھروں میں نہیں ملتیں بلکہ لائبریریوں میں ملتی ہیں یا ان لوگوں کے پاس ملتی ہیں جن سے مصنف کے کچھ خصوصی تعلقات ہوں۔ یا وہ اچھا تبصرہ نگار ہو۔ اب کتابیں رکھنا اور وہ بھی اردو کی کتابیں رکھنا ایک معیوب فعل سمجھا جاتا ہے۔ اسی لیے اجمل بھائی کی کتاب آئی کچھ لوگوں نے واہ واہ کی اور پھر بھول گئے۔ اب اجمل بھائی کی خوبی ہی تو تھی کہ کتاب کے شائع ہونے کے کچھ دنوں بعد ہی وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ ورنہ کتنی تکلیف ہوتی۔

خیر چھوڑیئے ان باتوں کو اب اجمل بھائی سے میری ملاقاتوں کا حال سنئے۔ بچپن میں جو نام اپنے گھر میں سنے تھے۔ ان میں اجمل بھائی کا نام بھی آیا کرتا تھا۔ صبح صبح الہ آباد سے آنے والوں میں ڈاکٹر اعجاز حسن صاحب مرحوم اور اجمل بھائی ہوا کرتے تھے۔ جس دن یہ لوگ آتے۔ میرے گھر میں دعوت کا ماحول ہو جایا کرتا تھا۔ ڈاکٹر اعجاز صاحب میرے والد کے استاد بھی تھے اور سرپرست بھی تھے اس لیے جب جب وہ آتے گھر میں چہل پہل بڑھ جاتی۔ ڈاکٹر اعجاز صاحب بزرگ اور خاموش لیکن مزاح کی حس سے مالا مال رہا کرتے تھے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر خوش ہوتے ہم بچوں کا دل بہلاتے اور الہ آباد سے امرود کے ٹوکرے ساتھ لاتے۔ بس اس طرح اجمل اجملی سے وہ دھیرے دھیرے اجمل بھائی کے رتبے تک پہنچ گئے۔ پھر لکھنؤ سے والد صاحب الہ آباد گئے اور میں حساب میں کمزور ہونے کی وجہ سے دلّی آ گیا کیونکہ دلّی میں اس زمانے میں حساب لازمی مضمون نہیں ہوا کرتا تھا بس پھر کیا تھا میں اپنے چچا کے ساتھ بھوجلہ پہاڑی پر آ گیا۔ اینگلو عربک اسکول سے امتحان پاس کیا اور پھر ایک طرح سے یہیں کا باشندہ ہو کر رہ گیا۔ اجمل بھائی سے ملاقاتیں ہونے لگیں جلسے، ہڑتالیں، فرقہ وارانہ مخالف کنونشنوں ہر جگہ اجمل بھائی نظر آتے ان کی رہنمائی ملتی اور بہت کچھ سیکھنے کو ملتا۔

سچ پوچھئے تو اجمل بھائی نے بہت کچھ سکھایا اور زندگی سے لڑنے کا جذبہ اور اسے گزارنے کا سبق اجمل بھائی نے ہی سکھایا۔ وقت دھیرے دھیرے گزرا اور میں جوان ہوتا گیا اور پھر ۱۹۷۶ء میں اچانک میرے والد صاحب کا انتقال ہوا اور میں عجیب سی بے بسی کے عالم میں الہٰ آباد چلا گیا۔ الہٰ آباد میں پانچ برسوں تک رہا اور ان پانچ برسوں میں شاید ہی کوئی ایسی شام اور کوئی دن ایسا گزرا ہو جب میں دائرہ شاہ اجمل نہ گیا ہوں۔ اجمل بھائی کے دو چھوٹے بھائی ڈاکٹر اکمل اجملی اور صوفی افضل اجملی وہاں ہر وقت محبت بانٹتے ہوئے ملتے اور اسی خلوص اور محبت

Marfat.com

سے پیش آتے کہ اس کا ذکر کرنے کے لیے الفاظ نہیں ہیں اور پھر الہ آباد سے بھی دانہ پانی اٹھا تو پھر دلّی واپس آ گیا۔ بہت دنوں تک اِدھر اُدھر بھٹکتا رہا، گھومتا رہا مگر ہر طرف مایوسی اور مایوسی ہی نظر آئی اچانک اجمل بھائی کا فون آیا اور میں ان سے ملنے ان کے دفتر پہنچ گیا۔ پھر جانتے ہیں کیا ہوا۔ اجمل بھائی کا دفتر میرا دفتر بھی بن گیا۔

اب کن کن باتوں کا ذکر کروں۔ اجمل بھائی عظیم تھے، اجمل بھائی بہت محبت کرتے تھے۔ یہ سب جملے بہت چھوٹے اور بے معنی سے لگتے ہیں۔ اجمل بھائی کی سرپرستی میں بہت کچھ سیکھا، کہاں تک ذکر کروں۔

چھوٹے سے قد والے انسان میں بلا کی طاقت تھی بلا کی ہمت تھی۔ جب صوفیہ بھابھی کا انتقال ہوا تو میں ڈر گیا تھا کہ اب کیا ہوگا چار بڑھتی ہوئی بچیوں کا کیا ہوگا... مگر واہ رے اجمل بھائی آپ نے کمال کر دکھلایا۔ حالانکہ بھابھی کے انتقال کے بعد اجمل بھائی کے یہاں پریشانیاں آتی گئیں۔ آپ بلڈ پریشر کے مریض ہو گئے تھے۔ دل کے دو تین دورے جھیل چکے تھے گلوکوز کی نلیاں ان کی ہم رکاب ہو رہی تھیں۔ لیکن ہفتہ دس دن بعد وہ نارمل ہو جاتے اور دفتر میں کام کرنے میں مصرف ہو جاتے۔ ترجمہ کرنا کوئی آسان کام نہیں ہوتا لیکن یہ بات میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ ان سے اچھا مترجم میں نے آج تک نہیں دیکھا وہ اتنی تیز رفتاری سے اور اتنا خوبصورت ترجمہ کرتے کہ اصل مضمون کا گمان ہونے لگتا۔ نظم کا ترجمہ ہو یا نثر کا دونوں میں مہارت رکھتے تھے۔

میں نے کہا نا کہ اجمل بھائی کے اتنے نزدیک رہا ہوں کہ یادوں کا اٹھتا سمندر ہے۔ کہاں سے پکڑوں کہاں چھوڑوں۔ بس ہر وقت کام کرتے رہنا، اور ادبی اور سیاسی مباحثوں میں مصروف رہنا۔ اب اجمل بھائی نہیں ہیں لیکن ان کی یادیں، ان کی محبتیں آج بھی زندگی جینے کا سلیقہ سکھا رہی ہیں۔

آیئے اب کچھ ایسے واقعات کا ذکر کروں جو ذاتی بھی ہیں اور عوامی بھی ہیں۔ ایک بار رمضان کا زمانہ تھا ہر طرف روزے داروں کی افراط تھی میں اس زمانے میں بھوجلہ پہاڑی پر اچھے چچا کے ساتھ رہتا تھا چھوٹا سا کمرہ تھا جس میں میرا سامان اور میں رہا کرتا تھا۔ اجمل بھائی نے پوچھا ''تم بھی روزہ رکھتے ہو'' میں نے کہا ''نہیں اجمل بھائی کمرہ بہت چھوٹا ہے سمجھ میں نہیں آتا کہ سے کہاں رکھوں اور خود کہاں رہوں۔ یہ سن کر وہ ہنس پڑے اور مدتوں اس واقعہ سے لطف اٹھاتے رہے۔ وہ ہمت بڑھانے میں بھی ماہر اور مشاق تھے کبھی کسی کا دل نہیں دکھاتے تھے۔

Marfat.com

ہمیشہ مدد کے لیے آگے رہتے تھے۔

صحت گری جارہی تھی۔ سیاست کا روپ بھی زہریلا ہوتا جارہا تھا، پورے ملک پر خوف وہراس کا سایہ چھایا ہوا تھا دلّی میں بھی گولیاں چلیں تھیں اور دو تین لوگ شہید ہو چکے تھے۔ عجیب ماحول تھا۔ ایک دن رات کو پتہ چلا کہ اوکھلا میں کچھ ہونے والا ہے۔ اجمل بھائی ڈرے نہیں، وہ فوراً اٹھ کھڑے ہوئے اور تاباں صاحب کے ہمراہ رات کو سڑک پر نکل پڑے سمجھانے بجھانے اور جوش کو ٹھنڈا کرنے کے لیے۔ مجھے دوسرے دن یہ بات معلوم ہوئی تو میں نے ان سے پوچھا آپ کو ڈر نہیں لگتا بولے میاں ڈرتا تو اب تک زندہ کیسے رہتا'' اس وقت تو یہ جملہ سمجھ میں نہیں آیا تھا مگر اب جبکہ اجمل بھائی نہیں ہیں تو اس جملے کے معنی سمجھ میں آرہے ہیں۔

سچ ہے اجمل بھائی واقعی عظیم تھے۔ بے غرض اور تھوڑے میں گزارا کرنے والے۔ کبھی نام و نمود کی پرواہ نہ کی، کبھی انعام واکرام کی فکر نہیں کی۔ ان سے جونیئروں کو انعامات اور اعزازات ملتے تو وہ بہت خوش ہوتے ان کو مبارکباد کے خط لکھتے اور ان کی خوشیوں میں شریک ہوتے۔ واقعی خوشی میں شریک ہونا کتنا مشکل کام ہوتا ہے مگر ہمارے اجمل بھائی اس معاملہ میں بھی بہت وسیع القلب تھے ہمیشہ خوش رہنا اور خوش رکھنا اپنا شیوہ بنالیا تھا۔

پھر وقت گزرنے لگا۔ صحت اور گری اور گری، اسپتال میں داخل ہوئے اور کچھ دنوں کی جدوجہد کے بعد اجمل بھائی ابدی نیند سو گئے۔ جب وہ مرے تو کوئی جھنڈا سرنگوں نہیں ہوا، کوئی دفتر بند نہیں ہوا، کوئی خصوصی ضمیمہ نہیں نکالا کوئی چھوٹا بڑا تعزیتی جلسہ نہیں ہوا، اور ہوتا بھی کیوں وہ کوئی لیڈر نہیں تھے۔ جو کوٹا پرمٹ کرتے، کیونکہ ہم لوگ ان ہی کو یاد کرتے ہیں جو کوٹا پرمٹ کرتے ہیں، بڑے بڑے مکان بناتے ہیں بڑی بڑی دکانیں چلاتے ہیں۔ سچ اجمل بھائی نے ساری زندگی اس طرح گزاری کہ کیا بتلاؤں؟ اور آپ کو دیکھ کر آپ کے ساتھ زندگی گزار کر نہ معلوم کیوں اب یہ یقین ہو گیا ہے کہ آپ کا تعلق واقعی فقیروں اور بزرگوں کے گھرانے سے تھا۔

اب کیا لکھوں اجمل بھائی... کس کے لیے لکھوں؟ کون جاننا چاہے گا اس کے بارے میں... مگر دنیا کا دستور ہی کچھ ایسا ہے اس لیے یہاں بھی دستور بندی کے تحت آپ کو یاد کر رہا ہوں شاید آپ اس وقت مسکرا رہے ہوں گے بالکل اسی طرح جس طرح میری غلطیوں پر مسکرایا کرتے تھے۔

☆☆☆

Marfat.com

ڈاکٹر محمد اسلم جاوید

شاعر رومان افضل پشاوری

ایک فرزند کے لئے اپنے والد کی داستان حیات کو قلم بند کرنا اس قدر مشکل کام ہوگا اس بات کا احساس مجھے اس وقت نہ ہوا تھا جب میں نے اردو اکادمی کے سکریٹری سے ''دلی والے'' سیمینار کے لئے اس مضمون کو تحریر کرنے کی حامی بھری تھی۔ اس مضمون کو تحریر کرتے وقت میں نے کوشش کی ہے کہ داخلیت (Subjective ness) سے بچا جائے اپنی اس کوشش میں کس قدر کامیاب ہوا اس کا فیصلہ آپ کریں۔ میں نے اختصار کے ساتھ کچھ پردے ڈال کر اور کچھ پردے ہٹا کر افضل پشاوری کی داستان حیات قلم بند کرنے کی کوشش کی ہے۔

بات کو طول دیں تو طویل ہو جاتی ہے۔ ورنہ داستان حیات ہے ہی کیا؟ چند جملوں کا بیان جیسے نام۔ فضل احمد، تخلص افضل تاریخ پیدائش ۲۲ جولائی ۱۹۱۶ مقام پیدائش پشاور، تعلیم دسویں پاس رنگین مزاج شاعر، مدیر، ناشر، صحافی، سماجی و سیاسی کارکن، بزنس مین۔ ملحد، مے کش انسان دوست، دوست نواز اور بہت کچھ۔ تصنیفات، پیام امن، پیار کی باتیں، بہت تمہیں پیار کرنے کو جی چاہتا ہے، انہیں مجھ سے محبت کیوں نہیں ہے، پیار کا ساگر ہے ہو'' جے ہو جے ہو تیری جوانی کی''۔ جے ہو جے ہو'' اندرا گاندھی کی''۔ دو دیوان غیر مطبوعہ۔ ناشر و مدیر ماہنامہ عظمت، ماہنامہ، تحفہ، ہفت روزہ ''ایشیا''، مشعل، اور ہندو پاک۔ تاریخ وفات دسمبر ۱۹۸۰۔

مگر ان چند جملوں سے شاید افضل پشاوری کی زندگی کی مکمل تصویر آپ کے سامنے نہ آپائے۔ آیئے ذرا ان کی زندگی کے خدو خال کو اور تھوڑی تفصیل وضاحت کے ساتھ دیکھا جائے۔

فضل احمد افضل پشاوری لال کرتی بازار پشاور میں ماسٹر عبدالرحمن کے گھر ۲۲ جولائی ۱۹۱۶ء

Marfat.com

ہفتے کے دن پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد ایک ملٹری کانٹریکٹر تھے جو افضل کی پیدائش کے چند سال بعد ہی دلی میں آکر بس گئے۔ والدین کی یہ اکلوتی اولاد، بہت ناز ونعمت میں پلی۔ ماں باپ کے بیجالا ڈو پیار نے ان کو خودسر بنا دیا۔ اینگلو سنسکرت اسکول دریا گنج دلی میں تعلیم حاصل کی اور وہاں سے ۱۹۳۲ء میں میٹرک کا امتحان اچھے نمبروں سے پاس کیا۔ اسکول میں فٹ بال کے کھیل میں نام کمایا۔ شعروشاعری کا سلسلہ اسکول کی تعلیم کے دوران شروع ہوا جو تمام عمر ساتھ رہا۔ کچھ دنوں حیدر دہلوی کے شاگرد بھی رہے۔ مگر یہ رشتہ زیادہ قائم نہ رہا۔

تعلیم سے فراغت کے بعد افضل پشاوری اردو ادب اور اردو زبان کی ترویج وترقی کے مقصد کو سامنے رکھ کر ادارت اور شاعت کے کام میں لگ گئے۔ تقسیم ملک سے قبل انہوں نے ایک ادبی رسالہ ''عظمت، نکالنا شروع کیا۔ اس ماہنامے کے دو مقاصد رہے پہلا اردو ادب کو فروغ دینا ملک کی وحدت اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کا پیغام جو سرحدی رہبر خان عبدالغفار خاں دے رہے تھے اس کو شمالی ہندوستان میں عام کرنا افضل ملک کی وحدت کے حمایتی تھے۔ وہ تقسیم ملک کے مخالف تھے۔ اسی لئے ملک کی تقسیم کے بعد پشاور سے بہت سے دباؤ آنے کے باوجود بھی وہاں نہیں گئے۔ نتیجے میں انہیں پشاور کی اپنی آبائی جائیداد سے بھی محروم ہونا پڑا۔ پشاور میں پیدا ہوئے افضل شاہ جہاں آباد، فصیلوں سے گھرے شہر دلی میں رہنے والے لوگوں کی زندگی سے تاحیات جڑے رہے۔ آج بھی قلعہ معلیٰ کے سامنے اردو بازار میں رہنے والے نوجوان اپنے بزرگوں سے اس شخص کی زندگی کے نشیب وفراز کے حالات سن کر حیرت میں ڈوب جاتے ہیں۔

افضل کی زندگی میں بہت سے اتار چڑھاؤ آئے مگر انکی ثابت قدمی کبھی متزلزل نہیں ہوئی۔ آزادی سے قبل کاروباری حریفوں نے ایک جھوٹے مقدمہ قتل میں ملوث کیا مگر باعزت بری ہوئے۔ آزادی کے بعد جب ملک میں قتل وخون کا بازار گرم ہوا۔ لاکھوں لوگ گھر سے بے گھر ہوئے اُس وقت بھی افضل لوگوں کی مدد کرنے ان کو راہ دکھانے اور بسانے کے کام میں لگے رہے۔ لوگوں کو امن فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور ملک کی آزادی کی اہمیت بتلانے کے لئے انہوں نے ایک کتاب، پیام امن لکھی۔

جب ملک طوائف الملوکی کا شکار تھا اس دور میں انہوں نے اردو بازار میں ہوٹل کا کاروبار شروع کیا۔ ہوٹل کا نام رکھا آزاد ہند ہوٹل اور ریسٹوراں کو نام دیا جے ہند ریسٹوراں۔ وہ ہوٹل جو کاروی کم اور علم وادب کا مرکز زیادہ تھا۔ جو اردو منزل تھا جس کی دیواروں پر لگے ٹائلوں میں لکھا

Marfat.com

تھا ''ہر گھر اردو'' ''نہر گھر اردو'' عام روش پر چلنا افضل کی عادت نہ تھی اس تقسیم کے دور میں بھی انہوں نے ہوٹل اور ریستوراں کا منتظم دو خواتین کو بنایا۔ جس کی ہمت شاید آج بھی جامع مسجد کے علاقے کا کوئی ہوٹل نہیں کر سکتا۔ کاروباری میدان میں بھی وہ نئے نئے تجربے کرتے رہے۔ مسجد شاہ جہانی کے سامنے مغل ریسٹوراں تو کبھی بازار مٹیا محل میں مغل بیکری۔ کبھی ہاؤس ہولڈز (House Holds) کے نام سے پرانی اشیا کی تجارت کی تو کبھی آنکھوں کو چونکا دینے والے جھاڑ فانوس کا کاروبار۔ مگر میدان کاروبار میں ان کی شاعری، صحافت سماجی و سیاسی سرگرمیاں آڑے آتی رہیں۔ ہوٹل میں ارباب حاجت، احباب وشعرا کی آمد و رفت رہتی۔ ہوٹل میں عام مسافر کم دوست شاعر وادیب زیادہ قیام کرتے یعنی مہمانوں کی صورت میں مہینوں ٹھہرا کرتے۔

شام ہوتے ہی ہوٹل شاعروں اور ادیبوں کی محفل میں بدل جاتا جس میں کچھ قہوے کے خواہاں ہوتے تو کچھ دختر مئے ناب کے۔ کوئی طلب گار اپنی مراد پائے بغیر نہیں جاتا۔ افضل کے ہم پیالہ و ہم نوالہ اپنے دور کے مشہور لوگ رہے ہیں۔ یہیں پر جوش ملیح آبادی نے ٹائم پیس رکھ کر شراب نوشی کی ہے یہیں پر مجاز نے جوش سے کہا کہ گھڑی رکھ کر وقت کی پابندی سے شراب پینے سے بہتر ہے گھڑا رکھ کر شراب پی جائے اسی ہوٹل میں مجاز نے دیوانگی کے عالم میں پناہ لی اور اپنی مشہور نظم ''اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں'' تخلیق کی۔ افضل پشاوری کے دوستوں کی فہرست بہت طویل ہے۔ یہاں فراق گورکھپوری، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، جگر مرادآبادی، بسمل سعیدی ٹونکی، مخمور سعیدی، مخمور دہلوی، مظفر کاکوری، استاد رسا، امیر آغا قزلباش، ساحر لدھیانوی، نریش کمار شاد، جمنا داس اختر، دیوان سنگھ مفتوں، فکر تونسوی، سرور تونسوی، ناز انصاری فرقت کاکوری، گلزار دہلوی، شہزادہ تبسم ایم اے و دیگر حضرات شعر و شاعری وادبی مسائل پر تبادلہ خیال کرتے۔ اسی ہوٹل میں سلام مچھلی شہری، عمیق حنفی، مغیث الدین فریدی اور اظہار اثر برسوں رہے۔ ''ایس منور کافی سالوں تک اردو فلمی ویکلی ''چترا'' یہاں سے شائع کرتے رہے اور کپور انگریزی فلم میگزین'' سنے ہیرالڈ'' (CINE HERALD) یہیں سے نکالتے رہے۔ افضل صاحب ان سب حضرات کی ادبی کاوشوں میں شریک رہے۔

افضل کاروباری کم شاعر، ادیب، سماجی اور سیاسی کارکن زیادہ تھے۔ رومانی شاعری کے پانچ دیوان اور سیاسی شاعری کے دو مجموعے شائع ہوئے۔ انہوں نے ادبی ماہنامہ 'عظمت' نکالا اور

Marfat.com

ایک ماہنامہ ''تحفہ'' بچوں کے لیے'' نکالا وہ سیاسی ہفتہ وار اور'' ایشیا'' اور ہفتہ وار'' ہندو پاک'' کے مدیر اور ناشر بھی رہے۔

افضل پشاوری کی شاعری کا اردو ادب میں کیا مقام ہے؟ یہ تو اہل ادب جانیں۔ میں تو صرف آپ کے سامنے ان کی شاعری کے بارے میں جوش، فراق اور مجاز کے خیالات پیش کرنے جارہا ہوں جوش کا کہنا ہے کہ۔ افضل کی شاعری کے باب میں کوئی لمبی چوڑی عبارت کی ضرورت نہیں۔ صرف اس قدر کہہ دینا کافی ہوگا کہ رسم ورہ عام کے سراسر خلاف ان کی نظمیں تو نظمیں ان کی غزلوں تک میں خود ان کے دل کی ترجمانی ہوتی ہے اور خود ان کے دل کا خون جھلکتا نظر آتا ہے''۔

فراق گورکھپوری کی رائے میں:

''میری نظر میں دوسو برس کی اردو شاعری ہے۔ لیکن جتنی بے تکلف، بے لاگ، فطری افضل کی شاعری مجھے نظر آئی، اس کی کوئی دوسری مثال مشکل سے نظر آئے گی .....شروع سے اخیر تک ان کا کلام ایسا ہے گویا اپنے دوست یا محبوب سے بے تکلف باتیں کرتے چلے جارہے ہوں۔ معلوم ہوتا ہے نثر کے فقرے اپنے آپ نظم میں ڈھل گئے ہوں۔ صرف ایک مثال اپنے بیان کی تصدیق میں دوں گا اور وہ افضل کا یہ شعر ہے۔

سوجھتی ہیں سینکڑوں باتیں مجھے
ہاتھ سے موقع نکل جانے کے بعد

زبان کے علاوہ خیالات وجذبات افضل کے یہاں انتہائی فطری اور پرخلوص ہیں۔ انگلستان کے شاعر ہیرک (Herick) کی رومانی نظمیں افضل کے عشقیہ کلام کو دیکھ کر یاد آتی ہیں۔ ہندوستان بھر کے شاعروں میں'' شاعر رومان'' کا لقب اگر کسی کو زیب دیتا ہے تو افضل کو''

اسرارالحق مجاز کے مطابق:

''افضل پشاوری میرے ایک جواں ہمت اور جوان قسمت دوست ہیں۔ میرے ان کے پندرہ سولہ سال کے تعلقات ہیں۔ میں نے ان کو نہایت مصروفیت کے دور میں بھی ایک حاضر دماغ شاعر پایا.....ان کا دل محبت کے سوز وگداز میں ڈوبا ہوا

Marfat.com

ہے۔اسی وجہ سے جو کچھ بھی کہتے ہیں۔بہت محسوس کر کے کہتے ہیں ذیل کے اشعار سے میرے بیان کی تائید ہوتی ہے۔

برا ہے یہ سُرور اچھا نہیں
جوانی پر غرور اچھا نہیں

ان کو اپنا بنانے میں افضلؔ
عشقیہ شاعری کام آئی

ان کی شاعری رومانی شاعری ہے اور اختر شیرانی کے رنگ سے مماثلت رکھتی ہے لیکن اختر شیرانی کے یہاں تمثیل و استعارات اور کنایات کی سحر طرازی ہے اور افضل کے یہاں سادگی و پرکاری برجستگی اور بے ساختگی کی افسوں کاری ہے۔یہی خصوصیت افضل کی شاعری اور انفرادیت کو نمایاں کرتی ہے۔چند اشعار اسی رنگ کے پیش کرتا ہوں۔

ملی جن کی بدولت وصل کی دولت مجھے برسوں
تمہارے بیش قیمت وہ بہانے یاد آئیں گے
ملے جن کے توسل سے مجھے لا انتہا بوسے
لب و رخسار کے اب وہ خزانے یاد آئیں گے
بصد انداز جو شرم و حیا سے تم نے تانے تھے
دوپٹے کے وہ رنگین شامیانے یاد آئیں گے

علمی استدلال اور فلسفیانہ موشگافیوں سے افضل کے مزاج کو دور کا واسطہ بھی نہیں ہے۔وہ تو وہی لکھتے ہیں جو ان کے دل پر گزرتی ہے۔ان کی شاعری ان کے تجربات عشق کا پرتو ہے اور یہی تجربات عشق ان کا سرمایہ حیات ہے.....اپنے دل کی بات وہ اس بے ساختگی اور برجستگی کے ساتھ نظم کر دیتے ہیں کہ دوسروں کو اپنے دل کی بات معلوم ہونے لگتی ہے۔مثال کے طور پر چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

دل کے وہ پیہم تقاضے وہ مری مجبوریاں
بن بلائے وہ تری محفل میں جانا یاد ہے

Marfat.com

پابندیٔ رواج نے دونوں میں فاصلہ
اتنا بڑھا دیا کہ کبھی ہم نہ مل سکے

گئے ایسے کہ پھر واپس نہ آئے
الٰہی وہ مری عمرِ رواں تھی

طبیعت میں تلون ہے وفا کا کیا بھروسہ ہے
جفا کرنے لگو کل تم تمہارا کیا بھروسہ ہے

محبت میں بھی کرتا ہوں محبت تم بھی کرتے ہو
مگر دونوں میں منہ دیکھی محبت کون کرتا ہے

تخیل کی جدت وندرت، زبان کی سادگی وسلاست بیان کی شوخی وجرات افضل کی شاعری کے اہم عناصر ہیں"۔

ان اہم شخصیتوں کے خیالات سے ایک بات تو واضح ہو جاتی ہے کہ افضل کی شاعری کو محبت سے اور محبت کو شاعری سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔

غالب نے مہ خوں کا قرب حاصل کرنے کے لیے مصوری کا راستہ اپنایا تو افضل نے شاعری کا۔ رومانیت افضل کی رگ رگ میں بسی تھی ان کے مطابق جو پڑھتا ہے اسے رومان کا ایک درس ملتا ہے۔

میرے شعروں میں اکثر پیار کا پیغام ہوتا ہے
خدا شاہد ہے میں پیغمبر رومان ہوں افضل
مجھے اہل محبت کے لئے الہام ہوتا ہے

جوش ملیح آبادی افضل کی شخصیت کے بارے میں لکھتے ہیں افضل کی ذات میں وہ تمام اوصاف حسن مجتمع ہیں جن کے باعث ہمارے پشاور کی سرزمین سرخ رو اور مشہور ہے۔ وہ مہمان نواز ومتواضع، مخلص، منکسر اور محبت کرنے والے بلند حوصلہ انسان ہیں، افضل میں جذبہ انسانیت

Marfat.com

کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ میرے بچپن کی بات ہے ہماری کار کی ہیڈ لائٹس چوری ہو گئیں۔ والد کو پتہ چلا کہ یہ کام چوکیدار کا ہے۔ انہوں نے اسے بلا کر ڈانٹنے کے بجائے کہا۔ لگتا ہے ہماری دی ہوئی تنخواہ سے تمھارا گزارا نہیں ہوتا۔ اگلے ماہ سے ہم تمہاری تنخواہ میں پچاس روپے کا اضافہ کر رہے ہیں۔ افضل عرصے تک اردو بازار کے محلّہ خان خاناں کے میر محلّہ میں بھی رہے۔ انہوں نے علاقے کے تنازعات کو علاقے میں سلجھایا اور لوگوں کو عدالتوں کے دروازے کھٹ کھٹانے سے باز رکھا۔ حاجت مندوں کی خاموشی سے مدد کر کے خاص طور سے جمعرات کے دن جو بھی جوگی یا فقیر صدا دیتے کبھی خالی ہاتھ نہ جاتے۔ دودھ کی بالائی بہت مرغوب تھی اور دن میں قیلولہ کرنے کی عادت مزاج میں انتہائی نرمی و گرمی کا امتزاج تھا۔ غصہ آتا تو اس قدر کہ خدا کی پناہ اور پیار آتا تو بیکراں۔ مرحوم بچوں کو بہت پیار کرتے دوستوں کو بہت چاہتے اور صنف نازک بہت محبوب تھی۔

افضل کی زندگی عیش و طرب اور سرور و نشاط کی زندگی رہی ہے۔ شیدائیگی حسن کی ابتدا اسکول کے زمانے سے ہوئی اور تا حیات ساتھ رہی زندگی اور موت کی جدوجہد میں جب وہ آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز (AIIMS) میں آخری سانسیں لے رہے تھے تب بھی اپنی نظم "سراپا"۔ "تو حور ہے ایک نازنین۔ تجھ سا نہیں کوئی حسین" سنا کر تیمارداری کرنے والی نرس کو شرمانے پر مجبور کر رہے تھے۔ ان اڑتالیس سالہ رنگین زندگی کی تفصیلات بتانا اور وضاحت کرنا ایک ایسا مقام ہے جہاں میرا قلم رک جاتا ہے ادب کی وجہ سے ذہن ابھی اُن کو واضح کرنے پر تیار نہیں۔ البتہ کچھ اشارے واضح ہیں۔ جوش ملیح آبادی نے ۲۴ اگست ۱۹۵۴ میں افضل کا تعارف دیتے ہوئے لکھا تھا" ازدواجی زندگی کی ہم آہنگی سے بھی انسان کے کردار کا پتہ چلتا ہے اور یہ دیکھ کر کہ ان کے آسمانِ ازدواج پر دو ایک نہیں سات ستارے نور افگن اور ان میں کوئی تصادم واقع نہیں ہوتا۔ ان کے حسنِ انتظام کی داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ افضل کی بیگمات کی تعداد ایک درجن اور اولادِ نرینہ کی تعداد دو درجن رہی ہے شاید یہ دنیا کے ایک متوسط درجے سے تعلق رکھنے والے شاعر کا ریکارڈ ہے۔ افضل جنسی تعلق سے بچنے کو پاکیزگی نہیں مانتے تھے۔ وہ جنسی تعلق کو ایک جمالیاتی خوبی تصور کرتے تھے ان کے مطابق جب جنسی جذبات کسی شخص کی پوری شخصیت میں سما جاتے ہیں تو اس کا احساس جمال وسیع ہو جاتا ہے اور جنسیت عشق کا روپ حاصل کر لیتی ہے۔ ان کا یہ پختہ یقین تھا کہ جب تک ایک شاعر کامران عاشق نہ ہو اس کی شاعری میں اثر نہیں پیدا ہوتا۔

افضل پشاوری کوئی بہت سرگرم سیاسی کارکن نہیں رہے۔ آزادی سے قبل سرحدی گاندھی سے

Marfat.com

متاثر تھے تو آزادی کے بعد سوشلسٹ پارٹی کے ساتھ جڑے۔ایک زمانے میں میر مشتاق احمد کے ساتھ مزدوروں کی تنظیم منظم کرنے کی کوششوں میں لگے۔سوشلسٹ خیالات کی وجہ سے ۱۹۵۶ء میں ہر جمعہ کے دن ہزاروں پولیس والوں کی موجودگی میں بم پھٹا کرتا تھا۔جن کے نتیجے میں سینکڑوں لوگ زخمی ہوئے اور کئی ہلاک ہوئے۔اس معاملے میں افضل کا قصور یہ تھا کہ وہ زخمیوں کو اسپتال اپنی کار میں ڈال کر لے جاتے اور انہیں وقتی امداد مل جاتی۔سرکار نے ان کی انسانیت پرستی کا انعام ان کو بم کیس سازش میں ملوث کر کے اور گرفتار کر کے دیا۔گرفتاری کے بعد افضل پشاوری کہاں لے جائے گئے اس کی بھنک بھی گھر والوں کو نہ لگنے دی۔بعد میں انہوں نے بتلایا کہ گرفتار کر کے انہیں لال قلعے میں اس جیل میں اذیتیں دی گئیں تھیں جہاں انگریزوں نے آزاد ہند فوجیوں کو قید رکھا تھا۔اس اذیت خانے میں افضل کو جھوٹ اور سچ کا پتہ کرنے والی مشینوں سے گزارا گیا۔کافی دنوں بعد گھر والوں کو اطلاع دی گئی کہ وہ تغلق آباد کے تھانے کے حوالات میں ہیں۔ہم جب ان سے وہاں ملے تو ان کو قطعی پریشان نہیں دیکھا۔وہ ہم کو دلاسہ دیتے رہے۔اس کے بعد وہ کئی ماہ تک دہلی گیٹ جیل میں قید رکھے گئے۔ہمارے خاندان کے لئے یہ ایک بہت مشکل کا وقت تھا۔ہم سب بہت چھوٹے تھے۔کاروبار نہ ہونے کے برابر ہو گیا تھا۔اس دوران ہم کو پتہ چلا کہ مصیبت میں انسان کا سایہ بھی اس کا ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔بہت سے عزیز و اقارب کو ہم نے سڑک پر راستہ بدلتے دیکھا۔قرابت دار ایسے بن گئے جیسے ہم سے ان کا کوئی رشتہ ہی نہ ہو۔اس دوران ریسٹورنٹ میں اگر کوئی چائے پینے بھی آتا تو ہم سب چوکنے رہتے اور اس کے جانے کے بعد صوفے اور میزوں کو اچھی طرح جھانک کر دیکھتے کہ کہیں وہ شخص ہماری ریسٹورنٹ میں بم نہ رکھ گیا ہو۔اسی دوران جب والد جیل کی سلاخوں کے پیچھے تھے تو چین کے وزیر اعظم چو۔این لائی ہندوستان آئے اور ان کے ایک جلسے میں بم پھٹا۔اس پر سرکار کے خلاف بہت لے دے ہوئی۔اخبارات نے لکھا کہ ایک طرف تو سرکاری کہتی ہے کہ یہ بم کیس کے ملزمان جیل میں بند ہیں دوسری طرف وزیر اعظم کے جلسے میں بم پھٹ رہے ہیں۔اس تنقید کے نتیجے میں افضل جیل سے ضمانت پر رہا کر دیئے گئے۔کچھ عرصہ بعد سرکار نے ان کے خلاف دائر مقدمہ بھی واپس لے لیا۔اس دوران ہم نے نہ تو جیل میں نہ ہی جیل سے رہائی کے بعد ان میں کوئی پست ہمتی دیکھی۔جیل کے اندر انہوں نے ایک طویل نظم لکھی جس کا ٹیپ کا بند تھا۔

ناکردہ گناہوں کی سزا مجھ کو ملی ہے

اس پورے مقدمے کا پس منظر کیا تھا۔ اس کے بارے میں انہوں نے ہمیں سالوں بعد بتلایا۔ بم کے واقعات کی وجہ پولیس محکمہ کے افسران کا آپسی نفاق تھا۔ ایک افسر دوسرے افسر کو بدنام کرنے کے لئے یہ خطرناک کھیل کھلوا رہا تھا ورنہ کیسے ممکن تھا کہ ہزاروں پولیس والوں کی موجودگی میں ہر جمعے کو بم پھٹتے رہے۔ پولیس اس زمانے میں میر مشتاق احمد سے بھی ناراض تھی وہ والد کو وعدہ معاف گواہ بنا کر میر صاحب کو بھی اس مقدمے میں ملوث کرنا چاہتی تھی۔

زندگی کے اخیر کے سالوں میں وہ ذیابطیس کے موذی مرض کا شکار ہو گئے۔ اس جان لیوا مرض نے ان کو کافی پریشان کیا۔ زندگی کے آخری دنوں میں نمونیہ کا شکار ہوئے اور آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز میں داخل ہو گئے۔ ۷ دسمبر ۱۹۸۵ء کو پشاور کا یہ دلی والا، اپنے شعروں کو سناتا ہوا قید حیات سے آزاد ہو گیا۔ اس جری بلند حوصلہ اور الوالعزم شاعر کے ہونٹوں پر زندگی کے آخری لمحوں میں یہ شعر تھا۔

بندھے ہوئے ہیں جو آج بندھن وہ ٹوٹ جائیں گے بعد مردن
ہمارے رشتے ہیں کچے دھاگے نہ تم تو میرے نہ میں تمہارا

☆☆☆

سید شریف الحسن نقوی

کرنیل بشیر حسین زیدی

دراز قامت، کشادہ پیشانی، مسحور کن آنکھیں، مسکراتا ہوا چہرہ، پُر متین اور پُر وقار شخصیت، کھلتا ہوا گندمی رنگ، بارعب اور پُر اثر آواز، تکلف اور تصنع سے دور، خوش گفتار، ملنسار، سیاسی شخصیتوں کے قریب مگر سیاسی شعبدہ بازیوں سے دور، دوستوں کے دوست ناداروں کے دل دار ملک وملت کے مسائل کے حل کرنے کے لئے ہمیشہ تیار، کرنیل بشیر حسین زیدی آج بھی ادبی، علمی، ملی اور سیاسی حلقوں میں ادب واحترام سے یاد کئے جاتے ہیں۔

کرنیل زیدی کا تعلق "سادات بارہہ" کے خانوادے سے تھا۔ ان کے مورث اعلی سید ابوالفرح واسطی محمود غزنوی کے دور میں ہندوستان آئے۔ انہوں نے اور ان کے ورثانے اپنی دور بینی اور فوجی اور نیم فوجی اور انتظامی خدمات سے حکومت کے حلقوں میں اپنا مقام پیدا کرلیا۔ کرنیل صاحب کے اجداد اور بلگرام کے سادات ایک ہی کنبے سے تعلق رکھتے تھے، اور دونوں نے سیاست اور انتظامی صلاحیتوں میں اپنا مقام پیدا کیا، زیدی صاحب کے بزرگ گگرولی ضلع مظفر نگر، یوپی میں آباد ہوئے اور اپنے علم وفضل اور سیاسی تدبر کی بنا پر قابل رشک اقتدار حاصل کیا۔

کرنیل زیدی کے والد، سید شوکت حسین پنجاب پولیس میں انسپکٹر تھے۔ انہیں شعر وشاعری سے خاصا شغف تھا حالانکہ یہ شوق مرنے تک ہی محدود تھا۔ ان کے تین بیٹوں اور تین بیٹیوں میں سید بشیر حسین زیدی اولاد نرینہ میں سب سے چھوٹے تھے۔ اس دور کے دستور کے مطابق ان کی تعلیم بھی ابتدائی زمانہ میں گھر پر ہی ہوئی تھی۔ بعد میں ان کا داخلہ کشمیری گیٹ کے مدرسے میں ہوگیا جہاں انہوں نے عربی، فارسی، دینیات، اور صرف ونحو کی ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی لیکن

Marfat.com

پھر یہ سلسلہ منقطع ہوا اور گھر پر ہی تعلیم کا بندوبست کیا گیا۔ اینگلو عربک اسکول سے میٹرک پاس کرنے کے بعد سینٹ اسٹیفنس کالج سے انٹر اور بی اے کا امتحان پاس کیا۔

سینٹ اسٹیفنس کالج نے ہی کرنیل زیدی کو کرنیل زیدی بنایا۔ یہاں سے ہی ان کے کردار کی وہ تشکیل ہوتی ہے جس نے آگے چل کر انہیں ایک کامیاب انسان بنایا، عظیم، سیاسی شخصیتوں سے ان کا رابطہ قائم ہوا۔ خدمتِ خلق کا جذبہ نہ صرف پیدا ہوا بلکہ اس میں عملی پیش رفت ہوئی اور ولایت کے سفر سے قبل ہی یہ امید ہونے لگی کہ یہ ہونہار طالب علم ایک دن نام کمائے گا۔

سینٹ اسٹیفنس میں داخلے سے قبل ان کا نام سید بشیر حسین تھا لیکن کچھ عرصہ کے بعد انہوں نے اپنے نام سے سید حذف کیا اور زیدی کا اضافہ کیا۔ بی ایچ زیدی اور آخرکار کرنیل زیدی کے نام سے مشہور ہوئے، نام کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ ان کے احساسات اور اندازِ فکر میں دور رس تبدیلیاں پیدا ہوئیں۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ مسز اینی بیسنٹ نے اپنی ہوم رول کی تحریک کو پورے شدومد سے چلایا تھا، اس کا دفتر اور کتب خانہ کالج سے کافی قریب تھا۔ اپنے دوست رگھونندن سرن کے ساتھ وہ اکثر کتب خانے میں جاتے اور سیاسی خبریں، رسالے اور دوسرا ادب شوق سے پڑھتے اس زمانہ میں گاندھی جی کالج کے پرنسپل رُدرا صاحب کے مہمان ہوتے تھے جب بھی موقع ملتا زیدی صاحب اور رگھونندسرن گاندھی جی کی خدمت میں حاضر ہوتے سیاسی گفتگو سنتے اور حسبِ ضرورت شرکائے گفتگو کی خدمت بھی کرتے۔ اسی زمانے میں ان کی حاضری آصف علی صاحب کے یہاں بھی رگھونندسرن کے والد صاحب کی معرفت ہونے لگی۔ رفتہ رفتہ یہی حاضری مقبولیت کی اس منزل کو پہنچی کہ آصف علی صاحب اور اروناآصف علی صاحبہ نے ان کی شادی کے لئے بیگم قدسیہ (زیدی) کے ساتھ سلسلہ جنبانی کی اور محض ان دونوں کی وجہ سے یہ شادی تکمیل کو پہنچی۔ سروجنی نائیڈو سے بھی ان کا تعلق اسی کالج کی تعلیم کے زمانہ میں ہوا۔ محترمہ ان سے اس قدر نزدیک ہوگئیں کہ انہوں نے زیدی صاحب سے اپنے آپ کو "اکا" کہلوانا شروع کیا۔ زیدی صاحب کی ولایت کی تعلیم کے زمانے میں سروجنی نائیڈو انگلینڈ گئیں۔ زیدی صاحب وہاں بھی ان کی خدمت میں پیش پیش رہتے تھے۔ ۱۹۱۸ء کے کانگریس کے سالانہ دلی اجلاس میں انہیں پنڈت مدن موہن مالویہ سے ملنے اور پھر راہ و رسم قائم کرنے کا موقع ملا۔

اہم سیاسی شخصیتوں سے قربت حاصل ہونے کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ زیدی صاحب کو ملکی اور ملی

Marfat.com

مسائل میں دلچسپی پیدا ہوگئی۔لیکن اس کا منفی نتیجہ یہ بھی نکلا کہ وہ انگریز حکومت کی نظر میں آ گئے۔ حکومت کو یہ کیسے برداشت ہوتا کہ ایک ذہین اور باعمل جوان ان سیاسی حلقوں کے قریب ہوجائے جو ہوم رول جیسی تحریک چلا رہے ہوں اور پھر نوجوان بھی کون، ایک پولیس افسر کا بیٹا۔ زیدی صاحب کے والد کو حکومت کا خط گیا کہ وہ اپنے صاحبزادے کو حکومت دشمن کارروائیوں سے باز رکھیں۔لیکن یہ وہ دور تھا جب ہر ہندوستانی حب وطن کی مے سے سرشار تھا۔انہوں نے بیٹے سے صرف اتنا کہا کہ قانون کے حدود میں رہتے ہوئے کام کرتے رہو اور زیدی صاحب اپنی ڈگر پر بے خوف وخطر چلتے رہے۔

زیدی صاحب کو ابتدا سے ہی خالص سیاسی معاملات سے زیادہ تعمیری حلقوں میں دلچسپی تھی۔ان کے اس جذبے کو مدد ملی ان کے کالج کے ایک استاد پروفیسر گھوش سے جو بائبل پڑھاتے تھے اور خالص انسانی جذبے سے متاثر ہوکر زیدی صاحب اور ان کے دوست رگھونندسرن نے فلاحی کاموں کی طرف اپنی توجہ مرکوز کی۔سوشل سروس لیگ قائم کی۔اس کے تحت شبینہ اسکول کھولا۔ایک ہاسپٹل وزیٹنگ گروپ قائم کیا اور نادار مریضوں کی خدمت کا بیڑہ اٹھایا۔قابل توجہ غریب مسافروں کی مدد کے لئے ریلوے اسٹیشن وزیٹنگ گروپ بنایا۔غرض تعلیم کے ساتھ ساتھ سیاسی اور فلاحی کاموں میں بھی پوری دلچسپی لی۔یہی دلچسپی تاحیات قائم رہی اور ان کی کامیابیوں کا سبب بنی۔

رگھونندسرن بی اے پاس کر کے ولایت تعلیم کے لئے چلے گئے۔زیدی صاحب نے منتیں سماجتیں کر کے اپنی والدہ سے انگلینڈ میں تعلیم حاصل کرنے کی اجازت لے ہی لی۔کیمبرج یونیورسٹی سے ہسٹری ٹری پوز کی ڈگری لی اور مشہور عالم لنکنزان سے بیرسٹری کا امتحان پاس کیا۔ یہاں بھی ان کی غیر درسی دلچسپیاں قائم رہیں۔بین الاقوامی تحریک طلباء کے ممبر بنے اور ہالینڈ اور چیکوسلوواکیہ کے اجلاس میں شرکت کی۔علمی، ثقافتی اور سماجی تحریکوں میں زیدی صاحب بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔انہیں جلسوں میں ان کی ملاقات صاحبزادہ آفتاب احمد خاں سے ہوئی جو اس وقت سیکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا کی کونسل کے اہم رکن تھے۔رفتہ رفتہ یہ رسمی ملاقات قربت میں بدل گئی اور جب صاحبزادہ موصوف علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر بنے اور زیدی صاحب تکمیلِ تعلیم کے بعد ہندوستان واپس آئے اور صاحبزادہ سے ملنے علی گڑھ گئے تو انہوں نے زیدی صاحب کو بہ اصرار علی گڑھ یونیورسٹی اسکول کی ہیڈ ماسٹری سونپ دی۔

Marfat.com

انگلینڈ سے واپسی پر امنگوں سے بھرے اس نوجوان کا ارادہ تھا وکالت کا مگر کاتب تقدیر نے کچھ اور ہی کام نکلوانے تھے۔ کون جانتا تھا کہ اس دور کا یہ بیرسٹر علی گڑھ یونیورسٹی اسکول کی ہیڈ ماسٹری کرے گا اور پھر رامپور کی ملازمت میں داخل ہو کر ہائی کورٹ کا جج، منسٹر اور چیف منسٹر ہو جائے گا۔ ہیڈ ماسٹری اپنی خواہش سے کی تھی اور نہ رامپور کی ملازمت مگر جہاں پہنچ گئے اپنی دھاک جما دی۔ علی گڑھ یونیورسٹی اسکول کا ہیڈ ماسٹر ایک دن علی گڑھ یونیورسٹی کا وائس چانسلر بھی بنے گا، اس کا کس نے اندازہ کیا تھا۔ وہ دستور ساز اسمبلی کے ممبر بنے، لوک سبھا کے ممبر بنے اور راجیہ سبھا کے ممبر بنے اور نائب صدر مملکت ہند بنتے بنتے رہ گئے۔ اندرا گاندھی کی پیش کش کو یہ کہہ کر نامنظور کر دیا کہ میں نہیں چاہتا کہ کوئی یہ کہے کہ اس عظیم ملک کا نائب صدر گراں گوش ہے۔

جہاں کرنیل زیدی کی دیرینہ ملاقاتیں سیاسی شخصیتوں سے تھیں وہیں وہ علمی اور ادبی شخصیتوں سے بھی بہت قریب تھے۔ اقبالؔ سے ان کی تفصیلی ملاقات علی گڑھ اسکول کے زمانہ میں ہوئی تھی۔ اقبال اسکول کے بچوں سے ''مرثیہ'' سن کر بہت متاثر ہوئے تھے۔ تیسری راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں زیدی صاحب کی ملاقات لندن میں قیام پذیر ڈاکٹر اقبال سے بھی ہوئی، دونوں اکثر ساتھ گھومتے پھرتے تھے۔ اقبالؔ نے چاہا کہ ان کے مجوزہ سفر اسپین میں زیدی صاحب بھی شریک ہوں مگر مصروفیت کی بنا پر زیدی صاحب نہ جا سکے۔ جب اقبال کی ''مسجد قرطبہ'' شائع ہوئی تو زیدی صاحب کو ملال ہوا کہ وہ کیوں نہ اقبال کے ساتھ تھے۔ انہیں زندگی بھر یہ ملال رہا۔ خواجہ غلام السیدین، ڈاکٹر عابد حسین، مولانا عرشی، ڈاکٹر ذاکر حسین، پطرس بخاری جیسی ادبی اور علمی شخصیتوں سے ان کا قریبی تعلق تھا۔ یہی تعلق ادبی تحریکوں سے تھا۔ ''نوائے کیمبرج'' کے نام سے اپنی تعلیم کے دوران انہوں نے اردو کا ایک رسالہ جاری کیا۔ قاضی عبدالودود نے بھی اس رسالہ کی تدوین و اشاعت میں زیدی صاحب کا ہاتھ بٹایا۔ تین شماروں کے بعد یہ سلسلہ منقطع ضرور ہو گیا، مگر ان کا شوق باقی رہا۔ اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر کتابی دنیا نام کا اشاعتی ادارہ قائم کیا۔ بیگم زیدی کی بچوں کی کتابیں اسی ادارے سے شائع ہوئیں۔ ۱۹۶۹ء میں غالب صدی کے جشن ہوئے۔ زیدی صاحب اس کے خازن تھے اور پورے انہماک سے روپیہ کی فراہمی کا کام کیا۔ ۱۹۷۰ء میں کل ہند یادگار انیس کمیٹی کا قیام ہوا، زیدی صاحب اس کے صدر رہے۔ رضا لائبریری کو انہوں نے قائم کیا تھا۔ عرشی صاحب کی محنت سے اس کو صفِ اول

Marfat.com

کی لائبریری بنادیا تھا۔ بے شمار ادبی اور ثقافتی انجمنوں سے ان کا تعلق تھا۔ اس سلسلہ میں انجمن وظیفۂ سادات ومومنین کا ذکر بھی ضروری ہے، جس کے وہ صدر بھی رہے اور محسن بھی۔ انہوں نے ہی اس کا صدر دفتر علی گڑھ میں تعمیر کروایا اور تاحیات اس کی خدمت اور معاونت کرتے رہے۔

فلاحی اور سماجی کاموں سے زیدی صاحب کی دلچسپی تعلیمی زمانہ سے ہی تھی۔ آگے چل کر اس دلچسپی میں نہ صرف اضافہ ہوا بلکہ عملی طور پر انہوں نے قابلِ ذکر کام انجام دیئے۔ علی گڑھ کی وائس چانسلری کے زمانہ میں انہوں نے ''بال برادری'' کے نام سے ایک سوشل کلب کھولا، جس میں خالی وقت میں بچوں کو نقشے، تصویریں بنانے اور گیت وڈرامہ کی تعلیم دی جاتی تھی۔ رفتہ رفتہ یہ کلب بڑھ کر دس ہوگئے اور بچوں نے اس میں خاصی دلچسپی دکھائی۔

انسانی دوستی شاید زیدی صاحب کا سب سے بڑا وصف تھا۔ ان میں نہ رقابت کا جذبہ تھا نہ نفرت کا۔ انہیں نہ کینہ سے واسطہ تھا، نہ چھل کپٹ سے۔ وہ دشمن سے بھی اگر بدلہ لینا چاہتے تھے تو اس پر احسان کرکے، اس کے کام آکر کے۔ رامپور کے ان لوگوں کو جنہوں نے زیدی صاحب پر ۱۹۴۷ء کے ہنگاموں میں مسلم نوازی اور فرقہ پروری کا الزام لگایا تھا دلّی کے فساد سے بچانے کے لئے زیدی صاحب اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر اسپیشل ریل گاڑی سے انہیں رامپور لائے۔ دلّی کی ان کی کوٹھی ان کے عزیزوں، دوستوں اور ملنے والوں کے لئے کھلی رہی۔ کسی کا علاج ہو رہا ہے تو کسی کے مقدمے کی پیروی ہو رہی ہے۔ کوئی غیر ملک جا رہا ہے تو اس کو پہنچانے والے ڈیرا ڈالے ہوئے ہیں کوئی غیر ملک سے آرہا ہے تو اس کے اعزاء اس کو لینے کے لئے آئے ہوئے ہیں نہ ان ملنے والوں کو کبھی یہ احساس ہوا کہ زیدی صاحب کو اس عمر میں تکلیف نہ دیں اور نہ خود زیدی صاحب نے کبھی یہ احساس کیا کہ اب وہ اس اقربا پروری سے ہاتھ کھینچ لیں۔ دراصل ان کو سب اپنے نظر آتے تھے۔ کوئی بیگانہ تھا ہی نہیں۔

اللہ کے کرم سے زیدی صاحب کا کنبہ کافی بڑا ہے۔ کچھ تو خاندان بڑا ہے اور کچھ زیدی صاحب نے خود اسے وسعت دے دی۔ گاؤں کا ہر شخص ان کا عزیز ہے۔ رامپور ہو یا علی گڑھ وہاں کا ہر جاننے والا ان کا عزیز ہے۔ ان کے خاندان کا فرد ہے۔ اس کی خدمت اس کا لحاظ زیدی صاحب کا فرض ہے۔ اس کنبہ میں زیدی صاحب کے ملازمین کا بہت اہم مقام ہے۔ ڈرائیور، مالی، جمعدار، خان سامہ، دیگر خدمت گار زیدی صاحب کے توجہ کے مرکز رہتے تھے۔ ان سب کا اور ان کے خاندان کا علاج معالجہ، آرام وآسائش زیدی صاحب کے اوّلین فرائض

Marfat.com

میں داخل تھے۔ اعجاز میاں گھر کے فرد ہیں۔ ان کی صحت، لباس، علاج کا زیدی صاحب کو ہمیشہ خیال رہتا ہے۔ بچپن سے وہ گھر پر رہے ہیں۔ زیدی صاحب کے مزاج میں ان کا بہت دخل تھا۔ وہ ادنیٰ ملازم بھی ہیں، مشیر بھی ہیں اور فردِ خاندانی بھی۔ وہ خود بھی جب کب مشورہ دیتے تھے اور خود زیدی صاحب بھی ان سے مشورہ لیتے تھے یہی حال رام پیارے ڈرائیور کا ہے۔ حالانکہ آخر میں وہ ان کی ملازمت میں نہیں تھا تاہم وہ سلام کو حاضر ہوتا تھا اور زیدی صاحب اس کا اور اس کے بال بچوں کا وہی خیال کرتے تھے جو دورانِ ملازمت کرتے تھے۔

قدسیہ زیدی کے ذکر کے بغیر زیدی صاحب کا تذکرہ بالکل نامکمل اور تشنہ ہے۔ زیدی صاحب انہیں ٹوٹ کر چاہتے تھے اور وہ زیدی صاحب کی اہلیہ ہونے کے ساتھ ساتھ، ان کی مشیرِ خاص رفیق اور حرم ساز تھیں۔ زیدی صاحب کا رشتہ سیدین صاحب کی بہن سیدہ خاتون سے ہو رہا تھا، مگر ان کی عمر نے وفا نہ کی اور نہایت کم عمری میں ہی ان کا انتقال ہو گیا۔ زیدی صاحب پر اس کا بہت اثر پڑا اور انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ شادی ہی نہیں کریں گے لیکن آصف علی اور اروناآصف علی نے ان کو شادی کے لئے رضامند کیا۔ پطرس بخاری کی سالی قدسیہ پر ان کی نظرِ انتخاب پڑی۔ نواب رضا علی خاں نے بھی اس رشتہ میں دلچسپی لی۔ آخر کار بہت دھوم دھام سے شادی انجام پذیر ہوئی۔

قدسیہ نے لاہور سے بی اے کیا تھا اور تصنیف و تالیف اور تھیٹر سے انہیں خاص لگاؤ تھا۔ گاندھی بابا، ان کی مشہور کتاب بچوں کے لئے تھی جو بہت مقبول ہوئی اس کے بعد انہوں نے متعدد کتابیں بچوں کے لئے لکھیں۔ ہندوستانی تھیٹر میں قدسیہ زیدی کو اتنی دلچسپی تھی کہ انہوں نے زیدی صاحب کی علی گڑھ یونیورسٹی کی وائس چانسلری کی سخت مخالفت کی کیوں کہ وہ دلّی نہیں چھوڑنا چاہتی تھیں اور پھر جب راضی ہوئیں تو اس شرط پر کہ وہ علی گڑھ اور دلّی دونوں جگہ آتی جاتی رہیں گی۔ ۴۶ سال کی عمر میں علی گڑھ میں ان کا انتقال ہوا اور وہیں یونیورسٹی کے قبرستان میں دفن ہوئیں، زیدی صاحب کے لئے یہ عظیم نقصان تھا۔ مگر وہ اس حوصلہ اور ہمت کے آدمی تھے کہ اسے بھی بڑے صبر و اطمینان سے جھیل گئے۔ اب وہ اپنے دونوں لڑکوں اور بیٹی کے باپ بھی تھے اور مار ابھی۔ بڑے لاڈ و پیار سے ان کی پرورش و پرداخت کی۔ تعلیم و تربیت کی، مرتے دم تک ان کے ساتھ ایسا برتاؤ کیا کہ جیسے وہ سو فیصد ان کی توجہ کے محتاج ہوں اور خود کبھی ان سے کوئی توقع نہ کی۔

زیدی صاحب کے ذاتی شوق میں شجر کاری، باغ بانی اور عمارات کی تعمیر کو بڑا دخل تھا۔علی گڑھ کو جہاں موسم گرما میں دھول اڑتی تھی اپنے شجر کاری کے منصوبے سے انہوں نے اسے گلزار بنادیا۔عمارتوں کا وہ لامتناہی سلسلہ شروع کیا کہ اولاً تو طنز سے اور بعد میں اعتراف کے طور پر لوگ ان کو علی گڑھ کا شاہجہاں کہنے لگے۔بیرک نما عمارتوں سے دورِ حاضر کے طرز کی عمارتوں تک کا ان کا سفر علی گڑھ یونیورسٹی میں ان کو امر بنا گیا۔وائس چانسلر کی کوٹھی، مولانا آزاد لائبریری، پالی ٹیکنک، اسٹاف کلب، کشمیر ہوسٹل اور کینڈی ہال ان کے رچے بسے شوق کی بہترین مثال ہیں۔

جہاں ایک طرف زیدی صاحب کو شجر کاری اور عمارتوں کی تعمیر کا شوق تھا وہیں ان کو ہمہ جہت ترقی سے بھی دلچسپی تھی۔علی گڑھ یونیورسٹی کا میڈیکل کالج جن حالات میں اس وقت کے یوپی کے چیف منسٹر، سی بی گپتا کو رضامند کر کے زیدی صاحب نے بنوایا وہ ان کی دانش مندی اور دور بینی کی ایک مثال ہے۔وائس چانسلری کے پیش کش کے بعد وہ سیدھے سی بی گپتا کے پاس گئے اور پوچھا کہ کیا میں اس عہدہ کو قبول کروں۔انہوں نے کہا بشوق تو زیدی صاحب نے کہا کہ پھر ایک شرط اور وہ یہ کہ آپ ہمیں میڈیکل کالج دیں گے اور میڈیکل کالج لے کے رہے۔اسی طرح رامپور کے قیام میں ایک طرف تو تعلیمی ادارے کھولے دوسری طرف شوگر فیکٹری لگوائی۔ اسی طرح ریاست کی آمدنی میں معتد بہ اضافہ کرایا اور عوام کو روزگار کے مواقع فراہم کئے۔

دوسری جنگ عظیم میں تمام ہندوستانی ریاستوں نے امداد کی۔زیدی صاحب نے فوج اور رقم دونوں سے جنگ میں مدد کی۔رام پور بٹالین نے شمالی افریقہ میں نمایاں حصہ لیا۔ان کی فوجی امداد سے متاثر ہو کر انگریز حکومت نے انہیں CIE کا خطاب دیا اور وہ اعزازی کرنیل بنا دیئے گئے۔یہ اعزاز ان کے نام کا حصہ بن گیا۔جب ہندوستان کی آزادی پر ریاستوں سے مرجر کے لئے کہا گیا تو زیدی صاحب نے دور بینی سے کام لے کر رامپور کے مرجر کے کاغذات تیار کرائے۔رامپور پہلی ہندوستانی ریاست تھی جس نے مرجر قبول کیا اور نتیجہ یہ نکلا کہ منہ مانگے جملہ شرائط ریاست کے لئے منظور ہو گئے۔ان کی ملکی خدمات کے صلے میں آگے چل کر حکومت ہند نے انہیں پدم وبھوشن کے خطاب سے نوازا اور متعدد یونیورسٹیوں نے انہیں اعزازی ڈگریاں دیں۔

ان کے انتقال کے چند ماہ قبل ان کی بہو کا میرے پاس فون آیا۔کہا کہ زیدی صاحب یاد فرما رہے ہیں۔پہنچا تو خلاف معمول پہلی بار تین چار منٹ کی انگریزی میں یوں گفتگو کی: ''سید

Marfat.com

صاحب! میں مر رہا ہوں.....ایک ناکام انسان کی موت.....میں نے علی گڑھ کے لئے کچھ نہیں کیا، میں نے جامعہ کے لئے کچھ نہیں کیا، میں نے انجمن وظیفۂ سادات ومومنین کے لئے کچھ نہ کیا، میں نے انجمن حیدری کے لئے کچھ نہیں کیا.....سید صاحب میں ایک ناکام انسان کی موت مر رہا ہوں"۔ میں نے یقین دلایا کہ یہ سب ادارے اور انجمنیں ہندوستان کا حصہ ہیں جو دوسرے اداروں میں ہو رہا ہے، وہی ان سب اداروں میں ہو رہا ہے۔ آپ نے بہت کچھ کیا ہے۔ کچھ توقف کے بعد ان کا اضمحلال دور ہو گیا اور وہ پھر ایک باحوصلہ اور پُر امید شخص کی طرح بات کرنے لگے۔ اس معصومیت پر کون قربان نہ جائے گا۔

آج کرنیل بشیر حسین زیدی ہمارے درمیان نہیں ہیں لیکن لاکھوں دلوں میں بسے ہوئے ہیں۔ بے شمار زبانوں پر ان کا تذکرہ ہے اور یہی ہے ان کی کامیاب وکامران زندگی کی دلیل۔

☆☆☆

Marfat.com

ڈاکٹر محمود فیاض

تاج الدین

یکم جنوری ۱۹۹۴ء کی صبح چتلی قبر پر غیر معمولی ہلچل تھی وہ دکان جو کہ کرفیو میں بھی پوری طرح بند ہونے کو تیار نہیں نہ صرف بند ہے بلکہ خاموش۔ چولھے ٹھنڈے کاریگر اداس اور خاموش، کیوں نہ ہوں؟ آج تقریباً ۳، ماہ کی علالت کے بعد تاج الدین اس دنیا سے رخصت ہو گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون، زندگی کے تقریباً ۷۲ سال پورے کر کے اس دارِ فانی سے رخصت ہوئے اب تو آخری سفر کی تیاری ہے۔ مسیحی سال کے آغاز کے ساتھ ان کا آخری سفر شروع ہوا۔ چاہنے والے دوست احباب علاقہ والے غیر علاقے والے سب جمع ہو رہے ہیں روزمرہ کے ساتھی گم صم ہیں کبھی کبھی کے ملنے والے سوالیہ نظروں سے ادھر ادھر دیکھ رہے ہیں۔

کون تھے آخر یہ تاج الدین عرف تاجو اور علاقہ کے بچوں کی زبان میں بھائی شیریں بھون۔ شاہجہاں آباد بڑی خوبصورتی اور اہتمام سے بسایا گیا تھا۔ مختلف برادریوں سے وابستہ پیشوں کی بناء پر علاقہ بسے ہوئے تھے۔ مختلف مذاہب اور عقائد کے لوگ ایک ہی محلہ میں ساتھ ساتھ رہتے تھے۔ بازار بھی اسی طرح سے آباد اور بارونق تھے مگر اب تو آوے کا آوا بگڑا ہوا ہے دہلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب، بس خواب و خیال کی بات رہ گئی۔ مگر دہلی تو اب بھی آباد ہے بلکہ بری طرح سے آباد ہے زندگی اپنے بھرپور انداز میں چل رہی ہے مگر دہلی کے شب و روز طور طریقہ سب ہی تو بدل گئے۔ ذوق اگر ان گلیوں سے گزر جائیں تو دہلی کی گلیوں کو چھوڑنے میں ہی عافیت جانیں۔ بات یہ ہو رہی تھی کہ آخر یہ تاج الدین ہیں کون اور ان کا خاکہ پیش کرنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی۔ تو بھئی انسانی شخصیتوں کی چھ بنیادی قسمیں قرار دی جاتی ہیں۔ مذہبی، سماجی، علمی، جمالی، سیاسی اور معاشی اور یہ چھ قسمیں مل کر ایک مکمل معاشرہ کی تشکیل کا سبب

Marfat.com

بنتی ہیں۔ دہلی جو کہ ان مذکورہ بالا اقسام کے لوگوں کی آماجگاہ تھی اور ہے اسی کے رنگ منچ پر تاج الدین کا کردار معاشی طبقہ کی ترجمانی کرتا ہے۔

تاج الدین کے والد فیاض الدین صاحب دہلی قدیم کے باشندہ چتلی قبر کے بازار میں سید رفاعی کی مسجد کے پہلو میں راشن کی دکان چلاتے تھے، معاشی طور پر آسودہ، ان کے تین لڑکے تھے جن میں سب سے چھوٹے تاج الدین تھے والد نے ان کو اسکول میں داخل کرا دیا تھا اور وہ باقاعدہ اسکول جاتے تھے۔ حالات بدل رہے تھے جنگ آزادی زور پکڑ رہی تھی اور پھر آزادی ملک کے بٹوارے کے ساتھ مل بھی گئی اس جنگ میں اپنوں کے ہاتھوں دل بھی بہت ٹوٹے۔ خاندان برباد ہوئے زندہ بچنے والوں کا بھی برا حال ہوا خاندان تتر بتر ہو گئے اور یہ بکھراؤ تاج الدین کی قسمت میں بھی آیا۔ بڑے بھائی راشن لینے گئے تو آج تک نہیں لوٹے نفرت کی آگ دہلی میں پھیلی ہوئی تھی کچھ علاقے تو مسلمانوں کے تعلق سے برباد ہو گئے۔ اس میں سبزی منڈی کا علاقہ سب سے بری طرح برباد ہوا اور اس کا گہرا اثر تاج الدین کے خاندان پر پڑا سبزی فروش برادری سے تعلق ہونے اور جامع مسجد ایک محفوظ علاقہ ہونے کی وجہ سے رشتہ دار کنبہ داران کے گھر میں پناہ گزیں ہوئے اور ان کی کفالت تاج الدین کے والد کی ذمہ داری بنی غرضیکہ بڑا برا وقت گزرا خدا خدا کر کے حالات ذرا سنبھلے مگر ان سب باتوں کا پہلا حملہ ان کی پڑھائی پر ہوا اور اسکول چھوٹ گیا والد صاحب کی مدد کے لئے کام میں جٹنا پڑا۔ اب راشن کی دوکان بھی ختم ہوئی اور حلوائی کی دوکان شروع ہوئی ۱۹۴۷ کے دہشتناک دور کے بعد دیسی گھی کی مٹھائیوں کی دوکان آسان کام نہیں تھا خود سارا گھر اس میں لگتا۔ گھر کی عورتیں برابر شریک رہتیں۔ مصالحہ پیسنا۔ میوہ کاٹنا۔ ٹوکریاں بنانا وغیرہ گھر کی عورتیں انجام دیا کرتیں تب جا کر کام چلتا تھا۔ دہلی میں اور خاص طور پر مسلمانوں میں حلوائی کی دوکان کا تصور کچھ اس طرح سے ہے کہ صبح ناشتہ میں حلوہ پوری مٹری اور سبزی کے ساتھ کچوریاں۔ شام میں مٹھائی کے نام پر جلیبیاں، امرتیاں، بالوشاہی نکتی دانے اور میسو پاک ہر موسم میں دستیاب ہوتے اس کے علاوہ بدلتے موسم کے ساتھ بدلتے سامان برسات میں سوہال اور اندرسے کی گولیاں اور سردیوں میں گوندے کا حلوہ اور حلوہ سوہن اور رمضان میں کھجلے پھینیاں اور پھیکی جلیبیاں۔ دہلی والے مٹھائی کا استعمال بڑے منصوبہ بند انداز میں کرتے ہیں جس میں حکیمی مشوروں کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ بات پھر تاج الدین سے مٹھائی پر آ گئی تاج الدین اپنے بھائی اور والد کے ساتھ مٹھائی کی دوکان سے جڑ گئے۔ تعلیمی سلسلہ ختم مگر

بازار چتلی قبر ایسا بازار ہے جہاں اگر آنکھوں کے علاوہ کان اور دماغ بھی کھلا ہو تو بھی بہت کچھ سیکھا جا سکتا ہے جس کا واضح ثبوت تاج الدین نے اپنی زندگی میں دیا۔ دوکان کا نام لیجئے ''شیریں بھون'' بتانے کی ضرورت نہیں کہ یہ کس چیز کا نام ہے سنتے ہی منہ میں مٹھاس پیدا ہو جاتی ہے دوسری طرف ہندوستانی زبان کا قومی روپ پوری طرح سے سامنے آجاتا ہے شیریں اور بھون کے امتزاج سے جو بات بنتی ہے اس کا لطف کچھ اور ہے۔

تاج الدین ماشاء اللہ کثیر الاولاد تھے ۶ لڑکیاں اور ۴ لڑکے اس کے علاوہ مرحوم بھائی کی دو بیٹیاں اور ایک چھوٹی بہن کی ذمہ داری بھی ان پر ہی تھی۔ یہاں سے ان کی شخصیت کے مختلف پہلو سامنے آتے ہیں برادری کے تنگ دائرہ، روایتوں اور مصلحتوں کا بوجھ اور افراتفری کے شہر میں کتنی بہادری اور بے باکی کے ساتھ زندگی کے اہم معاملات کو نپٹایا۔ دہلی کی ان برادریوں میں تعلیمی شعور پیدا نہیں ہوا تھا اور اس کی ان کو ضرورت بھی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ مگر تاج الدین نے اپنی چھوٹی بہن کو علی گڑھ سے تعلیم دلوائی۔ بڑے بھائی کی دونوں بچیوں کو پڑھایا اور ایک نے M.A,B.A کیا دوسری نے B.A کیا۔ پھر اپنی ۶ بچیوں کو بھی تعلیم کے زیور سے آراستہ کیا اور سب بچیوں نے ہائر سکنڈری تک تعلیم حاصل کی بلکہ ایک بچی نے لیڈی شری رام کالج سے B.A کی ڈگری حاصل کی۔ انہوں نے لڑکوں کو بھی تعلیم سے دور نہیں رکھا دو لڑکوں نے B.A کیا اور دو بچے اپنی عدم دلچسپی کی وجہ سے دسویں کلاس تک ہی تعلیم حاصل کر سکے اکثر مشاہدہ میں آیا ہے کہ ماں باپ اپنے کسی ایک بچہ سے بہت زیادہ لگاؤ رکھتے ہیں اور ان کی مہربانیاں کچھ زیادہ ہی ہوتیں ہیں، تاج الدین بھی اپنے ایک بیٹے سے خاص لگاؤ رکھتے تھے اور اس تعلق خاص کی وجہ سے انہوں نے اس بچہ کو DPS میں داخلہ کرایا خود کیوں کہ چوتھی جماعت سے اسکول کو خیر باد کہہ چکے تھے مگر ان کے دل میں یہ بات کھٹکتی رہی کہ وہ پڑھ نہ سکے اور اسی کھٹک کی وجہ سے انہوں نے اپنے بچوں کی تعلیم پر پوری توجہ دی بیٹے کو پبلک اسکول میں داخل کرانے کے بعد بے نیاز نہیں ہوئے بلکہ ہر ماہ باقاعدگی سے اسکول جاتے اور براہ راست کلاس ٹیچر سے معلومات فراہم کرتے ان کی یہ محنت رنگ لائی اور بچہ نے ہائر سکنڈری کا امتحان پاس کیا اس کے ساتھ ساتھ کھیل میں بھی نام کمایا۔ خود تاج الدین کھیلوں میں بہت دلچسپی رکھتے تھے انہیں دہلی میں اس زمانے میں رائج سبھی بازیوں میں دلچسپی تھی بگھی دوڑ ہو یا مینڈوں کی لڑائی، کبوتر بازی ہو یا پتنگ بازی کشتی ہو یا فٹ بال بڑے ذوق وشوق سے دیکھنے جاتے۔ مشاعروں کے دلدادہ تھے کوئی

مشاعرہ قضا نہیں ہوتا تھا۔داد دینے میں بھی پیش پیش جملہ بازی اور ہونگ کے ذوق سے اچھی طرح سے آشنا۔ بات ان کے بیٹے کی ہورہی تھی صاحبزادے نے جب کھیل میں نام پیدا کیا تو پھولے نہیں سمائے اوراس کو اور ڈھیل دے دی B.A کرنے کے لئے صاحبزادے کروڑی مل کالج پہنچ گئے ۔اب اس کو دوکان کے علاوہ دنیا میں اور بھی بہت کچھ نظر آیا۔مگر بھائی تاج الدین ڈھیل دینے کا مطلب یہ نہیں سمجھتے تھے کہ اب یہ من مانی کرے اس لئے گرفت مضبوط رکھی۔ دوسرے یہ کہ تاج الدین اور ان کے جیسے دوسرے لوگ بھی آزادی کے بعد بہت زیادہ دل برداشتہ تھے علاقہ جامع مسجد پر تو خاص طور پر فرقہ پرستوں کی نظر رہتی تھی اکثر ایسا بھی ہوتا تھا کہ شام کو جب کہ دوکانداری اپنے شباب پر ہوئی اور لوگ دوکان میں بیٹھے ہوئے مٹھائی اور باتوں سے لطف اندوز ہورہے ہوتے تھے کہ ایک دم سادہ لباس میں پولس کی ٹکڑی ان پر جھپٹ پڑی اور کسی ایک شخص کو پاکستانی بتا کر لے جاتی اب آپ ثابت کرتے رہئے کہ ہم ہندوستانی ہیں ۔اس طرح کے واقعات ہوتے رہتے تھے ۔میرے چچا شجاعت علی ہاشمی اس دوکان پر روز کے بیٹھنے والے تھے تاج الدین صاحب سے ان کا شروع کا کیا یارانہ تھا چچا فٹ بال کے کھلاڑی اور یہ فٹ بال کے شوقین ٹیم کے ساتھ دہلی سے باہر کے سفر میں بھی جایا کرتے اور اپنی دلچسپ باتوں سے تفریح کے مواقع پیدا کرتے رہتے تھے ایک دن چچا کی بھی شامت آئی اور پولیس کی ایک ٹکڑی نے انہیں بھی آدبوچا کہ مولانا ہمارے پاس رپورٹ ہے کہ آپ پاکستانی ہیں چلئے ہمارے ساتھ چلئے لاکھ بتانے پر بھی کہ میں دہلی کالج میں کام کرتا ہوں وہاں میں اکاؤنٹنٹ ہوں یہ میرا کارڈ ہے۔ایک نہ چلی اور تھانہ جانا پڑا۔تاج الدین صاحب کی دوکان سے ان کے دوست کو اسطرح اٹھا کر لے جانا اندازہ کر لیجئے کہ کیا گذری ہوگی ان سب پر ایک بھیڑ جمع ہوگئی اور تاج الدین صاحب اس بھیڑ کے ساتھ دہلی کی زبان میں سلامی سناتے ہوئے تھانہ پہنچ گئے اور کہا کہ ہم سب پاکستانی ہیں سب کو گرفتار کرو اندھیر مچا ہوا ہے کہ مولانا کو فوراً رہا کرو میں ان کی ضمانت دیتا ہوں۔ غرضیکہ بھاگ دوڑ مچ گئی اور چچا کو تھانہ سے واپس لیکر ہی آئے ۔چوک جامع مسجد سے پھولوں کا ہار لیا اور چچا کے گلے میں ڈال دیا واپس کا سفر پولیس والوں اور فرقہ پرستوں کی شان میں قصیدے پڑھتے گزرا۔بات یہ ہورہی تھی کہ ان کے صاحبزادے نے B.A کی ڈگری حاصل کی اور کھیل کے میدان میں بھی نام پیدا کیا تو اس کو نیشنل ڈیفینس اکیڈمی سے نوکری آفر ہوئی مگر تاج الدین جو کہ ذہنی طور پر یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ان کا اپنا لڑکا علاقہ جامع مسجد کا رہنے والا

Marfat.com

ہندوستانی فوج میں ملازم ہوسکتا ہے اس لئے اس ادھر جانے نہیں دیا۔ آج وہ ان کا جانشین بنا ہوا ہے ان کی گدی سنبھالے ہوئے ہے۔

تاج الدین بنیادی طور پر کاروباری آدمی تھے اور اپنے کام کی باریکیوں کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ مٹھائی بنانے والے اچھے کاریگر غیر مسلم ہی ہوتے ہیں کیوں کہ دہلی میں میٹھے کے نام پر تو مسلمان زردہ، کھیر اور حلوہ پر زیادہ بھروسہ کرتا ہے اس لئے تاج الدین صاحب نے بلا کسی جھجک اور تعصب کے اپنے کام میں غیر مسلم کاریگروں کو رکھا اور یہ کاریگر بھی بخوبی کام انجام دیتے رہے اور آج بھی بحسن خوبی کام چل رہا ہے۔

ہم نے تاج الدین صاحب کو دیکھا۔ اکثر سفید وائل کا لکھنوی کرتا عمدہ قسم کا کلف لگا ہوا آستین چنی ہوئی، سفید پاجامہ پتلی موری کا سردی گرمی ایک ہی انداز بہت زیادہ سردیوں میں کشمیری دوشالہ کا اضافہ کبھی کبھی پینٹ اور بش شرٹ بھی چہرے پر مسکراہٹ کا غلبہ اکیلے کم پائے گئے ایک آدھ دوست ساتھ میں اگر یہ کہا جائے کہ دوستوں میں بلا کے پھکڑ، حاضر جوابی میں لاجواب، فی البدیہہ چپکانے میں ماہر، وضع قطع سے انتہائی شریفانہ انداز اگر دوکان پر نہ دیکھا ہو تو حلوائی کی دوکان اور تاج الدین میں کوئی مماثلت نہیں۔ سلام و پیام میں انداز بڑا مودبانہ ذرا قربت ہو جائے تو انتہائی بے تکلفانہ اور اگر ٹھہر جائیں تو لگے یارانہ۔ دوست کو دیکھ کر مسکراتے یا بآواز بلند خطاب۔ جواب سے بے نیاز نہیں رہتے تھے، بلکہ جواب کا انتظار جواب آنے پر زوردار قہقہہ دانتوں کی بھرپور نمائش اور اگر کوئی دوست نام نہاد شرافت کا لبادہ اوڑھنا چاہے تو اسے منٹ سے پہلے اس کی اوقات میں لے آنا۔ شروع ہوتے تھے ابے منڈّو کے اور آہستہ آہستہ سارے ذاتی امور روشن ہو جاتے تھے۔ جملہ بازی کا ہنر منجھا ہوا تھا کہ بڑے بڑے دُھرندر جھول جائیں۔

دہلی میں دوکاندار نوکر پیشہ کرخندار (کارخانہ دار) اپنے اپنے کاموں سے فارغ ہو کر شام ڈھلے بازار کا رخ کرتے تھے ہر محلّہ میں بلا کسی بھید بھاؤ کے لوگ جمع ہوتے چونچیں ہوتیں وقت گزر جاتا تھا جامع مسجد کے چائے خانوں اور سیڑھیوں کے علاوہ مستقل طور پر مولوی سمیع اللہ صاحب کے کتب خانہ عزیزیہ کے باہر کی تپائی بلا لحاظ مذہب وملت اور تفریق ذات برادری لوگوں کا ملن ہوتا تھا اسی طرح سے بازار چتلی قبر پر تاج الدین کی دوکان ایک مرکز کا درجہ رکھتی تھی اور جب تک دوکان کھلی رہتی تھی وقفہ وقفہ سے احباب آتے جاتے رہتے تھے اور تاج الدین بھی اپنی دوکان داری کے دوران کبھی گدی پر سے ہی اور کبھی ان کے ساتھ بیٹھ کر ہنستے ہنساتے رہتے۔

شکار، سیاست، گھریلو مسائل، ذاتی مسائل کمزوری اور طاقت کی بحثیں غرض سب کچھ زیر بحث آتا۔ دوکان بند ہونے کے بعد دوکان کے باہر ہی محفل زندہ رہتی تھی یا پھر خلیفہ شیدو کی بیٹھک یا اور کوئی ٹھکانہ پکڑتے تھے یہ سب لوگ۔

تاج الدین بیک وقت کئی زندگیاں جیتے تھے ایک طرف ان کے ساتھ بیٹھنے والوں میں مفسر قرآن مولانا یوسف صاحب تھے حاجی یونس صاحب تھے دہلی والے جانتے ہیں کہ یہ دونوں حضرات خود اپنی ذات میں ایک انجمن کی حیثیت رکھتے تھے۔ مولانا اپنے مواعظ کی وجہ سے دہلی والوں کے دل و دماغ پر چھائے ہوئے اور خاص طور پر عورتوں پر تو گویا حکمرانی کرتے تھے عجیب بات ہے کہ عورتوں کو جتنی جھاڑ پھٹکار مولانا کرتے تھے اتنا ہی یہ ان کے وعظوں میں زیادہ جایا کرتی تھیں۔ حاجی یونس بھی بلا کے بذلہ سنج اور مجلسی انسان تھے۔ شکاری بھی تھے۔ زبان اور ذائقہ دونوں کے ماہر دوسری طرف تاج الدین کے احباب میں سردار دلیپ سنگھ شکار کے شوقین بندوق بیچتے اور بندوق چلاتے تھے۔ ہریانہ کی ایک زمیندار سروپا شکار کے عمدہ ساتھی، رمیش پولس سے وابستہ شکاری دوست سکھ دیو اور بلبیر مظفر نگر سے تعلق تھا پیشہ سے کسان، شکار کے بہترین ساتھی اسی طرح سے انیس خاں صاحبؒ شاہ جہاں پور کے پٹھان CBI سے وابستہ شکار کے بڑے عزیز ساتھی شکور حسن خاں، احسن فاروقی، بھائی جمیل وغیرہ شکار کے ساتھی تھے ان سب کے ساتھ زندگی کے شب و روز گزارے۔

اب ذرا ان کے گھر میں بھی جھانک لیا جائے۔ اکثر ایسا پایا گیا ہے کہ ایک انسان جو کہ گھر سے باہر تفریح بازی کرتا ہے قہقہہ لگاتا ہے اور گھر میں قہر برساتا ہے۔ مگر تاج الدین گھر میں بھی اسی طرح سے بیوی بچوں کے ساتھ محبت کا برتاؤ کرتے انکی اہلیہ پرانے زمانے کی بڑی بوڑھیوں کے زیر نگرانی پردہ کے ماحول میں پروردہ خاتون تعلیم کا تعلق قرآن پڑھنے تک تھا لیکن تاج الدین دن بھر دوکان اور احباب سے جھونجھنے کے بعد رات کو گھر آتے کھانے سے فراغت پاتے تو ان کو اخبار نظر آتا اور بیوی کو اخبار کی سرخیاں پڑھ کر سنائی جاتیں اور اگر خبر بہت زیادہ دلچسپ ہے تو پوری خبر پڑھی جاتی ادھر یہ بیچاری دن بھر گھر کے کاموں سے تھکی ہوئی خاموشی سے سو جاتیں کچھ دیر بعد کو احساس ہوتا کہ یہ تو سو گئیں مسکراتے اور کہتے یہ تو گئیں چلو بھئی سو جاؤ اور بقیہ اخبار چاٹنا شروع جب یہ معمول لمبا ہوا تو رات میں اخبار پڑھنا بند ہو گیا اور اب دن میں کھانے سے پہلے اخبار کی بآواز قرأت ہوتی ارے دیکھ یہ کیا لکھا ہے آج اخبار والوں نے۔ فلاں شہر میں کیا قیامت

Marfat.com

ٹوٹ پڑی اور فلاں شخص نے کیا کر دیا۔ غرضیکہ اخبار کی خبریں ان کو سنائی جاتیں تھیں کہ بیوی بھی حالات سے باخبر رہے۔

تاج الدین کے احباب اور دوستوں کا حلقہ وسیع تھا دن بھر بازار کے دوکانداروں سے تو چلتی ہی رہتی تھی شام کو محفلیں جمتی تھیں ۔شطرنج، چوسر، تاش وغیرہ کا اہتمام ہوتا تھا کھانے اور تفریح کے لئے دہلی والے جانے جاتے ہیں اس لئے یہ لوگ بھی اکثر سیر وتفریح کا اہتمام کیا کرتے تھے جی کھول کر تفریح ہوتی خوب ہلڑ مچتا ایک دوسرے کی بھدیں اڑتیں اور ہنسی خوشی گھروں کو لوٹ جاتے۔ شکاری دوست تھے اس لئے شکار کا شوق بھی پیدا ہو گیا۔ شکار پر جانا اور شکار میں شریک ہونا بڑا مشکل کام ہے۔ دہلی والوں میں ایک مثل مشہور ہے شکاری شکار کھیلے اور... تماشہ دیکھے۔ شروع شروع میں تو تاج الدین تماشائی بنے رہے مگر ایک دن کسی دوست کی بات لگ گئی اور دل پر لے گئے قسم کھائی کہ اب تو شکار پر تب ہی جائیں گے جب اپنی بندوق اور گاڑی ہوگی۔ اور لگ گئے ان دونوں چیزوں کے جٹانے میں اور دونوں چیزیں حاصل کی گئیں۔ اب باقاعدہ شکاری ہو گئے۔ یوں تو سب طرح کا شکار کیا جاتا تھا مگر ان کو مرغابی کا شکار سب سے زیادہ اچھا لگتا تھا۔ اور شکار کی ہوئی مرغابی کو پانی میں سے نکالنے میں ان کو بڑا مزہ آتا تھا، شکاری شکار کرنے جائے اور کوئی انہونی نہ ہو یہ تو ممکن ہی نہیں اکثر شکاریوں کو جن بھوتوں کا سامنا ہوتا ہے تو کسی کو عجیب وغریب مخلوق سے ملاقات کا شرف حاصل ہوتا ہے مگر ان کے ساتھ زندہ اور سچ مچ کے ڈاکوؤں کا واسطہ پڑا پکڑے گئے ڈاکوؤں نے کہا ٹھیک ہے اب اپنی اپنی بندوقیں چھوڑ دو اور گاڑی بھی چھوڑ کر جنگل سے رونگی ڈالو۔ آنکھوں کے نیچے اندھیرا آ گیا سب نے اپنی اپنی فاتحہ خود پڑھی، کر بھی کیا سکتے تھے مگر حاجی یونس کے دماغ نے کام کیا۔ انہوں نے ڈاکوؤں کے سردار سے درخواست کی کہ اگر آپ اجازت دیں تو ہم لوگ بہت بھوکے ہیں اور ہمارے ساتھ ہمارا کھانا ہے اس کو کھالیں پھر مرنا تو ہے ہی پیٹ بھر کر مریں گے۔ سردار نے اجازت دے دی اور ان لوگوں نے کھانا گرم کیا حاجی صاحب نے کھانا نکالا اور سردار کے سامنے اپنی بڑی بڑی آنکھوں میں آنسو بھر کر کھڑے ہو گئے کہ جناب آپ بھی ہمارے ساتھ کھانا کھالیں ویسے بھی یہ ہماری زندگی کا آخری کھانا ہے اور ایک درخواست اور ہے کہ ہم سب لوگ عزت دار لوگ ہیں کھانے کے بعد ایک ایک گولی ہمارے جسم میں اتار دیجئے کیونکہ اس طرح سے بے آبرو ہو کر کیا جیں گے۔ ان کی باتوں نے ڈاکوؤں پر ایسا جادو کیا کہ انہوں نے ساتھ ساتھ کھانا کھایا اور اپنے

ساتھیوں کے ہمراہ ان کو جنگل سے باہر نکالا۔ لگتا تھا کہ یہ لوگ اب شکار سے توبہ کرلیں گے مگر توبہ کیا برابر شکار چلتا رہا۔

انسان کتاب نہیں کہ اس کی تنقید تحلیل اور تجزیہ کیا جائے اور کسی جزو کو رد اور کسی کو قبول کرلیا جائے بلکہ جیسا ہے سارے کا سارا لے لیا جاتا ہے۔ ہر انسان مضراب کے ان تاروں کی طرح ہے جو کہ اپنی اپنی جگہ پر جداگانہ آہنگ پیدا کرتے ہیں لیکن سازندہ کی صلاحیت اور مہارت سے موسیقی پیدا ہوتی ہے۔ تاج الدین بھی ہمارے سماجی ساز کا ایک تار تھے جو کہ اپنے آپ میں ایک مکمل اکائی کی حیثیت رکھتے تھے۔ بات خدا لگتی کہنے کا تو زمانہ گیا مگر تھوڑی بہت جتنی بھی سچائی باقی ہے اس کو ہی غنیمت جانئے ورنہ آنکھ سے اوجھل ہوئے اور آنکھیں بدلیں۔

خیال خاطر احباب چاہئے ہر دم
انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

☆☆☆

Marfat.com

سید ضمیر حسن دہلوی

جاوید وششٹ

اردو کے مزاج میں جو گرمیٔ جذبات ہے، عشق پیشگی ہے، حق گوئی اور بے باکی ہے۔ تصوف کے واسطے سے جو وجدانی کیفیت اور سرمستی کا عالم ہے، بے نیازی اور سیر چشمی ہے انہی عناصر نے مل کر جاوید وششٹ کی تعمیر و تشکیل کی تھی۔ انہیں دیکھ کر دبستانِ اردو کی ایک ایک ادا یاد آتی تھی اور اگر دبستانِ اردو کا ڈوب کر مطالعہ کریں تو جاوید وششٹ صاحب جیتی جاگتی شکل میں آپ کے سامنے آ کھڑے ہوں گے۔ موصوف کا تعلق سرزمینِ ہریانہ سے تھا، جو اردو کا وطن اور جائے پیدائش خیال کی جاتی ہے۔ فتح پور بلوچ ضلع فرید آباد سے ان کا رشتہ ہمیشہ مستحکم اور استوار رہا انہوں نے اپنی ذہانت پر منافقانہ پردے نہیں ڈالے بلکہ اس کی معصومیت، سادگی اور ناتراشیدگی کا ایسا پسندیدہ اظہار کیا کہ شہر طبیعتوں کی صناعی بھی اکثر ان پر رشک کرتی دکھائی دیتی تھی۔ دیہات کی طرح جاوید وششٹ صاحب نے ہندو دھرم کو بھی ہمیشہ جان سے زیادہ عزیز رکھا۔ وہ شوشنکر کے ماننے والے تھے اور اس پر سدا فخر بھی کرتے رہے۔ ان کے اندر جو کلاکار براجمان تھا وہ فطری طور پر کرشن، رادھا، برج بھومی کے رنگ رنگیلے میلوں ٹھیلوں تیج تیوہاروں، رام لیلاؤں، ہولی اور دسہرے کے گیت گاتا رہا البتہ اردو زبان کی نزاکت اور ادائیگی کا وہ حسین انداز جس میں برج بھاشا کا اس لوچ اور مٹھاس کی سدا بہار پھوار برستی رہتی ہے۔ ان گیتوں کا فن دوبالا کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوئے۔ جاوید وششٹ اگر دبستانِ اردو سے وابستہ نہ ہوتے تو یقیناً ہندی زبان کے کوی لیکھک ہوتے۔ ان کی شاعرانہ شخصیت کی انفرادی اور انوکھی ادا یہ تھی کہ وہ ہندی وچار دھارا اور ہندو فلسفہ کی روح کو اردو جیسی فصیح زبان میں اس کے ادبی محاسن کے وسیلے سے بیساختہ نظم کر گئے۔ جاوید وششٹ کی نظموں میں بھگتی بھاؤ کی پوتر آتما کا مقدس روپ، پریم

Marfat.com

لیلاؤں کا نکھرا اسلوب، ہندوستانی رسوم اور روایات، ویدانتی طریقہ ہائے عبادات، پوجا آرتی وغیرہ کے جن لوازمات کا ذکر ملتا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ برہمن نژاد ہونے کی حیثیت سے ہندو نظریات، خداپرستی کے ہر نازک اور لطیف پہلو سے مکمل واقف رہتے تھے۔ اپنی کتاب ''انشائیہ پچیسی'' میں انہوں نے اپنے مسلک کی طرف یہ کہہ کر اشارہ کیا ہے:

دیر ملے تو سر جھکا
کعبہ ملے سلام کر

ہندوستان میں جگہ جگہ جس گنگا جمنی تہذیب کی مالا جپی جاتی ہے شیخ و برہمن کے یک جان دو قالب ہونے کا ذکر کیا جاتا ہے۔ قومی یک جہتی کے نام پر جن عناصر کو باہم شیر و شکر کرنے کی سعی کی جاتی ہے، ان کا جیتا جاگتا مرقع جاوید صاحب کی شخصیت تھی۔ کرشن ''بھگتی'' کے ساتھ ساتھ انہوں نے حضرت علی کرمہ اللہ وجہہ کی منقبت کا بھی حق ادا کیا۔ حضور اکرم ﷺ کی شان میں پرخلوص اور پر مغز نعتیں بھی کہیں۔ اپنے استاد محترم شمیم کرہانی کے ساتھ وہ محرم کے مہینے میں عزاداری کی مجلسوں میں باقاعدگی سے شریک ہو کر امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو نذرانۂ عقیدت پیش کرتے تھے۔ یہ سب انہوں نے حکومت کی نام نہاد قومی یک جہتی کی پالیسی کے تحت اختیار نہیں کیا تھا بلکہ بچپن میں انہیں یہ سبق اپنی دادی کی نصیحت سے ملا تھا اور بعد میں اردو کے واسطے سے جب وہ صوفیائے کرام کے معتقد ہو گئے تو یہ رنگ زیادہ گہرا ہو گیا۔ دیکھا گیا ہے کہ جب کوئی شخص کسی خاص ماحول میں اپنے تئیں اقلیت کا فرد تصور کرتا ہے تو متعدد نفسیاتی بیماریوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ جاوید صاحب اس کے برعکس مسلمانوں کے بیچ رہ کر بالکل صحت مند رہے۔ وہ ہمارے دسترخوان پر بیٹھے لیکن انہوں نے کبھی گوشت نہیں کھایا۔ پیغمبر اسلام اور ان کی آل اولاد سے محبت کی لیکن اپنا آبائی دین نہیں چھوڑا۔ شو پرشاد بھی رہے اور مورتی پوجا سے اجتناب بھی کیا موحد بن کے خداپرستی کے فرائض انجام دیے۔ پلنکوں اور کالج کی دوسری تقریبات میں وہ دھوتی کرتا اور زرد دوشالہ پہن کر آتے تو بڑے چغادری پنڈت اور مہنت دکھائی دیتے تھے۔ طلباء سمجھتے تھے کہ بہروپ بھر کر آئے ہیں مگر عام لباس وہی تھا جو ہم اور آپ پہنتے ہیں۔ شیروانی اور چوڑی دار پائجامہ جو وہ اکثر جاڑوں میں پہنتے تھے ان کے کسرتی جسم پر بہت بھلا معلوم ہوتا تھا۔

دلّی کالج اپنی طرز کا ایک منفرد ادارہ ہے۔ باہر کے لوگ اس کے دل میں جھانکنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے۔ مورخین نے اکثر مغلوں کی وسیع المشربی کا ذکر کیا ہے۔ بابر نے اپنے لڑکے

ہمایوں کومرتے دم جووصیت کی تھی اس میں ہندوؤں کے ساتھ محبت اور مساوات کا سلوک روا رکھنے کی تعلیم دی گئی تھی۔اکبرتو اس معاملے میں اتنا آگے بڑھ گیا تھا کہ اس کے ہاتھ سے خود اس کے دین کی رسی چھوٹنے لگی تھی۔مرزا محمود بیگ جو آزادی کے بعد دلی کالج کے پرنسپل ہوئے خاندانی اعتبار سے اصل نسل مغل تھے۔انہوں نے دلی کالج میں مغلوں کی اس روایت کو جان سے زیادہ عزیز رکھا، جسے بابر نے ہندوستان گیر پیمانے پر فروغ دیا تھا۔جن لوگوں نے مرزا صاحب ایسے پنڈت ہری شنکر کالاڈ پیار دیکھا ہے وہی اس گنگا جمنی ملاپ کی داد دے سکتے ہیں۔کالج کے لان پر موسوی صاحب اور شنکر صاحب یوں چہل قدمی کیا کرتے تھے جیسے یہ حضرات ایک ہی شریر پر دو انگ ہوں اور یونانی دیوتا نے انہیں ابھی ابھی اپنی تلوار سے علیحدہ کیا ہو۔دفتر میں صاحب اور مبارک صاحب کی دوستی ضرب المثل تھی۔غرض یہ کہ اس عمارت میں چاروں طرف یکجہتی کے ایسے مظاہرے دکھائی دیتے تھے جن پر بجا طور سے ناز کیا جا سکتا ہے۔جاوید وششٹ صاحب نے ہی کالج کی اس معتبر روایت کو آگے بڑھانے میں خاطر خواہ حصہ لیا تھا، ان کے جوڑی دار مولانا عبد الطیف اعزازی کو دیکھئے تو ایسا لگتا تھا کہ وہ آدھے پنڈت ہو گئے ہیں اور جاوید صاحب کو اس وقت تک کوئی پہچان ہی نہیں سکتا تھا جب تک ان کا تعارف باقاعدہ بشیشر پرشاد وششٹ کہہ کر نہ کرایا جائے۔مزے کی بات یہ ہے کہ جاوید وششٹ صاحب اور اعزازی صاحب کی طبعیتیں متضاد تھیں۔

اعزازی صاحب خردمند تھے اور جاوید صاحب قلندر ایک بے انتہا محتاط اور دوسرے سخت غیر محتاط ایک مصلحت کے حامی دوسرے سراسر مخالف۔اعزازی صاحب کا اصول تھا کہ مارتوں کے پیچھے رہو اور بھاگتوں کے آگے۔جاوید صاحب کا مسلک تھا کہ ''ستون دار پہ رکھتے چلو سروں کے چراغ''۔مولانا چوٹی عالم تھے عربی، فارسی، اردو کے ماہر اور ہندی کے مستند ودوان چنانچہ ان دونوں کی دوستی بھی ایک عجوبہ تھی۔جذبِ عشق کا وہ معجزہ جس کی مثال شاید مشکل ہی سے ملے گی۔

جاوید صاحب کا پہلا شعری مجموعہ شائع ہوا تو میں نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا اب آپ کی شاعری میں خونِ جگر کا رنگ آنے لگا ہے۔زخم کو ہرا رکھیے تب شعر میں نشتریت پیدا ہوگی'' وہ بولے''زخم تو بیس برس سے پال رکھا ہے اب تو اس نے بھی ہتھیار ڈال دیئے'' بات آئی گئی ہوئی۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ جاوید صاحب کسی زخم کی پروا نہیں کرتے تھے۔ان کے مزاج میں

Marfat.com

جوقلندری تھی اس نے انہیں فکر دنیا سے نکال دیا تھا۔ بڑے بڑے حوصلہ شکن مواقع آئے اور ہوا کے جھونکے کی طرح گزر گئے۔ سنا ہے جوانی میں انہیں کسی نے زہر دے دیا تھا وہ شیو کی ہی طرح اسے پچا گئے پھر خود ان کے زہر سے دشمنوں کا زہرہ آب ہوتا تھا جو انہیں زک پہچانے کی کوشش کرتا لقمۂ اجل ہو جاتا تھا۔ یہ بات میری آنکھوں دیکھی ہے کانوں سنی نہیں۔ رانچی میں اردو اساتذہ کی کانفرنس تھی۔ ہمیں ٹھہرنے کے لئے جو جگہ دی گئی تھی وہ شہر سے کچھ دور تھی۔ رات کو مچھروں نے ایسی یلغار کی کہ ہر شخص تنگ آ کر اپنا منہ پیٹتا رہا۔ ساری رات جاگتے گزری۔ صبح میں اور صلاح الدین جاوید صاحب کے کمرے میں گئے تو وہ ہشاش بشاش دکھائی دیتے تھے۔ مچھروں کا ذکر آیا تو کہنے لگے ''کبھی ہمارے تو جس نے کاٹنے کی کوشش کی وہ آپ ہی لمبا لیٹ گیا۔'' یہ کہہ کر پلنگ کی طرف اشارہ کر کے کیا جہاں سینکڑوں مچھروں کی لاشیں پٹی پڑی تھیں۔ جاوید صاحب کچھ دنوں کے لئے اپنا ذہنی توازن بھی کھو بیٹھے تھے۔ حساس آدمی تھے اپنوں کی بے وفائی برداشت نہیں ہوئی مگر انہوں نے ہمیشہ اسی ذات شریف کا ذکر، جس نے انہیں زہر دیا تھا ہنس ہنس کر کیا نہ کوئی شکوہ نہ شکایت ''تو اپنے خون کو دامن سے دھو ہو سو ہوا''۔ دماغی اسپتال میں رہے تو دیوانگی کے جوہر بھی دیکھے۔ فرزانوں کی دنیا سے زیادہ انہیں دیوانوں کی دنیا پسند آئی جب ہی تو بقیہ زندگی دیوانگی کے سہارے، بسر کرتے رہے۔ انہیں اَن گنت افلاطونی عشق ہوئے۔ بحریہ کا مسئلہ ہماری سمجھ میں ان کے توسل سے آیا ہے۔ کنہیا کی طرح وہ گوپیوں کے درمیان گھرے رہے مگر مصری کی مکھی نہیں بنے انہیں حسن سے والہانہ لگاؤ تھا۔ لیکن اس لگاؤ میں جو مقدس اور پاکیزگی تھی اس کا اندازہ صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جنہیں ان کے قریب رہنے کی سعادت حاصل ہوئی تھی۔ جاوید صاحب سدا کے رنڈوے تھے۔ ہماری ملاقات سے پہلے ہی ان کی بیوی کا انتقال ہو چکا تھا۔ کم عمری میں شادی ہوئی اور عین جوانی میں ساتھ چھوٹ گیا۔ اس پر بھی ہم نے انہیں کبھی تنہائی کا ماتم کرتے نہیں دیکھا ان کی زبان سے عام لوگوں کی طرح دوسری شادی کی خواہش کا اظہار بھی ہوا۔ وہ بڑے شکر گزار آدمی تھے خود اپنی ذات ہی ایک انجمن جینے کے لئے انہیں کسی سہارے کی ضرورت نہیں تھی اسی لئے بہت کم لوگ جانتے تھے کہ وہ اکیلے زندگی گزار رہے ہیں، اپنے نوکر ''اکھنڈ'' کے ساتھ وہ اسی طرح رہتے تھے جیسے دو دوست آپس میں مل جل کر رہتے ہیں۔ مسکراہٹ سدا ان کے ہونٹوں پر کھیلتی رہی اسی لئے وہ ہمیشہ ہر مجلس کی روح رواں بنے رہے۔ ان کی سہن شکتی دیکھ کے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ صرف باہر سے ہی چتوڑ کا قلعہ نہیں

Marfat.com

دکھائی دیتے تھے اندر سے بھی فولاد کی مانند مضبوط تھے۔ انہیں کھانے پینے، خوش رہنے اور سیر و تفریح کرنے کا شوق تھا۔ البتہ وہ کھانے کے معاملے میں کبھی حد سے تجاوز نہیں کرتے تھے۔ سیر ہو کے کھاتے تھے اور غالباً ایک دو نوالوں کی گنجائش بھی چھوڑتے تھے اسی لئے انہیں کھا کے پچھتاتے نہیں دیکھا گیا۔ وہ قلندر ہونے کے باوجود اپنے تمام کاروبار دنیاوی میں اصول پسند اور ضابطہ شناش آدمی تھے۔ زندگی سلیقے سے گزارنی چاہتے تھے تب ہی تو انہوں نے سب اولادوں کے لئے مکان بنوا دیے۔ خاندانی ذمہ داریوں سے خوش اسلوبی کے ساتھ فارغ ہونے اور آخر عمر میں ایک لمبے چوڑے قطعۂ زمین پر باغ بنوا کر اس کے بیچوں بیچ وشسٹ آشرم میں فراغت کی زندگی گزار رہے تھے۔ ملک الموت کا ان سے وہیں اکیلے میں سامنا ہوا۔ اپنے مخصوص بانکپن کے ساتھ وہ پلنگ سے اتر کر زمین پر جا لیٹے اور برضا و رغبت جانِ عزیز اسی کی سپردگی میں دے دی۔ ہمیشہ رہے نام اللہ کا۔

مجھے جاوید صاحب کے اشعار پسند تھے وقت کے ساتھ ساتھ ان میں پختگی آتی گئی تھی۔ البتہ اس میں سرشاری اور ہشیاری کے درمیان جو ایک توازن دکھائی دیتا تھا وہ ہم جیسوں امیروں کی طبیعت پر گراں گزرتا تھا۔ کاش وہ تھوڑی سی سرمستی اختیار کر لیتے تو ان کے کلام میں وہ رنگ آ جاتا جو فراق اور جگر کی شاعری میں تھا۔

جاوید صاحب دیہات کی برکت اور شہر کی سہولت دونوں سے فیضیاب رہے۔ وہ ہمیشہ سے چھٹی کا دن اپنے گاؤں جا کر گزارتے تھے۔ ایک لمبے چوڑے کنبے کے سرپرست ہونے کی وجہ سے ان کے سر پر بہت سی ذمے داریاں بھی رہیں، مدتوں گاؤں کے سرپنچ کی حیثیت سے انہوں نے لوگوں کے جھگڑے بھی چکائے۔ کالج میں اکثر ان کے پاس لمبے چوڑے قد آور جاٹ سروں پر پگڑیاں باندھے اپنے جھگڑے نمٹوانے آیا کرتے تھے، وہ خاموشی کے ساتھ سب کی سنتے رہتے اور چندر گپت موریہ کی طرح جب فیصلہ سناتے تو دونوں فریق اسے بے چون و چرا تسلیم کر لیتے تھے۔

ان کی منصفی میں مصلحت اندیشی تو ہوتی تھی۔ مصلحت کوشی نہیں ہوتی تھی۔ وہ ہمیشہ حق اور سچائی کا ساتھ دیتے تھے لیکن حق اور سچائی تک پہنچنے کے لئے بسا اوقات خاطر خواہ جستجو نہیں کرتے تھے، ہر بھلے آدمی کی طرح ان کی بھی چند ذاتی کمزوریاں ہوتی تھیں اور سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ وہ سیدھے آدمی تھے عیاروں کے پھندوں میں آ جاتے تھے۔ کالج کے پرنسپل

Marfat.com

مرزا محمود بیگ سے ان کی مدتوں آنا کانی چلتی رہی، سرد جنگ کا سا ماحول رہا، بیگ صاحب مرحوم کے پاس کچھ جاسوس تھے وہ انہیں کالج میں ہونے والے پل پل کے واقعات کا پتہ دیتے تھے۔ اکثر اساتذۂ کالج کو اس کا علم تھا اس لئے وہ ان تمام باتوں سے پرہیز کیا کرتے تھے جو پرنسپل کے ذہن میں ان کی جانب سے بدگمانی پیدا کریں۔ جاوید صاحب کی بے باک طبیعت ہر قسم کی احتیاط اور پردہ داری کو سب سے بڑا جرم سمجھتی تھی۔ انہوں نے جو کچھ کیا ڈنکے کی چوٹ کیا۔ طلباء اور طالبات کے خالص صحت منداور عشقیہ تعلقات میں ان کی سرپرستی فرمائی چنانچہ بہت سی بیلیں منڈے چڑھ گئیں۔ کبھی کسی متعلقین کے احباب نے چاہا کہ ان کی مدد لے کر عاشق و معشوق میں جدائی کے اسباب پیدا کریں تو انہوں نے ٹکا جواب دے دیا۔

تو برائے وصل کردن آمدی
نہ برائے فصل کردن آمدی

خفیہ معلومات پرنسپل تک پہنچانے والے ان کی اس جرأت پر چڑ گئے اور وہ حرکت کرنے لگے جو نارد مُنی دیوتاؤں کے بیچ کیا کرتے تھے۔ چنانچہ دونوں میں ٹھن گئی۔ بیگ صاحب نے اردو ڈپارٹمنٹ کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ اور جب دونوں کا سامنا ہوتا تو جاوید صاحب بھی دیوجان سے کلبی بن جاتے تھے۔ بہت دن یونہی گزر گئے آخر ایک الوداعی تقریب میں جب بیگ صاحب نے اپنی تقریر میں دو چار چبھتی ہوئی باتیں کہیں، تو جاوید صاحب کے سر والے بھی کھل کھیلے۔ سب گلے شکوے ایک سانس میں اگل ڈالے۔ بیگ صاحب بھی جہاں دیدہ آدمی تھے۔ معصوم اور گنہگار میں تمیز کرنا جانتے تھے معاملہ کی نزاکت کو سمجھ گئے۔ اقتدار کی کرسی سے اتر کر جوابی تقریر میں جاوید صاحب کے دل پر ایسے پھائے رکھے کہ سارے زخم بھر گئے۔ دوریاں قربت میں بدل گئیں۔ اس دن کے بعد ہم نے کبھی ان صاحبان کو ایک دوسرے کی برائی کرتے نہیں سنا، دونوں آپس میں شیدائی ہو گئے تھے۔

لوگ کہتے ہیں دلی ہندوستان کا دل ہے" اٰمَنَّا وَصَدَّقْنَا "میں کہتا ہوں کہ دلّی کا دل تھا دلّی کالج۔ دلی کالج کو لوگ آج ذاکر حسین کالج کے نام سے جانتے ہیں۔ یہی وہ ادارہ ہے، جس کے سبب سے شمالی ہندوستان اور خاص طور پر دلی اور اس کے قرب و جوار میں انگریزی علوم کی شمع روشن ہوئی۔ ماسٹر پیارے لال۔ ماسٹر رام چندر، مولوی ذکاء اللہ اور الطاف حسین حالؔی جیسی شخصیات نے اس ادارے کو وہ حیات جاوداں بخشی ہے کہ رہتی دنیا تک اس کا نام رہے گا۔ جاوید

Marfat.com

صاحب مزاجاً پہلوان آدمی تھے، ایک مدت تک انہوں نے اس روایت پر کوئی دھیان نہیں دیا۔ بس شاعری کرتے رہے لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ تاریخ اور ماحول سے آدمی دیر تک بیگانہ نہیں رہ سکتا۔ جاوید صاحب بھی ایک دن لنگوٹ کس قلم ہاتھ میں لے کر لکھنے بیٹھ گئے۔ دکن کی سنگلاخ زمین پر کام کیا، بڑی بڑی حیران کن باتیں دریافت کیں۔ بارہ پیاریوں کا حسب نسب ڈھونڈھ نکالا۔ آڑی ترچھی زبان کے الفاظ کا طلسم کھولا اور رفتہ رفتہ یہ کیفیت ہوئی کہ ان کے مضامین دہلی سے بطور سوغات دکن جانے لگے۔ وجہی، ملی قطب شاہ اور دکن کے دوسرے شعراء پر ان کا وقیع کام ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ جو کام علاء الدین خلجی، محمد تغلق، محی الدین، اورنگ زیب سے نہ ہو سکا وہ شوپرشاد وششٹ نے کر دکھایا۔ سیاسی لوگ تیلگو دیشم بنا رہے تھے اور جاوید صاحب کی خدمات کے عوض سارا دکن مرکز کے زیرِ نگیں ہزاروں میل بیٹھے جاوید صاحب دہلی کے رکن کے لئے جو فیصلہ صادر فرماتے تھے اسے دکن والے بہ رضا و رغبت قبول کرتے تھے۔ جاوید صاحب نے بابائے اردو مولوی عبدالحق سے کسب فیض کیا تھا۔ عبادت بریلوی کی آنکھیں دیکھی تھیں۔ یقیناً ان کے کان میں ایسے نکتے پڑے ہوں گے، جنہوں نے اس ہفت خواں کو طے کرنے میں ان کی مدد کی ہوگی۔ اس مہم سرائی میں جفاکشی کے اس میلان کا بڑا حصہ تھا جو ان کی طبیعت کا خاصہ تھا۔ جاوید صاحب پرانی طرز کے اسکالر تھے۔ مکتب کی تعلیم تو شاید انہوں نے نہ پائی ہوگی لیکن مکتب والوں کا جلال ان کے یاں بدرجہ اتم پایا جاتا تھا۔ میز کرسی کے بجائے وہ چارپائی پر اکڑوں بیٹھ کر کام کرتے تھے۔ کڑی تپسیا کی ان کی عادت تھی، گھنٹوں جنبش نہیں کرتے تھے۔ داغ کی طرح جہاں بیٹھ گئے۔ بیٹھ گئے۔ تب یہ ہوا کہ ہزاروں صفحے کالے کئے اور سیاہ رات کے جادو کو روشنی کی لکیر سے توڑ دیا۔ انہیں اپنی محنت کے عوض کئی اکیڈمیوں سے انعامات ملے۔ تعلیمی اداروں کی ممبر شپ دی گئی اور ساہتیہ اکادمی کا رکن منتخب کیا گیا۔ ہریانہ جوان کا وطن تھا اس کی ادبی مسند پر وہ تنہا جلوہ افروز دکھائی دیتے تھے اور اپنی آخری عمر تک انہوں نے اس علاقے کے کونے کونے میں اردو زبان کی تدریس کے مواقع بہم پہنچائے تھے۔ مشہور زمانہ دَرون اچاریہ کو لوگ اس وجہ سے جانتے تھے کہ انہوں نے راج ونشیوں کو سپہ گری کی تعلیم دی تھی۔ جاوید صاحب کی خدمات کسی ایک طبقے تک محدود نہیں تھیں۔ انہوں نے کم وبیش چالیس برس تک دلی کالج میں پڑھایا تھا۔ سینکڑوں پتھر ان کی تراش خراش سے ہیرا بن گئے۔ کتابی علم کے تو وہ برائے نام قائل تھے البتہ کردار سازی اور عملی قوتوں کو اجاگر کرنے میں انہیں ید طولیٰ حاصل تھا۔ جس زمانے میں استاد

Marfat.com

انگریزوں کی مانند کالے آدمی سے بات نہیں کرتے تھے اس زمانے میں بھی ان کی اپنے شاگردوں سے دوستی تھی۔ دوستی بھی ایسی کہ شاگرد اپنے نجی معاملات میں بھی ان سے مشورہ لیا کرتے تھے۔ آزاد ذہنوں کو انہوں نے تعمیری ڈگر پر لگایا اور زندگی گزارنے کے وہ ڈھنگ سکھائے جو پرانے زمانے کے گرو اپنے چیلوں کو سکھاتے تھے۔ ان کا رجائی فلسفہ ایسا دلپذیر تھا کہ سینکڑوں غم پسند عشاق جو مایوسیوں کی گود میں دم توڑ رہے تھے ان کی ترغیبات سے ہنستے کھیلتے جینے پر آمادہ ہو گئے۔ وہ خود بھی کبھی نہیں گھبراتے تھے اور گھبرائی ہوئی طبیعتوں کو سنبھلنے کا حوصلہ دیتے تھے۔ نہ صرف دہلی بلکہ تمام ہندوستان میں ایسے ان گنت لوگ ہوں گے جنہیں جاوید صاحب کی شاگردی کا شرف حاصل ہوا۔ یقیناً وہ فارغ التحصیل ہو کر بھی ان کے نام کا کلمہ پڑھتے ہوں گے۔

ہمارے بچپن میں ایسا لٹریچر بہت چھپتا تھا جس میں شہر اور دیہات کی زندگی کا موازنہ کیا جاتا تھا۔ عام طور پر شہر کی زندگی کے مقابلے میں دیہاتی زندگی کی سادگی کو سراہا جاتا تھا۔ ان مضامین کے مطالعے سے ہم نے یہ گمان کیا کہ شہر اور گاؤں ایک دوسرے کی ضد ہوتے ہیں اور ان دونوں کے رہن سہن میں بعد المشرقین پایا جاتا ہے۔ سادگی کے ساتھ ساتھ کچھ بھونڈا اور بھدا پن بھی دیہاتی زندگی کا جز قرار دیا جاتا تھا اسی لئے شہر کے لوگ گاؤں والوں کو کم نگاہی سے دیکھتے تھے۔ مجھے پہلا سابقہ پرائمری اسکول کے ایسے استاد سے پڑا تھا جو گاؤں کے رہنے والے تھے اور دوسری شخصیت جس کا نام میں اس ضمن میں لے سکتا ہوں محترم جاوید صاحب کی تھی۔ جاوید صاحب کی دیہاتیت پر شہر کی تمام رعنائیاں قربان تھیں۔ وہ جس صفائی ستھرائی اور پاکیزگی سے رہتے تھے اسے دیکھ کر کم از کم میرے دل سے تو شہری عصبیت یکسر ختم ہو گئی۔ اب جی چاہتا ہے کہ ہر شہر والے کا آبائی تعلق گاؤں سے ضرور ہونا چاہئے۔ شہر میں رہ کر جو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں دیہات اور قصبات سے دیرینہ وابستگی ان کی تلافی کر سکتی ہے۔ افسوس کہ اس سہولت کو دانستہ ختم کیا جا رہا ہے۔ شہر کی تمام لعنتیں رفتہ رفتہ گاؤں میں بھی پہنچ رہی ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ نام نہاد جمہوریت میں سیاسی دھڑے بندے کے لئے دیہات کو ہی میدان بنایا جانے لگا ہے۔ لیکن اس ناگزیر یلغار کے باوجود اگر گاؤں اور شہر میں کیفیت کا نہیں تو کمیت کا فرق ضرور ہے۔ جی چاہتا ہے کہ ہم سب اٹھیں اور جاوید صاحب کی طرح دیہات کے معصوم ماحول کو بگڑنے سے بچالیں۔

Marfat.com

جاوید صاحب کالج کی ملازمت سے دستبردار ہوئے تو انہیں دیکھ کر ہر شخص نے کہا کہ یہ تو ابھی جوان معلومات ہوتے ہیں۔ واقعی ان کے چہرے پر سرخی دوڑ رہی تھی اور قویٰ میں دور تک اضمحلال کا پتہ نہیں تھا۔ احباب نے سوال کیا؟ ''جاوید دوڑا اپنی صحت کا راز بتایئے'' انہوں نے پہلے تو ادھر ادھر کی باتیں کیں پھر فرمانے لگے ''شعلہ تشنگی'' یہی ان کے پہلے شعری مجموعہ کا عنوان تھا۔ یکا یک مجھ پر انکشاف ہوا کہ سیرابی تو دراصل تن آسانی پیدا کرتی ہے اور رفتہ رفتہ اکتاہٹ کے ذریعہ موت کے آغوش میں پہنچا دیتی ہے۔ زندگی کا راز تو واقعی تشنگی میں مضمر ہے۔ میں نے جاوید صاحب کے چہرے کو بغور دیکھا تو وہ زندگی بھر تشنہ رہ کر بھی شاداب دکھائی دیتے تھے معاً ذہن میں خیال آیا کہ سکندر بھی تو چشمہ حیواں سے پیاسا لوٹ آیا تھا۔ پیاس ہی تو جینے کی علامت ہے ۔ خدا کرے جاوید صاحب آئندہ بھی ساحل کے لئے استغنا کے ساتھ دریا کی بیکراں موجوں کو ٹھکراتے رہے۔ تشنگی ہی انہیں عزیز ہے۔ تشنگی ہی انہیں عزیز رہے اور تشنگی میں ایک دن حیاتِ جاوید عطا کرے۔

زندگی کے آخر ایام میں وہ سخت بیمار ہوئے۔ بترا اسپتال کے ڈاکٹروں نے ان کے جسم پر جگہ جگہ نشتر زنی کی۔ دیکھنے والے اس تکلیف کے تصور سے کانپ جاتے تھے مگر جاوید صاحب کی ہدایت تھی کہ انہیں بے ہوش نہ کیا جائے۔ آپ اپنا غیر بن کے وہ ان زخموں کا تماشا کرتے رہے۔ صحت یاب ہونے پر کہنے لگے زندگی کے یہ تجربات ہر ایک کو کہاں نصیب ہوتے ہیں۔ ہم نے سوچا کہ چلتے چلتے ان کا بھی مزا لیا جائے۔ رگِ جاں پر نشتر چلتا ہے تو اس وقت ایک ایک پل جینے میں بڑا لطف آتا ہے۔

تیس جنوری کی رات کو وہ کسی بیرونی مشاعرے سے واپس آئے تو حسبِ معمول اپنے آشرم میں آرام کرتے ہوئے انہوں نے جان جانِ آفریں کے حوالے کر دی۔ صبح ان کے عزیزوں کو پتہ چلا کہ جاوید صاحب اب زندہ جاوید ہو گئے ہیں۔

☆☆☆

Marfat.com

ڈاکٹر صلاح الدین

پروفیسر خواجہ اَحمد فارُوقی

شخصیت کیا ہوتی ہے؟ اس پر مفصل بحث کرنے کا یہ موقع نہیں، مجمل طور پر اسے یوں سمجھ لیجئے کہ شخصیت ان جسمانی اور اخلاقی صفات کے مجموعے کا نام ہوتا ہے جنکی بدولت کوئی شخص عام لوگوں سے امتیاز حاصل کر کے ان پر اثر انداز ہوتا ہے... یہ بات بھی شخصیت کی تعریف ہی میں داخل ہے کہ وہ اپنے ماحول پر اثر انداز ہوتی ہے، البتہ اس بارے میں بہت کچھ اختلاف ہے کہ اس کے اثر کی کیا حدود ہیں۔ اکبر الہ آبادی نے کہا ہے کہ:

مردوہ ہیں جو زمانے کو بدل دیتے ہیں

اور اقبال نے تو شخصیت کو (جسے وہ خودی کہتے ہیں) خدائی کے حد کے قریب پہنچا دیا ہے، مگر ایسے لوگ بھی ہیں جن کے نزدیک شخصیت سراسر اپنے زمانے یا ماحول کی پیداوار ہوا کرتی ہے۔

پروفیسر اشپرنگر نے انسانی شخصیتوں کی چھ بنیادی اقسام قرار دی ہیں مذہبی، سماجی، علمی، سیاسی اور معاشی... میرے مخدوم اور استاد محترم پروفیسر خواجہ احمد فاروقی صاحب مرحوم و مغفور کی شخصیت یوں تو ان تمام اقسام کی آمیزش اور مجموعے کا نام تھی لیکن ان میں علمی، جمالی اور مذہبی عناصر زیادہ نمایاں حیثیت کے حامل تھے۔

خواجہ صاحب کی ولادت باسعادت اتر پردیش ضلع مراد آباد کے مردم خیز خطے بچھراؤں میں ۳۰/اکتوبر ۱۹۱۷ء میں ہوئی۔ اپنی جائے پیدائش بچھراؤں کا نقشہ خود خواجہ صاحب نے ان الفاظ میں کھینچا ہے:۔

"بچھراؤں ہے تو چھوٹی سی بستی لیکن کچھ دنوں پہلے بڑی پُر رونق تھی۔ سب عزیز، احباب، اہل علم دور نزدیک سے جمع ہو جاتے تھے، وہ چاندنی راتیں، وہ تپتے ہوئے دوپہر، تہہ خانوں

Marfat.com

میں سونا، وہ ظہر وعشاء کے درمیان کی گرمی کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے وہ آم طشتلوں میں بھیگے ہوئے۔ گھر گھر نو روز، دعوتیں، مہمانیاں، آدمی رات سے اٹھ کر شکار کے پروگرام، شعر و شاعری اور مضمون نگاری کے چرچے غرض صبح سے شام تک ایک ہنگامہ سا برپا رہتا تھا"۔

خواجہ صاحب کے والد ماجد کا نام مولوی حسن احمد، دادا کا نام مولوی اسد اللہ اور پردادا کا نام مولوی مظہر اللہ تھا جو مشیر الدولہ، محقق الملک نور اللہ خاں بہادر مناظر جنگ کے صاحبزادے تھے۔

یادش بخیر نومبر یا غالباً دسمبر ۱۹۶۴ کا سال تھا میں مرحوم دہلی کالج میں اردو آنرز کا طالب علم تھا، جاوید وششٹ صاحب صدر شعبہ تھے۔ انہوں نے مجھ کو ایک بند لفافے میں رقعہ اور کوئی کتاب دے کر قرول باغ کے اطراف میں کسی مقام کا پتہ لکھ کر دیا اور کہا کہ اس پتے پر یہ رقعہ اور کتاب پہنچا آیئے اور مکتوب الیہ کو وہ رقعہ اور کتاب دیدی، انہوں نے بڑے تپاک سے مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ یہاں پہلے سے ایک اور بزرگ تشریف فرما تھے۔ ایک پیالی چائے سے تواضع کرنے کے بعد صاحب خانہ نے بہت مشفقانہ لہجے میں ان بزرگ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے کہا کہ صاحبزادے پہلے آپ آٹو رکشا میں ان کے ساتھ دہلی یونیورسٹی میں شعبہ اردو کے صدر جو کیولری لین میں رہتے ہیں، وہاں جایئے اور پھر وہاں سے اپنے گھر یا کالج جہاں جانا ہے چلے جایئے گا۔ میں نے کسی طرح کی معذرت کرنا مناسب نہ سمجھا لیکن اتنا ضرور کہا کہ میں نہ تو یونیورسٹی کے جغرافیے سے کچھ زیادہ واقفیت رکھتا ہوں اور نہ صدر شعبہ سے ذاتی طور پر واقف ہوں۔ انہوں نے کہا کوئی مضائقہ نہیں، اب چونکہ وہاں جا رہے ہیں اس لئے ان سے واقفیت بھی ہو جائے گی قصہ کوتاہ! میں ان بزرگ کے ساتھ کیولری لین جا پہنچا۔

جن بزرگ کے پاس مجھے جاوید وششٹ صاحب نے بھیجا تھا ان کا اسم گرامی دوارکا داس شعلہ تھا جو اردو کے معروف شاعر تھے اور ان شعلہ صاحب نے جس بزرگ کے ساتھ مجھے صدر شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی کے پاس بھیجا تھا وہ اردو تحقیق وتنقید کی عظیم المرتبت شخصیت قاضی عبدالودود صاحب کی تھی۔ انہی قاضی صاحب کے ساتھ میں پہلی مرتبہ پرفیسر خواجہ احمد فاروقی صاحب کے دولت کدے پر حاضر ہوا تھا۔ راستے میں قاضی صاحب نے چونکہ میرے بارے میں مجھ سے دریافت کر لیا تھا اس لئے انہوں نے خواجہ صاحب قبلہ سے میرا تعارف کرا دیا۔ خواجہ صاحب نے میرا نام سننے کے بعد فرمایا کہ "مولانا" آپ بھی تشریف رکھیئے۔ لفظ مولانا کا تخاطب مجھے کچھ عجیب سا لگا۔ قاضی صاحب قبلہ نے بھی زیر لب خفیف سا تبسم فرمایا اور

بس پھر ان دونوں بزرگوں کی گفتگو کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اتنے میں چائے اور دوائے بھی آ گئی ۔خواجہ صاحب نے پھر لفظ مولانا کی تکرار کرتے ہوئے مجھے مخاطب کر کے فرمایا کہ آپ چائے بنانے کی زحمت کیجئے، میں نے تین کپ چائے بنائے اور ایک ایک کپ ان دونوں بزرگوں کو دیا اور ایک خود پینے لگا گفتگو جاری رہی اور میں اٹھنے کا مناسب موقع تلاش کرنے لگا اور جوں ہی دونوں کی گفتگو میں چند لمحوں کا وقفہ آیا میں نے دونوں بزرگوں سے رخصت کی اجازت چاہی اور مال روڈ سے بس لے کر اپنے گھر چلا آیا۔خواجہ صاحب سے میرا غائبانہ تعارف تو اسکول کے زمانے سے تھا ان کا نام جانا پہچانا تھا لیکن دیکھنے اور نیاز حاصل کرنے کا شرف پہلی بار اب حاصل ہوا تھا۔اس ملاقات نے ان کی شخصیت کے ایسے گہرے نقوش میرے ذہن پہ ثبت کئے جو کبھی ماند پڑنے والے نہیں تھے اس کی وجہ یہ تھی کہ میں نے ایک آئڈیل استاد اور اسکالر کی جیسی شخصیت اپنے ذہن کے نہاں خانے میں بسائی ہوئی تھی وہ ہو بہو خواجہ صاحب جیسی تھی اسی لئے میں اس پہلی ملاقات میں ان کا گرویدہ ہو گیا..... وقت تیزی سے گزرتا گیا اور میں نے اردو میں بی اے آنرز کر کے ایم اے کرنے کے لئے دہلی یونیورسٹی کا رخ کیا۔میرے لئے یونیورسٹی کے حسین ماحول سے بھی زیادہ خواجہ صاحب کی شخصیت پرکشش تھی یہاں پہنچے تو خوش بختی کے دروازے ہر چہار طرف سے وا ہو گئے ۔مولانا محمد حسین آزاد نے اپنی شہر آفاق تصنیف ''آب حیات'' میں عہد غالب کا نقشہ کھینچتے ہوئے تحریر کیا تھا کہ اس عہد میں دہلی میں اردو زبان و ادب کے ایسے ایسے آفتاب و ماہتاب موجود تھے جنہوں نے رومتہ الکبریٰ کے عہد کی رونقوں کو تازہ کر دیا تھا.....کچھ یہی نقشہ اس زمانے میں شعبہ اردو کا تھا۔خواجہ صاحب نے شعبے کی عظمت کو چار چاند لگانے کے لئے شعبۂ تحقیق و اشاعت میں قبلہ ضیا احمد بدایونی (والد ماجد پروفیسر ظہیر احمد صدیقی) جناب رشید حسن خاں صاحب اور قبلہ شبیر حسن غوری صاحب جیسے عظیم پائے کے محققین اور اسکالرز کی خدمات حاصل رکھی تھیں، دوسری طرف اساتذہ کرام میں استاد محترم پروفیسر ظہیر احمد صدیقی، پروفیسر گوپی چند نارنگ، پروفیسر محمد حسن، پروفیسر قمر رئیس، پروفیسر صدیق الرحمان قدوائی، ڈاکٹر شریف احمد، جناب مغیث الدین فریدی اور ڈاکٹر شمیم نکہت صاحبہ درس و تدریس سے وابستہ تھے اور مرحوم پروفیسر فضل الحق صاحب، پروفیسر عبدالحق اور ڈاکٹر فرحت فاطمہ یونیورسٹی فیلوشپ پر تھے اور ایم اے کی کلاسز بھی پڑھاتے تھے ..... یونیورسٹی پہنچنے کے بعد ہماری کلاسز کا آغاز تو ہو گیا لیکن میری نگاہیں خواجہ صاحب کی متلاشی رہیں معلوم ہوا کہ وہ Visiting

Marfat.com

پروفیسر کی حیثیت سے روس کے دورے پر گئے ہوئے ہیں اور چند ماہ بعد تشریف لائیں گے۔ انتظار کے لمحے گذرے اور ایک روز معلوم ہوا کہ خواجہ صاحب واپس تشریف لا رہے ہیں اور شعبے کی جانب سے ان کے اعزاز میں ایک استقبالیہ کا اہتمام کیا گیا ہے۔ اس استقبالئے میں شرکت کے لئے دہلی یونیورسٹی کے ان تمام کالجوں سے جہاں اردو کے شعبے قائم ہیں وہاں کے سارے اردو طلباء اور اساتذہ کے علاوہ ایم اے سال اول و دوم کے طلباء، ریسرچ اسکالرز اور تمام اساتذہ کے ساتھ دیگر معززین شہر بھی مدعوئین میں موجود تھے۔ خواجہ صاحب مقررہ وقت پر تشریف لائے ،شعبے کے تمام طلباء کی جانب سے خواجہ صاحب کی خدمت میں سپاس نامہ پیش کیا جانا تھا اور یہ اعزاز حاصل کرنے کا قرعۂ فال میرے نام نکلا تھا، خواجہ صاحب کی خدمت میں، میں نے تمام طلباء کے جذبات کی عکاسی کرتے ہوئے سپاس نامہ پڑھا اور خواجہ سے یہ بھی درخواست کی کہ وہ طلباء کو اپنے دورے کے تاثرات سے بھی مستفیض فرمائیں خواجہ صاحب نے اپنے دورۂ روس کے تاثرات بیان کرتے ہوئے یہ مژدہ بھی سنایا کہ اب جلد ہی دہلی یونیورسٹی شعبۂ اردو کے ڈانڈے، ماسکو، لینن گراد اور تاشقند کی یونیورسٹیوں سے جا ملیں گے۔ اور ہمارے دیکھتے دیکھتے چند ہی ماہ میں ایسا ہو بھی گیا، یہ سب کچھ اتنی کامیابی سے اور اتنے جلدی کیسے ممکن ہو گیا اس کا صحیح اندازہ تو وہی اساتذہ کر سکتے ہیں جنہوں نے خواجہ صاحب کے ساتھ بطور رفقاء کام کیا ہے، میں اس بارے میں صرف اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ وہ علامہ اقبال کے الفاظ میں یقیں محکم، عمل پیہم کی عملی تفسیر و تعبیر تھے، زندگی کے متعلق ان کا نقطۂ نظر ہمیشہ رجائی رہا جس کی بدولت انہیں اپنی ہر کوشش میں جلد یا بدیر صدفی صد کامیابی حاصل ہوئی۔ یوں تو ان کے لئے مخالفتوں کی فصلیں بھی بوئی گئیں، ان کے سامنے مشکلوں اور دشواریوں کے خار زار بھی آئے، مایوسی کے گھٹاٹوپ اندھیرے بھی چھائے اور آزمایشوں کے پہاڑ بھی ملے لیکن یہ سب خواجہ صاحب کے آہنی ارادوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گئے ذہانت و فطانت کے بعد خواجہ صاحب کے کردار کا دوسرا نمایاں وصف یہی جوش و ولولہ اور حوصلہ تھا، وہ اپنے مقصد کے حصول کی تکمیل میں کبھی نہیں تھکتے تھے۔ مایوسی ان کے نزدیک کفر کا درجہ رکھتی تھی اور یہی اوصاف وہ اپنے رفقاء اور طلباء میں دیکھنے کے متمنی رہتے تھے۔ میں جب بھی ان کی عظیم اور ہمہ گیر شخصیت کے بارے میں سوچتا ہوں تو مجھے ایک اتھاہ سمندر اور ایک سر بفلک پہاڑ کا خیال آتا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں اس سمندر کی بے پایاں وسعت اور اس پہاڑ کی بے اندازہ عظمت کے نظارے سے مبہوت ہو جانے والا

Marfat.com

ایک خاموش تماشائی ہوں۔ اگر میں سیلف میڈ کا لفظ استعمال نہ بھی کروں تب بھی اتنا تو یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ خواجہ صاحب نے جسم ناتواں رکھنے کے باوجود بڑی محنت اور جانفشانی کی تھی۔ اور اردو کے تعلق سے ناموافق ماحول کے طوفان میں اپنی اور شعبے کی کشتی چلائی تھی۔ خواجہ صاحب کو میں نے کم وبیش تیس بتیس سال دیکھا ان کو ہمیشہ اردو کا سچا محسن، دوست، خدمت گذار اور غمخوار ہی پایا۔ ان کی یہ غمخواری اور خدمت گذاری لفظی نہ تھی کہ سوگزواروں اور گز بھر نہ پھاڑوں۔

خواجہ صاحب کی ظاہری شخصیت کی عکاسی کچھ ان الفاظ میں کی جاسکتی ہے:۔

ان کے چہرے کے گرد ایک ایسا ہالہ نظر آتا تھا جو تخلیق اور علم کے ساتھ لازم وملزوم ہوتا ہے کھلتا ہوا گندمی رنگ روپ سرو چمن کی طرح اکہرا اور چھریرا بدن فطری عاجزی وانکساری کی غمازی کرتے ہوئے آگے کو جھکے کندھے، ماتھے کے اوپر سے بال اڑ جانے کی وجہ سے پیشانی بہت چوڑی سر کے درمیان سے چھدرے لیکن کنپٹیوں اور گدی پر اسکالرز کی طرح گھنے سرمئی اور سفید ریشم جیسے بال بڑے بڑے کان، چوڑا دہانہ، باریک لب سلیقے سے پروئی ہوئی موتیوں کی لڑی جیسے دانت، ناک قدرے پھیلی ہوئی تھی بڑے نتھنے۔ بھویں کشادہ۔ ماتھے کی شکنیں اور ابرو کے بل پختہ خیالی، تیز فہمی اور اصابت رائے کو عیاں کرتے ہوئے موٹے گلاسز اور موٹے فریم کے چشمے میں جھانکتی عقاب جیسی آنکھیں جو مطالعہ کرتے ہوئے یا غور کرتے وقت ایسی ہو جاتی تھیں جیسے تصویر کے اثرات دیکھتے وقت مصور اپنی آنکھوں کو ادھورا میچ لیتا ہے، گال پچکے ہوئے۔ ٹھوڑی پتلی قد درمیانہ، لبوں پر سدا بہار خفیف تبسم، کلین شیو جو بڑی باقاعدگی سے بلا ناغہ کیا جاتا حتیٰ کہ شدید علالت کے دوران بھی کبھی بدخط ہونا گوارہ نہ کیا چال میں آہستہ روی کے ساتھ خود اعتمادی اور استقامت، چھوٹے چھوٹے قدم رکھتے ہوئے چلتے تھے اور بہت پروقار معلوم ہوتے تھے نگاہ نیچی تقریباً عمودی میں نے انہیں کبھی تیز چلتے نہیں دیکھا، وہ شعبے سے گھر جارہے ہوں یا گھر سے شعبے کی طرف آرہے ہوں انکے چلنے کی رفتار ایک ہی ہوتی تھی اس کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے وقت کے ہاتھوں کٹھ پتلی بن جانے کے بجائے خود وقت کو اپنا حلقہ بگوش بنالیا تھا۔ طبیعت میں حکیمانہ مزاج اور عالمانہ سنجیدگی کا خوشنما امتزاج، نہ بناوٹ، نہ غرور جس طرح تھرمامیٹر کدو کاوش سے تیار ہوتا ہے اسی طرح خواجہ صاحب کے بزرگوں نے علمی صحبتوں میں بٹھا کر رچی بسی جاگیردارانہ تہذیب سے منور، علم مجلسی کے آداب سے واقف ایسی پرکشش شخصیت بنادیا تھا جو دیکھنے اور سننے

سے تعلق رکھتی تھی۔ خواجہ صاحب نے محاورۃً نہیں بلکہ حقیقتاً دنیا دیکھی تھی انہوں نے دنیا کے زائد از دو درجن ممالک کے دورے کر کے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا تھا۔ اور دنیا کے ترقی یافتہ ممالک کی روز افزوں پھلتی پھولتی خوش حالی کو اپنی آنکھوں سے نہ صرف یہ کہ محض تماشائی کی حیثیت سے دیکھا تھا بلکہ اس ترقی کی وجوہات کو اپنے عمیق غور و فکر اور مشاہدے سے ہم آمیز کر کے سائنٹیفک بنیادوں پر اپنے رہن سہن میں ترتیب اور نظم و ضبط بھی پیدا کیا تھا اسی لئے وہ قیلولے کو مغلوں کے زوال کا سبب مانتے تھے۔ خوب سے خوب تر کی جستجو نے انہیں کبھی خواب خرگوش سے دوچار نہیں ہونے دیا وہ بہت مصروف الاوقات شخصیت تھے بیکار بیٹھنا ان کے مہذب میں حرام کے مترادف تھا۔

لباس اور رہن سہن کی لطافت بھی ان کی زندگی کا لازمی جز و تھی اور اس معاملے میں بھی وہ اپنی تحریروں کی مانند سادگی کے ساتھ پرکاری کو بھی لازمی سمجھتے تھے یعنی لباس انہیں ایسا پسند تھا جس سے انسان پرکشش، اسمارٹ اور چاق و چوبند نظر آئے اور یہ لباس وہ ہمیشہ موقعوں اور موسموں کی مناسبت سے زیب تن کرتے تھے۔ گرمیوں میں اعلیٰ کوالٹی کی گبرڈین کی سفید کریم، فاختئی یا ہلکے بسکٹی رنگ کی پتلون ہاف سیلو کی سفید یا کریم کلر کی بوشرٹ اور براؤن سینڈل، موسم سرما میں سرج کے رائل بلیو، لائٹ براؤن، سلیٹی قیمتی اعلیٰ کوالٹی کے سلے ہوئے سوٹ، سفید شرٹ، سوٹ کی مناسبت سے قیمتی ٹائی سلیقے سے ناٹ بندھی ہوئی، عمدہ موزے اور کالے یا براؤن بندار جوتے استعمال کرتے تھے کچھ خاص موقعوں پر جیسے عید، بقرعید یا نماز جمعہ کے دوران ہمیشہ وسٹرڈ کی سرمئی یا سرج کی کالی شیروانی اور گرمی میں ٹیری کاٹ کی بادامی شیروانی پہنتے تھے اور مشرقی تہذیب کی جاذب النظر تمثیل معلوم ہوتے تھے۔ مال روڈ پر جوبلی ہال کے عقب کی پہاڑی پر موجود پٹھان والی مسجد میں وہ پابندی سے نماز جمعہ ادا کرنے آیا کرتے تھے اور نہایت ہی خشوع و خضوع کے ساتھ نماز ادا کر کے ایسے دعاء مانگتے تھے کہ سراپا تصویر عبودیت بن جاتے تھے۔ گھریلو لباس میں وہ موسم گرما میں وائل یا کیمرک کا لکھنوی کرتا اور موسم سرما میں ٹری کاٹ کا سفید کرتا پائجامہ پہنا کرتے تھے اور سردی سے بچنے کے لئے وہ اس لباس کو مغربی لباس کی پرکاری سے ہم آہنگ کر کے کوئی دیدہ زیب رنگ کا سوئٹر اور اسپراونی گاؤن پہنا کرتے تھے۔

رہن سہن کے تعلق سے بھی انہیں ایسا انداز پسند تھا جس سے آرام طلبی، کاہلی اور سستی کی بو نہ آئے چنانچہ وضع داری کی ایک مخصوص آن بان ان کے رہن سہن میں نظر آتی تھی گھر ہو گھر سے

Marfat.com

باہر کی دنیا ہوانہوں نے اپنی نفاست پسندی کو کبھی خیر باد نہیں کیا۔ مزاج کی نفاست میں وہ اپنی نظیر آپ تھے۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ یہ نفاست ان کی تخلیق کا جزو اعظم تھی، لکھتے وقت کاغذ نفیس ہو۔، قلم نفیس ہو، روشنائی نفیس ہو، کتابیں نہایت صاف ستھری اور عمدہ جلد بندھوا کر رکھتے تھے، مکان اور فرنیچر بھی اسی معیار پر پورا اترتے تھے۔ اسی طرح خواجہ صاحب کو نفیس اور لطیف کھانوں کا بھی شوق تھا وہ اپنے یہاں اکثر موقعوں پر نہایت ہی پرتکلف ضیافتوں کا اہتمام کرتے تھے اور ان کھانوں میں نفاست ولطافت کو مقدم رکھنے کے ساتھ ساتھ وہ اس ماحول کی نفاست ولطافت کو بھی ضروری خیال کرتے تھے جس میں کھانا کھایا جاتا ہے۔

اپنے طلباء کی خوش لباسی کو دیکھ کر وہ ایسے خوش ہوتے تھے جیسے کوئی مصور اپنی تخلیق کو دیکھ کر خوش ہوتا ہے، لباس اور رہن سہن کی لطافت ونفاست، نشست وبرخاست کے آداب، گفتگو کے سلیقے اور لب ولہجے کے حسن کو وہ صرف اپنی ذات تک ہی محدود نہیں رکھتے تھے بلکہ اپنے رفقاء اور طلباء میں بھی یہ خوبیاں دیکھنا چاہتے تھے۔ مختصر یہ کہ وہ زندگی کو اس کی تمام تر نفاستوں کے ساتھ برتنے کے قائل تھے اور ان نفاستوں کے حصول کے لئے انہوں نے روپئے پیسے کو کبھی اہمیت نہیں دی۔ انہیں اگر کہیں نزدیک یا دور جانا ہوتا تو وہ بسوں کی دھکا کی اور آٹو رکشا کی بے سنگین گھڑ گھڑ کے بجائے ٹیکسی کی نفیس سواری کو ترجیح دیتے تھے۔ بازار جاتے تھے تو بہترین چیزیں خریدتے تھے۔ خواہ وہ کھانے کی ہوں، پہننے کی ہوں یا روز مرہ کے استعمال کے لئے ہوں، علالت کی صورت میں اعلیٰ سے اعلیٰ ڈاکٹر سے مشورہ کرتے تھے اور ٹرین میں ہمیشہ فرسٹ کلاس میں سفر کرتے تھے۔ اس ضمن میں ایک دلچسپ واقعہ سنانا خالی از علت نہ ہوگا۔

میرٹھ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں خالی آسامی کے لئے انٹرویو تھا، خواجہ صاحب کے علاوہ شعبے سے منسلک ایک اور صاحب کو بھی بطور ماہر مدعو کیا گیا تھا خواجہ صاحب تو گھر پر ٹیکسی منگا کر اس کے ذریعے وقت مقررہ پر پہنچ گئے لیکن وہ صاحب خراماں خراماں حیراں حیراں تقریباً گھنٹے سوا گھنٹے تاخیر سے پہنچے وقت کے زیاں کو کبھی پسند نہ کرنے والی خواجہ صاحب جیسی شخصیت کے لئے یہ تاخیر انتہائی کوفت کا سبب بنی، ان صاحب کے پہنچنے پر اصل انٹرویو سے پہلے خواجہ صاحب نے ان کا انٹرویو لیتے ہوئے اپنے مخصوص اور تیکھے انداز میں کہا کہ جناب آپ سراپا آفت رسیدہ بو لائے ہوئے اتنی تاخیر سے کیوں پہنچے ہیں۔

ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا: اب متاخرہ اور متاثرہ ماہر صاحب نے اپنی تاخیری اور

Marfat.com

عنا گیری کا سبب بتاتے ہوئے فرمایا کہ طوفان سے آرہا ہوں جو ایک گھنٹے لیٹ تھا۔ یہ سننا تھا کہ خواجہ صاحب کی فطری نفاست موعود کر آئی اور برہم ہوتے ہوتے کہا عجیب بے ڈھنگ اور بے ذوق ہیں آپ یہاں ڈیڑھ گھنٹے کا وقت برباد ہو چکا ہے اور آپ کے لئے یہ کوئی معنی نہیں رکھتا بس آپ نے تو ٹکا سا جواب دے دیا کہ طوفان سے آرہا ہوں وہ ایک گھنٹے لیٹ تھا آخر آپ کو اپنے گھر سے ٹیکسی میں سفر اختیار کرنے میں کون سے ایسے اندیشہ ہائے دور دراز لاحق تھے۔ انٹرویو ختم ہوا تو خواجہ صاحب نے شعبے کے ذمے داران سے ٹیکسی والے کو بمع واپسی کا بل ادا کرایا اور ان ماہر صاحب کو اپنے ساتھ ٹیکسی میں بٹھا کر واپس دہلی لے آئے۔

زندگی کی یہ نفاست مرتبے کا یہ رکھ رکھاؤ خواجہ صاحب کی رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے تھا یہی وجہ تھی کہ انہوں نے ملازمت کے دوران نہ تو کوئی خزانہ جمع کیا نہ بنک بیلنس بڑھایا نہ کوئی محل دو محلے تیار کرائے۔ نہ کوئی بنگلہ خریدا اور نہ کوئی کار خریدی، ہاں زندگی کے ایک ایک پل کو جاگیردارانہ مزاج کی تمام لطافتوں اور نفاستوں کے ساتھ ضرور برتا۔

خواجہ صاحب کے ملنے جلنے کے انداز میں بھی تہذیب و شائستگی کی ایک منفرد شان ہوتی تھی۔ دوران گفتگو آواز کا دلکش اتار چڑھاؤ۔ ٹھہرے ٹھہرے لب و لہجے کے ساتھ خوبصورت لفظوں، حسین استعاروں اور تشبیہات کے ساتھ جملوں کی ادائیگی کانوں میں رس گھول دیا کرتی تھی۔ خواجہ صاحب کی تمام گفتگو پہلے تولنے اور پھر بولنے کے مقولے پر پوری اترتی تھی، وہ اپنے طلباء سے بھی ایسے انداز میں گفتگو کرتے تھے جو تہذیب و شائستگی کا نمونہ ہوا کرتی تھی اور کبھی کبھی موضوع اور موقع کی مناسبت سے اپنے طلباء سے کلاس لیکچر کے دوران مزاح کے لطیف عنصر کو بھی اپناتے تھے، مگر مراتب کا فرق ان کی نظروں سے کبھی اوجھل نہ ہوتا تھا۔ ان کی بذلہ سنجی اور شگفتگی میں ایک وقار اور رکھ رکھاؤ ہوتا تھا ایک سنبھلی ہوئی اور لئے دیئے رہنے والی کیفیت ہوتی تھی۔ گذشتہ تیس سال کے طویل عرصہ میں نے انہیں کبھی کسی کو لفظ "تم" سے مخاطب کرتے ہوئے نہیں سنا وہ کبھی کسی طالب علم کی غیر متوازن گفتگو یا لب و لہجے کو سن کر ناگواری کی صورت میں بھی آپے سے باہر نہیں ہوتے تھے اور نہ ہی ان کی زبان سے ایسے الفاظ ادا ہوتے تھے جو مذاق سلیم پر بار ہوں بلکہ ان کے لب و لہجے میں تادیبی خفگی کے ساتھ ساتھ مشفقانہ رنگ بھی ہوتا تھا۔

خواجہ صاحب جاگیردارانہ عہد کی صحت مند اقدار سے کڑھے ہوئے اور رچے ہوئے ایسے فرد تھے جو تہذیب و اخلاق کی جان و جواز ہوا کرتے ہیں۔ ان اداب و اخلاق کو وہ اس لطف اور

Marfat.com

آسانی سے برتا کرتے تھے جیسے ایک تندرست انسان سانس لیتا ہے یا ایک حسین اپنے حسن کا حامل ہوتا ہے بغیر کسی ارادے یا تکلف کے ۔۔۔۔۔۔ان کی بے تکلفی میں بھی دوستانہ اور شریفانہ شان پائی جاتی تھی، وہ اسی حد تک تکلف کرتے تھے جس حد تک شرافت اور سلیقے کا اقتضاء ہوتا تھا اور بے تکلف بھی اسی حد تک ہوتے تھے جس حد تک بے تکلفی حسن معاشرت کا جز واعظم سمجھی جاتی ہے۔اس سلسلے میں ایک مثال پیش کرنا چاہتا ہوں۔

اسی دہلی اردو اکادمی کے پلیٹ فارم سے مولانا ابوالکلام آزاد پر ایک سیمینار کا انعقاد ہوا تھا میں اس وقت بھی اکادمی کا ممبر تھا اور مجھے حکم ہوا تھا کہ ایک پیپر میں بھی پڑھوں میرے پیپر کا عنوان تھا'' میں نے مولانا آزاد کو دیکھا تھا'' یہ پیپر ایسے حضرات کا انٹرویو بیس پیپر تھا جنہوں نے مولانا آزاد کو یا تو بہت قریب سے دیکھا اور برتا تھا یا جنہیں مولانا کے ساتھ کام کرنے یا اٹھنے بیٹھنے کے مواقع میسر ہوئے تھے ۔ ایسے لوگوں سے گفتگو کر کے مجھے ان لوگوں کے تاثرات قلمبند کرنا تھے ۔اس سلسلے میں مجھے تین حضرات سے سب سے زیادہ مدد ملی ان میں سرفہرست تو مولانا کے پرسنل سکریٹری مرزا مسعود بیگ صاحب تھے جو اس وقت تک دہلی میں مقیم تھے دوسرے باقر حسین صاحب تھے جو مشہور فلم پروڈیوسر ڈائریکٹر ناصر حسین صاحب کے برادر خرد تھے اور اس وقت سندر نگر میں رہائش پذیر تھے اور مولانا کے قریبی عزیز تھے۔

اور تیسری شخصیت خواجہ صاحب کی تھی خود خواجہ صاحب کے الفاظ میں مولانا آزاد ان کے مربی تھے، مشفق بھی تھے اور سرپرست بھی تھے۔ بہرحال اس پیپر کے سلسلہ میں خواجہ صاحب کی خدمت میں حاضر تھا اور خواجہ صاحب اپنے دل و دماغ کے نہاں خانوں سے ایک سے ایک سنہری دوپہلی یاد کو کھرچ کھرچ کر نکال رہے تھے اور بہت لطف لے کر تسلسل کے ساتھ ایک کے بعد ایک واقعہ بیان کر رہے تھے۔ میں نے اس خوش گوار موڈ کو دیکھتے ہوئے خواجہ صاحب سے دریافت کیا کہ'' سر۔کیا آپ کو کوئی ایسا واقعہ یاد ہے جب آپ نے مولانا آزاد کو ہنستے یا مسکراتے بھی دیکھا ہو؟ کچھ توقف کے بعد خواجہ صاحب کہنا شروع کیا جی ہاں ایک مرتبہ مولانا محترم بغرض تبدیلی آب وہوا کشمیر تشریف لے گئے تھے مرزا مسعود بیگ صاحب بحیثیت پرسنل سکریٹری مولانا کے ساتھ موجود تھے اور اس خاکسار کو بھی مولانا محترم کے ساتھ قربت کی عزت اور قیام کا شرف حاصل تھا ہمارا جس سرکاری مہمان خانے میں قیام تھا اس کے پائیں باغ میں بہت بڑے بڑے سرو و چنار کے درخت بھی تھے۔ مرزا مسعود بیگ صاحب اور میں قبلہ مولانا کے ساتھ اس پائیں

Marfat.com

باغ میں بیٹھے موسم کی تازگی اور قدرت کے حسن اور چائے کی لطافت سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ اچانک مولانا نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے ازراہ تفنّنِ طبع فرمایا کہ ''اَحمد صاحب''

(جی ہاں خواجہ صاحب نے ہی مجھے یہ بتایا تھا کہ مولانا آزاد خواجہ صاحب کو احمد صاحب کہہ کر مخاطب کرتے تھے اور احمد کے الف پر زبر لگا کر بڑی ح کے صحیح اور عربی مخرج کے ساتھ احمد کہا کرتے تھے) خواجہ صاحب نے واقعے کو جاری رکھتے ہوئے بتایا کہ مولانا نے فرمایا کہ ''احمد صاحب کیا آپ سامنے والے سرو کے درخت پر چڑھ کر اس کی چوٹی سر کر سکتے ہیں'' ''میں نے عرض کیا کہ بالکل سر کر سکتا ہوں بشرطیکہ مرزا مسعود بیگ میری رہنمائی فرمائیں، اس جواب سے مولانا بہت محظوظ ہوئے اور میں نے زندگی میں پہلی بار مولانا کو تبسم فرماتے ہوئے دیکھا''۔

یہ خواجہ صاحب کی عادات واطوار اور سیرت وکردار کا سرسری اجمال ہے جس سے ان کی شخصیت کے چند ظاہری خط وخال نمایاں ہوئے ہیں ان کی عظمت نمایاں نہیں ہوئی ہے۔ ان کی عظمت ہر عظیم شخصیت کی طرح کچھ تو ان کے انفرادی کارہائے علمی میں ہے یا پھر انسانی بوالعجبیوں میں ہے جن کے حیرت انگیز تضاد میں بشریت اپنی عظمتوں کے راز آشکار کیا کرتی ہے، ان کی علمی یادگاریں بہت سی ہیں ان کے زندہ و پائندہ کارنامے بہت سے ہیں جن کا اجمالاً ذکر کرنا ان کی عظمت کی وسعت اور شخصیت کی بلندی کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے۔

بات دراصل یہ ہے کہ خواجہ صاحب ہندوستان کی تاریخ کے اس دور میں پیدا ہوئے تھے جب ملک میں بڑے بڑے تاریخ ساز لوگ پیدا ہو چکے تھے کتنے ہی جید علماء کتنے ہی نامور فنکار، ادیب اور شہرۂ آفاق سیاستدانوں کے نام نامی ان لوگوں کی فہرست میں شامل کئے جا سکتے ہیں۔ خواجہ صاحب نے ان میں سے بیشتر کی آنکھیں دیکھی تھیں، وہ بیسویں صدی کے آغاز کی اس نسل سے تعلق رکھتے تھے جو بزرگوں کے احترام کو دینی اقدار کے مترادف سمجھتی تھی وہ گلاب کے پھول اور عطر حنا کی طرح ہماری تہذیب اور اس کی رنگینی و رعنائی کی کھلی مہکتی علامت تھے، یوں تو وہ بڑے لئے دیئے اور بظاہر خشک نظر آتے تھے مگر محبت اور تہذیب کا رنگ چوکھا کرنے کے لئے نچوڑ کر دیکھئے تو ان کی زندگی کے جوہر، بوئے گل کی طرح چمن چمن پھیلنے اور مہکنے لگتے تھے۔

خواجہ صاحب کی آنکھ موہنی اور زبان میں جادو تھا، شخصیت میں کشش تھی مخالف اگر ان کے قریب آجاتا تھا تو ان کی خندہ پیشانی اور شیریں زبان سے رام ہو جاتا تھا۔ یوں بھی ان کے ساتھ دوران ملازمت ایک طرف مخالفت اور ایک جانب تائید غیبی کا سلسلہ تاحیات جاری رہا۔

Marfat.com

لیکن انہوں نے مخالفت کو کبھی قابل توجہ نہ سمجھا مخالفین ان کے راستے میں کانٹے بچھاتے تھے اور خواجہ صاحب ان کانٹوں کو ہٹانے میں وقت کا زیاں نہ کر کے بچ کر اور راستہ کاٹ کر نکل جاتے تھے انہوں نے مخالفت کے طوفانوں میں اردو زبان اور شعبۂ اردو کی کشتی چلائی تھی، شعبۂ اردو ان کی دنیا تھی، اردو ان کی زندگی تھی اور اس زبان کی ترقی ان کا نصب العین تھا، اس کی تہذیب ان کا مزاج تھا اور اس کا ادب ان کی طبیعت تھی۔ غرض وہ اردو کی سوا کچھ نہیں تھے۔ اردو کو ان کی شخصیت سے یا ان کی شخصیت کو اردو سے الگ کر لیا جائے تو دونوں کے وجود کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔ کبھی کبھی میرے دل میں خیال آتا ہے کہ ایسے نامساعد حالات میں اگر خواجہ صاحب جیسی شخصیت کا وجود نہ ہوتا اور اردو سے انہیں یہ والہانہ وابستگی نہ ہوتی تو کیا واقعی آج دہلی یونیورسٹی کے شعبہ اردو کو یہ مرتبہ اور یہ عظمت حاصل ہوتی جو آج ہندوستان بھر میں پھیلی ہوئی یونیورسٹیوں کے درجنوں اردو کے شعبوں کے لئے نہ صرف یہ کہ باعث رشک ہے بلکہ قابل تقلید بھی ہے۔ انہوں نے نہ صرف یہ کہ ملک گیر سطح پر شعبے کی اہمیت کا احساس کرایا بلکہ اردو کے منت پذیر شانہ گیسوؤں کو سنوارنے کی ایک فضا بھی ہموار کی، انہوں نے اردو کے لئے اور شعبے کے لئے جو کچھ کیا ہے اس کی تفصیل بتانے کے لئے ایک دفتر درکار ہوگا۔ ایک زمانہ وہ بھی تھا جب مغرب زدگی سے مغلوب لوگ اردو زبان و ادب کے تعلق سے احساس کمتری کا شکار تھے اور اس کے مطالعے کو کسر شان سمجھتے تھے۔ خواجہ صاحب نے ایسی گھٹا ٹوپ تاریکی میں شوق اور ولولوں کی نئی شمعیں فروزاں کیں۔

کچھ لوگوں کی رائے تھی کہ خواجہ صاحب کی شخصیت بھی ایک نوع کی سیاسی شخصیت تھی جو اردو زبان کی سیاست کے حوالے سے تھی اور وہ اس کے ماہر تھے۔ یہ رائے کچھ ایسی غلط بھی نہیں تھی کیونکہ جیسے حالات میں انہوں نے اردو کا پرچم بلند کیا تھا انہیں اس سیاست کا پیدا کرنا ضروری تھا کیونکہ اردو کی ترقی و ترویج کے لئے اور اس کے وجود اور اہمیت کا احساس پیدا کرنے کے لئے سیاست ناگزیر تھی۔ جن لوگوں نے اس زمانے میں خواجہ صاحب کے ساتھ کام کیا ہے وہ اس بات کی گواہی دے سکتے ہیں کہ وسائل کے فقدان اپنوں کی تساہلی اور لاپرواہی، غیروں کی شماتت اور حکومت وقت کی سرد مہری جیسے ناگفتہ بہ حالات میں شعبے کو اس پیمانے پر وسعت دینا ہر ایک کے بس کا روگ نہ تھا یہ وہی مجذوب اور دیوانہ کر سکتا تھا جو بکار خویش کے ساتھ ساتھ بکار خیر ہشیار است کی صلاحیتیں بھی رکھتا ہو، اور جو خدا پر، انسان پر اور انسانیت پر بھروسہ رکھنے کے علاوہ

Marfat.com

خود اعتمادی کی صفت سے بھی متصف ہو، کیونکہ ایسے بددلی کے ماحول میں شعبے کی جوئے شیر لانے کے لئے اپنے آپ کو پوری طرح کھپانے اور پتہ مار کے کام کرنے کی ضرورت تھی۔

میرے لئے یہ اعزاز بھی تھا اور سعادت بھی کہ خواجہ صاحب مجھ ناچیز سے ازحد انس رکھتے تھے ایک تعلق قلبی رکھتے تھے، جیسے کوئی باپ اپنی اولاد سے لاڈ اور دلار میں اس کے اصل نام کے بجائے کسی اور نام سے مخاطب کرتا ہے۔ ایسے ہی خواجہ صاحب مجھے ہمیشہ مولانا سلمہٗ یا میاں مولانا کہہ کر مخاطب کیا کرتے تھے۔ میں اکثر سوچتا تھا کہ آخر کیا وجہ ہے؟ کہ خواجہ صاحب میرے اصل نام کے بجائے مجھ سے یوں مخاطب ہوتے ہیں، خاکم بدہن اپنی کم عقلی کی وجہ سے ایک آدھ مرتبہ یہ خیال بھی پیدا ہوا کہ اس انداز تخاطب میں میرے لاڈ کے بجائے کہیں مولانا صلاح الدین احمد مرحوم کی تنقیص تو نہیں ہوتی ؟ یہ بیہودہ سوال خواجہ صاحب سے کرنے کا حوصلہ تو اچھوں اچھوں کو نہیں ہوسکتا تھا پھر میں کیا پدی اور کیا پدی کا شوربہ! البتہ اپنے دل سے جب بھی میں نے یہ سوال کیا تو ہمیشہ یہی جواب ملا کہ خواجہ صاحب جیسا نستعلیق، بزرگوں کے احترام میں پلکیں بچھا دینے والا مہذب انسان اور پھر مولانا صلاح الدین احمد مرحوم کی تنقیص!۔ توبہ توبہ استغفر اللہ۔ یہ تو فقط خواجہ صاحب کا دُلار بھرا اندازِ تخاطب تھا جو وہ مجھ سے کم مایہ لیکن خوش قسمت شاگرد کے لئے ازراہ شفقت روا رکھتے تھے۔ خواجہ صاحب کی اس شفقت خاص کے مظاہرے میں نے تیس سال کے تعلق خاطر کے دورانیے میں نہ جانے کتنی بار دیکھے تھے زہے نصیب۔

ایں سعادت بزور بازو نیست
تانہ بخشد خدائے بخشندہ

اس ضمن میں ایک مثال بھی دینے کی جراءت کر رہا ہوں ۱۹۶۹ء میں جب پی، ایچ، ڈی کے مقالے کے واسطے میرے لئے موضوع کے انتخاب کا مرحلہ آیا تو میں نے اپنے بزرگ اور کرم فرما، لائق صد احترام جناب رشید حسن خاں صاحب سے رجوع کیا اور ان کی رہنمائی چاہی۔ انہوں نے ازراہ صلاح الدین نوازی تحقیق کے سلسلے میں کچھ اہم اور مفید مشورے دیکر کہا کہ "آپ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کی حیات اور ادبی خدمات کے عنوان کو اپنے تحقیق مقالے کا موضوع بنا لیجئے کیونکہ اس پر برصغیر ہندو پاک میں ابھی تک پی ایچ ڈی کے لئے تحقیقی مقالے نہیں لکھا گیا ہے۔ شیفتہ کا مرتبہ اردو ادب کے ذریں عہد یعنی دور متوسطین میں مستند و معتبر رہا ہے اور

Marfat.com

آج بھی ہے... یہ موضوع میرے جی کو بہت خوب لگا اور میں نے مصمم ارادہ کرلیا کہ میں اب شیفتہ پر ہی کام کروں گا، لیکن مجھے اس سارے واقعہ اور فیصلے کے بارے میں خواجہ صاحب کو بتانے کی ہمت نہ ہوسکی۔ اوران کے روبہ رو میری قوت گویائی جواب دے گئی۔

تین دہائیوں سے زیادہ عرصہ گذر چکا ہے مگر مجھے آج تک یاد ہے کہ خواجہ صاحب نے تقریباً بیس موضوعات خود اپنے ہاتھ سے تحریر کر کے مجھے عنایت فرمائے اور کسی ایک من پسند موضوع کا انتخاب کرنے کا اختیار دے کر مجھے آخری فیصلہ کرنے کے لئے ایک ہفتے کا وقت بھی دیدیا لیکن میں فلک جنبد، زمیں جنبد گل محمد کے مصداق اسی موضوع پر اٹل رہا جو جناب رشید حسن خاں صاحب کے مشورے سے میں منتخب کر چکا تھا قصہ مختصر یہ ہے کہ جب میں اپنا من پسند موضوع بتانے کے لئے ایک ہفتے کے بعد خواجہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا تو خواجہ صاحب نے میرے فیصلے کے تعلق سے استفسار کیا؟ میں کچھ اپنے میں ہمت نہ پا کر گردن جھکائے چپ چاپ بیٹھا رہا، میری چپ دیکھ کر خواجہ صاحب نے قدر برہمی کے انداز میں فرمایا کہ ''میاں مولانا آپ بھی عجیب شخص ہیں چپ کا تالا منہ میں ڈالے بیٹھے ہیں، اتنے موضوعات میں نے آپ کو دیئے تھے۔ اب آپ کس موضوع پر کام کرنا چاہتے ہیں یہ بتانے میں آپ کو کیا تکلف درپیش ہے'' میں نے اپنی ساری ہمت مجتمع کرتے ہوئے کہا کہ... سر میں نواب شیفتہ پر کام کرنا چاہتا ہوں میرا غیر متوقع جواب سنکر خواجہ صاحب کچھ چونک سے پڑے اور مجھ سے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر فرمایا کہ بہت خوب!! کیا آپ جناب یہ بتانے کی زحمت بھی گوارہ کریں گے کہ یہ مولانا شیفتہ صاحب تھے کون؟ اوران کی اردو ادب میں کیا اہمیت ہے؟ ذرا مجھے بھی کچھ بتایئے تا کہ میری حقیر معلومات میں اضافہ ہوسکے! اب ایک تو خواجہ صاحب کی شخصیت کا رعب پھران کا مخصوص استفساریہ تخاطب اس پر طرہ یہ ہوا کہ خواجہ صاحب نے شیفتہ کے تخلص سے قبل بھی 'مولانا' کا لاحقہ لگا دیا۔ میں قطعی طور پر سٹ پٹا گیا اور دل ہی دل میں خیال کیا کہ'' لے بھائی مولانا سلمہٗ ایسے وقت کے لئے ہی غالب سلمہ نے کہا تھا کہ ہوچکیں غالب بلائیں سب تمام... ایک تو تو خود مولانا سلمہٗ اوراب جس بھلے مانس کو اپنے تحقیق مقالے کا موضوع بنانا چاہتا ہے وہ بھی مولانا سلمہٗ نکلے... ابھی میرا ذہن ان مولانا سلمہا کی شش وپنج میں ہی الجھا ہوا تھا کہ خواجہ صاحب نے بڑے تیکھے لب و لہجے میں پھر فرمایا کہ میاں مولانا ہمیں بھی کچھ اپنی قیمتی خیالات سے مستفیض فرمایئے۔؟

Marfat.com

میں نے دل ہی دل میں جلالِ جلال تو کہا اور بسم اللہ پڑھکر شیفتہ کے تعلق سے جناب رشید حسن خاں کے چبائے ہوئے نوالوں کو اپنے طریقے سے چبانا شروع کر دیا۔ خواجہ صاحب جیسے جہاندیدہ تجربے کار استاد نے میری سٹ پٹاہٹ کو بھانپ کر ایک ذرا دیر تو اس سے ضرور حظ اٹھایا مگر جلد ہی سنبھالا دینے کے انداز میں کہا... جی مولانا موضوع تو بہت خوب ہے مگر یہ آپ کو بجھایا کس نے؟ میں نے مزید ہزیمت سے بچنے کی غرض سے اسی میں خیر جانی کہ اب سب کچھ صاف صاف بتا دینے ہی میں بہتری ہے۔ ورنہ کہیں مولانا غالب سلمہٗ کے دوسرے مصرعے کی مرگ ناگہانی اور ہے والی پیش گوئی بھی صحیح ثابت نہ ہو جائے! لہٰذا میں نے خواجہ صاحب کو سچ کہوں گا اور سچ کے سوا کچھ نہ کہوں گا کے انداز میں ''الف'' سے لے کر ''ے'' تک ساری رام کہانی سنا دی۔ خواجہ صاحب نے سب کچھ سننے کے بعد نہ صرف یہ کہ اس موضوع کو میرے تحقیقی مقالے کا موضوع منتخب فرما دیا بلکہ اس پر اپنی پسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے مجھے تاکید کی کہ میں اس موضوع پر مزید رہنمائی کے لئے وقتاً فوقتاً رشید حسن صاحب سے ملتا رہوں اس کے بعد فرمایا کہ موضوع تو آپ کی پسند کا ہو گیا اب آپ کس کی نگرانی میں یہ کام کرنا پسند کریں گے وہ بھی ارشاد فرما دیجئے اس سے پیشتر کہ میں کچھ بولوں خود ہی فرمایا کہ اس موضوع پر کام کرنے کے لئے تو آپ کے پسندیدہ استاد ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی صاحب سے بہتر نگراں کوئی اور دوسرا نہیں ہو سکتا کیونکہ انہوں نے مومنؔ پر بہت عمدہ کام کیا ہے اور شیفتہ نہ صرف یہ کہ مومن خاں کے عزیز ترین دوست تھے بلکہ ان کے عزیز ترین شاگرد بھی تھے اور مونس و غمخوار بھی تھے۔ اس کے بعد خواجہ صاحب تقریباً ڈیڑھ گھنٹے تک شیفتہ پر اتنا کچھ بتاتے رہے کہ میرے مقالے کا بنیادی مواد صرف اسی لیکچر سے دستیاب ہو گیا۔ بہت سی مثالوں میں سے یہ صرف ایک مثال ہے اس تعلق خاطر کی جو استاد محترم اور میرے مخدوم پروفیسر خواجہ احمد فاروقی صاحب کو مجھ سے تھا میں اس کے لئے ایک بار پھر زہے نصیب کے الفاظ ہی استعمال کر سکتا ہوں۔

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میرؔ سے صحبت نہیں رہی

خواجہ صاحب کی باقاعدہ تدریسی زندگی کا آغاز ۱۹۴۶ء میں مرحوم دہلی کالج سے ہوا یہاں اسوقت بابائے اردو مولوی عبدالحق صدر شعبہ اور ڈاکٹر عبادت بریلوی ان کے جونیر تھے لیکن بابائے اردو مولوی عبدالحق کو پاکستان ہجرت کرنے سے پیشتر ہی اپنی دور اندیشی کے سبب خواجہ

Marfat.com

صاحب کی صلاحیتوں کا القا ہو گیا تھا اور انہوں نے اپنے عہد میں ہی خواجہ صاحب کو دہلی کالج کے شعبۂ اردو سے وابستہ کر لیا تھا۔ خواجہ صاحب نے اسی دہلی کالج سے ترقی کی جست لگا کر دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں قدم رکھا اور اپنے خوب سے خوب تر کے سارے سفر طے کرتے ہوئے اسی یونیورسٹی سے ۱۹۸۲ء میں سبکدوش ہو گئے۔

اسی دہلی یونیورسٹی سے نکل کر خواجہ صاحب کی شہرت برصغیر ہندو پاک کی سرحدوں کو پار کر کے تمام عالم کی اردو دنیا میں آفتاب و ماہتاب بن کر چار دانگ پھیل گئی۔ یہیں سے خواجہ صاحب نے اپنے خوابوں کو حقیقت کا رنگ دینا شروع کیا۔ ان کے بیشتر خوابوں کا منشا یہ رہا کہ اردو زبان کس طریق دنیا کی عظیم زبانوں میں ایک امتیازی حیثیت حاصل کر سکے اور اسی زبان کے حوالے سے شعبۂ اردو ملک بھر کے اردو شعبوں کے لئے مینارۂ نور کا کام دے سکے۔ انہوں نے نرم دم گفتگو گرم دم جستجو کے مقولے پر عمل کرتے ہوئے اپنی ساری زندگی اسی نیک مقصد کے حصول کے لئے وقف کر دی، وہ سراپا وقف الاردو تھے انہوں نے اس حوالے سے بہت سے حسین خواب دیکھے تھے۔ ان میں کچھ پورے ہوئے اور کچھ نہیں ہوئے انہی باقیماندہ حسین خوابوں میں سے ایک خواب اردو یونیورسٹی کا تھا جسکو حقیقت کا رنگ اختیار کرنے میں کچھ ہی وقت کی دیر اور باقی ہے بقول فیضؔ: اک ذرا صبر کہ فریاد کے دن تھوڑے ہیں۔ یہ اردو یونیورسٹی دہلی میں نہ سہی ملک کی کسی اور ریاست میں سہی انشاء اللہ ضرور بالضرور وجود میں آ کر رہے گی کیونکہ اس خواب کو دیکھنے والا اپنے مقصد کی لگن میں پاک طینت بھی تھا اور پاکباز بھی۔ خواجہ صاحب صرف نام کے حوالے سے ہی نہیں اردو کے حوالے سے بھی خواجہ اردو تھے۔ خواجہ صاحب نے سب سے پہلے اس وقت اردو یونیورسٹی کی بات کہی تھی جب اردو دنیا سے وابستہ بہت سے لوگوں نے اسے دیوانے کی بڑ یا دیوانے کے خواب سے تعبیر کیا تھا۔ اس طرح کی رائے رکھنے والے یہ بھول گئے تھے کہ یہ خواب مروجہ مفہوم کے دیوانے نے نہیں بلکہ اردو کے سچے عاشق اور دیوانے نے دیکھا تھا۔ خواجہ صاحب کی زندگی مکمل صحت کے ساتھ چند سال اور وفا کرتی تو یہ اردو یونیورسٹی بھی جواہر لال نہرو یونیورسٹی کی طرح دہلی میں قائم ہوتی اور خواجہ صاحب کی سربراہی میں ہی قائم ہوتی یہ بات حقیقت پر مبنی نہیں بلکہ بیانی پر مبنی ہے۔ اور میری اس بات کی تائید صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جنہیں خواجہ صاحب کے ساتھ یا تو کام کرنے کا موقع ملا ہے یا جنہوں نے ان کے ساتھ کام کرنے کے انداز کا عمیق مشاہدہ کیا ہے۔ شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی سے آج تک کتنے طلباء نے

Marfat.com

ایم۔اے، ایم فل کیا اور کتنوں نے ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں حاصل کیں اس کی تفصیل میں نہ جا کر خواجہ صاحب کی دور اندیشی اور شعبے کی کارگذاری کے تعلق سے اجمالاً اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ غیر ملکی طلباء اور غیر اردو داں طبقے کو اردو پڑھانے اور سکھانے کے لئے شعبے نے اردو سرٹیفکٹ، ڈپلومہ اور ایڈوانس ڈپلومہ کورسز کا جب سے آغاز کیا ہے تب سے اب تک میرے اندازے کے مطابق ایسے طلباء کی تعداد سینکڑوں میں نہ ہو کر ہزاروں میں ہوگی اور وہ بھی پانچ دس ہزار نہیں بلکہ یہ تعداد کسی طور پچیس یا تیس ہزار سے کم نہ ہوگی، ایک دہائی سے کچھ زیادہ عرصے تک مجھے بھی اس کار نیک کو انجام دینے کا شرف حاصل رہا ہے اسی واسطے سے میں نے اتنے اعتماد سے اپنا اندازہ بیان کرنے کی جسارت کی ہے دہلی یونیورسٹی میں یوں تو جدید ہندوستانی زبانوں میں سے بیشتر زبانوں کو پڑھنے اور سیکھنے کی سہولت حاصل ہے لیکن میں انتہائی ذمے داری سے عرض کر رہا ہوں کہ جتنے طلباء ان تمام زبانوں کو سیکھنے کے لئے داخلہ لیتے ہیں ان سب کی تعداد کو ملا کر ایک طرف جوڑ لیا جائے تب بھی یہ تعداد اردو میں داخلہ لینے والے طلبا سے کم ہی رہتی ہے اس کامیابی میں اردو زبان کی شیرینی اور عظمت کے ساتھ ساتھ خواجہ صاحب کی اردو آگہی کا بھی بڑا دخل ہے اس عظیم الشان کارنامے کے علاوہ نظام خطبات کا آغاز غالب صدی کی اسکیمیں اور ان کے حوالے سے غالبیات پر تحقیق و ترتیب کا کام اور نایاب اردو کتب اور مخطوطوں کی سائنٹیفک بنیادوں پر اشاعت ان کارہائے نمایاں میں سے چند معدودے ہیں جو خواجہ صاحب کے خلاق ذہن کی پیداوار تھے اور جنہیں خواجہ صاحب نے اپنے عہد صدارت میں بڑی کامیابی سے سرانجام دیا تھا۔

عہدے کی حیثیت اور حاکمانہ غیرت و آبرو کے بل پر دوسروں کے دلوں میں جبراً اپنی عظمت کی دھاک بٹھانا اور چیز ہے لیکن ایسی شخصیت کوئی شخصیت میں شخصیت نہیں ہوتی اور ایسی عزت کوئی عزت میں عزت نہیں ہوتی، خواجہ صاحب کی شخصیت کی عظمت و عزت کا راز انکی ٹھوس علمیت، بلند کرداری، جہد مسلسل، نظم و ضبط مقصد کی لگن دوررسی اور شائستگی گفتار میں مضمر تھا، یہی وہ چیز ہے جس کو شخصیت کا کرشمہ کہا جاتا ہے اور یہی وہ جادو تھا جو سر چڑھ کر بولتا ہو یا نہ بولتا ہو مگر دل میں بیٹھ کر ضرور بولتا تھا اردو زبان کی شائستگی کے جوہر ادراک نے ان کی گفتگو اور انداز بیان میں ایک خاص طلسم تسخیر پیدا کر دیا تھا۔

خواجہ صاحب کا مقام و مرتبہ استاذ الاساتذہ کا تھا، شعبۂ اردو سے فارغ التحصیل ہونے

Marfat.com

والے خواجہ صاحب کے شاگردوں میں ایک سے بڑھ کر ایک صاحب مرتبہ اور قابل ذکر نام ہے انمیں جاوید وشسٹ صاحب سے لے کر پروفیسر گوپی چند نارنگ تک ڈاکٹر خلیق انجم، ڈاکٹر اسلم پرویز اور سیّد ضمیر حسن دہلوی سے لے کر فیاض رفعت خاں، ابوالحسنات اور پروفیسر رضیہ سلطانہ اور ثریا ہاشمی تک نہ جانے کتنے نام ہیں جو برصغیر ہندو پاک کے علاوہ امریکہ، کنیڈا، انگلینڈ، جرمنی، ہالینڈ، یورپ کے دیگر ممالک، روس آسٹریلیا، براعظم افریقہ اور مشرق وسطیٰ کے بہت سے ممالک میں جلیل القدر عہدوں پر ممتاز ہیں۔ کسے کسے گنوایا جائے اور کسے کسے بتایا جائے، اس بارۂ خاص میں صرف اتنا ہی کہنے پر اکتفا کروں گا جس طرح مفتی صدرالدین آزردہ صدر الصدر دہلی کے متعلق یہ کہاوت مشہور ہے کہ ان کا ایک شاگرد بھی ایسا نہیں تھا جو کسی اعلیٰ منصب پر نہ پہنچا ہو یا جس نے دنیاوی وجاہت نہ حاصل کی ہو! بعینہٖ یہ بات خواجہ صاحب کے تعلق سے بھی کہی جاسکتی ہے۔ ان کی شخصیت کی چھوت، جب جب اور جس جس پر بھی پڑی زروں کو آفتاب بنا گئی، ذرا سی مس ہوئی تو مٹی کو سونا کر گئی۔ ان کا حلقۂ احباب بھی حیرت انگیز طور پر وسیع تھا سیاست وادب کے مشاہیر اس حلقے میں شامل تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد، پنڈت جواہر لال نہرو، ڈاکٹر ذاکر حسین، شریمتی اندرا گاندھی، بابائے اردو مولوی عبدالحق، علی عباس حسینی، مولانا احمد سعید، غلام رسول مہر۔ غلام السیدین، قاضی عبدالودود، پروفیسر رشید احمد صدیقی، پروفیسر ضیا احمد بدایونی، ڈاکٹر سید عابد حسین، علامہ دتاتریہ کیفی، مولانا عبدالماجد دریا آبادی، علامہ اخلاق دہلوی، مرزا محمود بیگ نورالدین بیرسٹر، اشرف صبوحی، مجنوں گورکھپوری، اصغر گونڈوی، ڈاکٹر دیش مکھ، مولانا حامد حسن قادری، ڈاکٹر شوکت سبزواری، ڈاکٹر عبادت بریلوی، ڈاکٹر عندلیب شادانی، مرزا ادیب، پروفیسر مسعود حسن رضوی، ڈاکٹر اعجاز حسن، پروفیسر محمد مجیب، ابواللیث صدیقی، مولانا امتیاز علی خاں عرشی، جگل کشور کھنہ، کرشن چندر، پروفیسر سروپ سنگھ، عرش ملسیانی، پروفیسر احتشام حسین، پروفیسر نورالحسن ہاشمی، پروفیسر گیان چند جین، ساحر لدھیانوی، بہزاد لکھنوی، پروفیسر یوسف حسین خاں، پروفیسر آل احمد سرور، پروفیسر مسعود حسن خاں اور جانے کتنے حضرات اور ہوں گے جن کے اس مختصر سے وقت میں نام بتانا مشکل ہیں:

کس کس کے نام لیجئے، کیا کیا گنائیے

ان مشاہیر سے خواجہ صاحب کی خط وکتابت بھی ہوتی رہی ہوگی اگر ایسے تمام خطوط کو یکجا کر کے شعبۂ اردو یا اردو اکادمی شائع کر دے تو یہ اپنے آپ میں ایک یادگار اور گراں قدر کام ہوگا۔

Marfat.com

علمی مشاغل میں خواجہ صاحب کو سب سے بات زیادہ پڑھنا، اس سے کم لکھنا اور اس سے کم پڑھانا مرغوب تھا۔ ویسے تو وہ اپنی کلاس پابندی سے پڑھاتے تھے لیکن اکثر ایسا ہوتا تھا کہ بات نصاب کے محدود اور لگے بندھے دائرے سے نکل کر اردو زبان کے ماضی حال اور خوش آئند مستقبل سے ہوتی ہوئی، انگریزی ادب، تاریخ، سماجیات اور اخلاقیات کے وسیع تر دائروں میں گھوما کرتی تھی... بطور شاگرد میری ذاتی رائے یہ ہے کہ خواجہ صاحب نصاب پڑھانے کے معاملے میں آورد کے بجائے آمد کے قائل تھے۔ اور جب جب انہیں یہ آمد ہوتی تھی تب تب متعلقہ موضوع کے ایسے ایسے باب روشن ہوتے تھے، الفاظ و معنی کے ایسے ایسے قوس وقزح کھلتے تھے، نکتہ سنجیوں کے ایسے ایسے گوہر آب دار ہاتھ لگتے تھے کہ پوری فضاء علمیت سے معمور ہو جاتی تھی، زبان و بیان کی خوشبوئیں مہکنے لگتی تھیں اور لطف وشوق کا یہ عالم ہوتا تھا کہ ایک دو پیرڈس نہیں دو دو تین تین گھنٹے گذر جاتے تھے اور یہ پتہ نہ چلتا تھا کہ وقت کب شروع ہو کر کب گذر گیا... ایک دن کی آمد ایک ہفتے کی آورد پر بھاری پڑتی تھی۔

جو بیٹھو با ادب ہو کر، تو اٹھو باخبر ہو کر

خواجہ صاحب نے اپنی صدارت کے دورانیے میں کلاسز پڑھانے کے تعلق سے جو ڈسپلین قائم کیا تھا وہ اب عنقا ہو چکا ہے۔ ایک بار وہ شعبے کے کسی استاد پر صرف اس لئے خفا ہو گئے تھے کہ انہوں نے محض کلاس روم کی صفائی نہ ہو سکنے کی وجہ سے کلاس چھوڑ دی تھی خواجہ صاحب کو علم ہوا تو ان سے کہا عزیزم یہ شعبہ اتنی آسانی سے وجود میں نہیں آیا جتنی آسانی سے آپ نے کلاس چھوڑ دی ہے۔ اس کی آبیاری میں، میں نے اپنا خون جگر صرف کیا ہے آپ نے مجھے حکم دیا ہوتا تو میں آ کر خود صفائی کر دیتا تا کہ کلاس ناغہ نہ ہوتی ان کے عہد صدارت میں شعبے میں جو ڈسپلین، جو گہما گہمی دکھائی دیتی تھی وہ اب قصۂ پارینہ بن چکی ہے۔

جہاں اب خارزاریں ہو گئی ہیں
وہاں پہلے بہاریں ہو گئیں ہیں

شعبے کی ان رونقوں اور رفعتوں کے بارے میں آج کا اردو ایم اے کا طالب علم کیا آج سے بیس سال پہلے تک کا کوئی طالب علم بھی ان رفعتوں کا تصور نہیں کر سکتا کیونکہ:

وہ دھوپ تھی کہ ساتھ گئی آفتاب کے

اپنی زندگی کی طرح خواجہ صاحب نے اپنی تحریروں کو بھی کبھی بے مقصد نہیں ہونے دیا ان کی

Marfat.com

تحریریں ایسا آبگینہ ہیں جس کے ذریعے ہر چیز اپنے اصل روپ میں نظر آتی ہے۔ وہ اپنی تحریروں سے جو اثرات مرتب کرتے تھے وہ موضوع اور اسلوب کی ہم آمیزی سے دوآتشہ ہو جاتا تھا۔ کسی مغربی مفکر اور مصنف کا کہیں ایک قول پڑھا تھا، اس نے لکھا تھا کہ بات کہنے کے لئے دراصل ایک ہی لفظ ہوتا ہے، صفت کو ظاہر کرنے کے لئے، ایک ہی اسم اور فعل کو ظاہر کرنے کے لئے بس ایک ہی فعل'' خواجہ صاحب کی تحریروں میں بھی یہ خوبی پائی جاتی ہے کہ وہ ایک اچھے طبیب کی طرح ایک ایک لفظ کے نباض تھے اور یہ خوبی صرف ان کی اردو تحریروں کا ہی نہیں انگریزی تحریروں کا بھی خاصہ تھی، شعبہ جاتی کاروائی کے سلسلے میں ڈرافٹ کئے گئے لیٹرز آج بھی شعبۂ اردو کی دفتری فائلوں کے ریکارڈز کی شکل میں موجود اس حقیقت کی عکاسی کرنے کا منہ بولتا ثبوت ہیں ۔ خواجہ صاحب اپنی تحریروں میں چاہے اردو کی ہوں یا انگریزی کی آتش لکھنوی کے لفظوں میں مرصع سازی کے قائل تھے۔ جو لفظ جہاں سجتا اور پھبتا ہے وہیں استعمال ہوتا ہے۔ یہی حال گفتگو کا بھی ہوتا تھا انکی تحریریں علامہ اقبال کے اس مصرعے پر کہ ع:۔ معجزۂ فن کی ہے خون جگر سے نمود، تولہ، ماشہ رتی پوری اترتی ہیں ۔ ان کا مزاج جس جمالیاتی خمیر سے تیار ہوا تھا اس کے زیر اثر وہ اپنی تحریروں میں باطنی اور معنوی حسن کے ساتھ ساتھ ظاہری اور لفظی حسن کا بھی بڑا خیال رکھتے تھے ۔ ان کا مخصوص مزاج اس ضمن میں کسی بھی لمحے جلد بازی یا کلام چلاؤ تحریر کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔

اردو اور فارسی کے کلاسیکل سرمائے پر ان کی نظر بڑی عمیق تھی ۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے انگریزی ادب کے شاہکاروں کا نہ صرف یہ کہ بغائیر مطالعہ کیا تھا بلکہ ان سے اثر بھی قبول کیا تھا ۔ وہ ادب میں تجربات کے بھی قائل تھے مگر ان کا سفید پوش ذوق ذرا سی گرد کو ذرا دیر بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اسالیب فن میں رچاؤ، زبان میں پختگی اور ہمواری کے متلاشی رہتے تھے اور ادب کو سدا ایک اخلاقی تصور مانتے تھے ۔ اور اپنی تحریروں میں اور گفتگو میں بے محابا تجلی کے بجائے حجاب اور جلوے کے بجائے نقاب کے زیادہ قائل تھے۔ رشید احمد صدیقی کی طرح وہ بھی غزل کو اردو شاعری کی آبرو سمجھتے تھے اور شیفتہ کی طرح میر تقی میر کو خدائے سخن مانتے تھے۔ میر تقی میر کے بعد خواجہ میر درد پھر غالب اور پھر مومن انہیں بہت عزیز تھے۔ ضیا احمد بدایونی کے الفاظ میں وہ مومن کے فکر شاعرانہ کے بھی معترف تھے۔ نثر میں ان کا مزاج مکتوب نگاری، سوانح نگاری اور تنقید نگاری کی طرف زیادہ مائل تھا۔ ان کی طبیعت، افسانہ، ناول اور ڈرامہ نگاری سے

Marfat.com

زیادہ میل نہیں کھاتی تھی ، البتہ رپورتاژ نگاری کو وہ پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے اور داستان نگاری کو اردو نثر کی ترویج وترقی کا سبب سمجھتے تھے۔ میری ناقص رائے میں خواجہ صاحب کا اسلوب شعوری یا لاشعوری طور پر مولانا حالی، مولانا آزاد، مولوی عبدالحق اور حامد حسن قادری کے اسالیب بیان کی چاشنیوں کی آمیزش کا مرکب تھا۔ اور ان حضرات کا انہوں نے بل بالواسطہ یا بلاواسطہ اثر قبول کیا تھا، شاید یہی وجہ ہے کہ ان کی تمام تحریروں میں حالی کی عقیدت مولانا ابوالکلام آزاد کی حسن کاری اور رنگین بیانی، بابائے اردو مولوی عبدالحق کا نظم وضبط اور حامد حسن قادری کی سادگی بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔

خواجہ صاحب جتنی خوبصورت اردو بولتے تھے اتنی ہی دلکش انگریزی اور فارسی بھی بولتے تھے مجھے حسن اتفاق سے انہیں انگریزی اور فارسی بولتے ہوئے سننے کا اتفاق بھی ہوا تھا ان کا طریقۂ فکر حیرت انگیز طور پر سائنٹفک تھا، یہ چیز بھی بدقسمتی سے ہمارے یہاں نایابِ نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔ اس لئے ہمارے ادبی اور جمالیات نظریات میں کنفیوژن اور ہمارے سیاسی ، معاشرتی، مذہبی اور اخلاقی زندگی میں حد درجے کا تضاد پایا جاتا ہے۔ خواجہ صاحب محض ایک منفرد انسانی شخصیت ہی نہیں تھے نہ ہی محض ایک معلم، محقق یا نقاد تھے بلکہ وہ اپنی ذات میں ایک مکمل ادارہ تھے۔ وہ شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی کے بانی ، ایک مقتدر چارہ ساز وسربراہ بھی تھے، مختلف علمی انجمنوں، ثقافتی اداروں کے ممتاز مشیر اور دانش گاہ دہلی کی فیکلٹی آف آرٹس کے ڈین بھی رہے تھے اور تاحیات پروفیسر آف ایمی ری ٹس ہونے کے علاوہ راک فلر ریسرچ اسکالر بھی رہے تھے انہوں نے ہندوستانی ادب کے مہمان پروفیسر کی حیثیت سے ، امریکہ، روس، تاشقند، فرانس مغربی جرمنی کے دورے بھی کئے تھے، انہوں نے تین زبانوں میں یعنی اردو، فارسی اور انگریزی میں ایم۔اے کیا تھا اور مکتوبات اردو کے تاریخی اور ادبی ارتقاء پر تحقیقی مقالہ لکھا تھا۔ ان کی تصنیفات وتالیفات کی تعداد پندرہ ہے اور ترتیب وتدوین کئے ہوئے مخطوطات کی تعداد تیرہ ہے۔ انہوں نے امریکہ میں، انگلینڈ میں چیکوسلواکیہ میں اور یوگوسلاویہ میں جواب سربیا کہلانے لگا ہے۔ توسیعی خطبات بھی دیئے اور ہندوستان میں علی گڑھ، کشمیر، عثمانیہ میسور، لکھنؤ اور جوہر لال نہرو یونیورسٹیز میں خطبات بھی پیش کئے۔

انہوں نے دنیا کے تینتیس ممالک کے سفر کئے تھے۔ خواجہ صاحب پر ہندوستان کی چار یونیورسٹیوں میں تحقیقی مقالے لکھے جاچکے ہیں ان میں دو ڈاکٹر کی ڈگری کے لئے اور دو ایم فل کی

Marfat.com

ڈگری کے لئے ہیں انکے علاوہ خواجہ صاحب پر انگریزی زبان میں امریکہ کی وسکانس یونیورسٹی سے اور ہینگرین زبان میں ہینگری کی بڈاپسٹ یونیورسٹی میں بھی مقالے لکھے گئے ہیں اتنے اعزازات، اتنے انعامات واکرام شاذ و نادر ہی کسی اردو والے کو فی زمانہ حاصل ہوئے ہوں گے۔

خواجہ صاحب نے اتنی متنوع اور مختلف النوع حیثیتوں سے جو علمی، ادبی، ثقافتی اور تنظیمی خدمات انجام دی تھیں وہ لائقِ صد ستائش اور یادگار زمانہ ہیں۔ زبان وادب کا کوئی مورخ اردو کی ترقی وترویج کے حوالے سے جب بھی قلم اٹھائے گا تو خواجہ صاحب کا نام اردو کے صفِ اوّل کے محسنوں میں قلمبند کرے گا۔ اور جب بھی دہلی یونیورسٹی کے صفِ اوّل کے محسنوں میں قلمبند کرے گا، اور جب بھی دہلی یونیورسٹی کے کارہائے نمایاں کا ذکر خیر کرے گا تو اس کی بنیاد کے ہر پتھر پر ایک ہی نام کندہ پائے گا... خواجہ احمد فاروقی۔

میں خواجہ صاحب سے اپنی آخری ملاقات مرتے دم تک فراموش نہیں کرسکتا۔ مجھے ان سے آخری بار نیاز حاصل کرنے کا شرف ان کے انتقال سے چند ماہ پیشتر حاصل ہوا تھا وہ بہت علیل تھے اور میں اپنے ایک عزیز دوست کے ہمراہ عیادت کی غرض سے ان کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ اب جو انہیں دیکھا تو بڑا دکھ ہوا، چلنے پھرنے سے کسی حد تک معذور ہو گئے تھے بہت نحیف اور سوکھ کر قاق ہو گئے تھے اور از حد رقیق القلب بھی ہو گئے تھے۔ لیکن دماغ اسی طرح روشن، مزاج میں وہی خوش اخلاقی اور لباس اس حالت میں بھی براق اور نفیس تھا، دانۂ عقیق کی تسبیح اور مخملی جائے نماز قریب میں رکھی تھی چھوٹے چھوٹے دو مخملی گاؤ تکیوں سے کمر کو سہارا دیکر ایک لکڑی کی خاصی بڑی چوکی جس پر دری اور سفید چاندنی بچھی تھی بیٹھے تلاوت کلام پاک سے فارغ ہو کر بارگاہ خداوندی میں دعا گو تھے دعا سے فارغ ہو کر ہماری طرف متوجہ ہوئے۔ ہم نے سلام عرض کیا اور خیریت دریافت کی، حسب سابق بہت شفقت اور محبت سے پیش آئے مرحوم دہلی کالج اور پھر شعبے کی تعلق سے بات چیت کی اس کے بعد تھوڑی دیر خاموشی چھائی رہی اور ہم دونوں دوست بھی گم صم بیٹھے یادوں کے موتی پروتے رہے۔ ایسی شدید علالت میں مہمان نوازی کی سابقہ روایت بھی دیکھنے کو ملی۔ اسی دوران ہمت کر کے میں نے ایک درخواست خواجہ صاحب کے گوش گذار کرتے ہوئے عرض کیا کہ سر! آپ ہمیں کوئی نصیحت فرما دیجئے چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولے کہ ''زندگی بغیر کسی نصب العین کے بیکار ہے، زندگی جس قدر بلند ہوگی نصب العین اسی قدر

Marfat.com

ارفع واعلی ہوگا، مجھے تو ان لوگوں پر افسوس ہوتا ہے جو بغیر کسی آئڈیل کے زندگی گذار کر قبر میں جا پہنچتے ہیں، جب کوئی اعلیٰ نصب العین پیش نظر نہ ہو تو انسان کے سینے میں وہ حرارت پیدا ہی نہیں ہو سکتی جو اسے مسلسل مصائب برداشت کرنے کا حوصلہ عطا کرتی ہے۔ یہ علم حاصل کرنا اور اس میں اعلیٰ مقام حاصل کرنا بھی اعلیٰ ترین نصب العین ہے'' یہ کہہ کر خاموش ہو گئے۔ چند لمحوں بعد میں نے سوال کیا کہ سر۔ آپ کا نصب العین تو روز روشن کی طرح سب پر عیاں ہے، اتنا شاندار شعبۂ اردو اور اس کے تحت اتنے بہت سے علمی کارہائے نمایاں آپ نے کس طرح انجام دیئے اور یہ کامیابیاں آپ نے کسکو آئڈئل بنا کر حاصل کیں؟ اتنا سننا تھا کہ خواجہ صاحب آبدیدہ ہو گئے اور ایسا محسوس ہوا جیسا کچھ کہنا چاہتے ہوں مگر آواز بھرّانے کے سبب بولنے کی سکت باقی نہیں رہی تھی اور آنکھیں ڈبڈبائے گردن جھکائے آنسو پینے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن میرا سوال اپنے جواب کے لئے بے چین تھا۔ میں نے بات کا بدل کر کہا کہ سر آپ اپنی دعاؤں سے ہمیں نواز دیجئے وہ یقیناً ہمارے لئے سرمایہ حیات ہوں گی یہ سن کر انہیں جانے کیا خیال آیا کہ صبر کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا، ضبط کرنے کی کوشش کے باوجود، ضبط کا یارانہ رہا چشم نمناک کے ساتھ فرمایا کہ میاں، نبی کریم ﷺ سے بہتر آئڈئل اور کون سی شخصیت ہو سکتی ہے اسی لئے تو اللہ تعالیٰ نے رسالت مآب کو رحمت للعالمین بنا کر بھیجا تھا۔ آپ لوگ ایک بات گرہ میں باندھ لیں کہ آپ جب کبھی بارگاہ رب العزت میں دعا کے لئے ہاتھ اٹھائیں اور کسی بڑے سے بڑے کام کے کرنے کا قصد کریں یا کتنی بھی بڑی شخصیت سے ملاقات کرنے کا شرف حاصل کریں آپ اوّل آخر تین مرتبہ یا سات مرتبہ درود شریف پڑھ کر یہ چھوٹی سی دعا پڑھ لیا کریں پھر وہ دعا پڑھ کر سنائی اور میری درخواست پر لکھ کر بھی مجھے دی اس کے بعد اپنی زندگی کے چند اہم واقعات بیان کرنے کے بعد کچھ بہت اہم شخصیات سے اپنی ملاقات کے بارے میں انکشافات کرتے کرتے بچوں کی طرح سسکیاں لے لے کر آبدیدہ ہو گئے، ہاتھ کا رومال اشکوں سے تر ہو گیا تھا، قدر ضبط کرنے کے بعد فرمانے لگے کہ میری زندگی میں ہر موقع پر چاہے جیسے کڑے سے کڑے امتحان کا وقت آیا ہو میں نے صرف اس وحدہٗ لاشریک کی ذات ہی پر بھروسہ کیا ہے اور اس کے پیارے حبیبؐ کی وساطت سے ہی ہر مدد طلب کی ہے اور مجھے نہ صرف یہ کہ وہ مدد عطا کی گئی بلکہ کامیابیوں سے بھی ہمکنار کیا گیا، یہ آخری جملہ ادا کرتے ہوئے خواجہ صاحب کا سسکیوں کے ساتھ ساتھ اشکوں کا تار بھی بند ہو گیا، میں اور میرے دوست سراپا دیدہ تصویر بنے ساکت و خاموش ٹک ٹک دیدم، دم

نہ کشیدم کے مصداق یہ دیکھتے رہے کہ عشق رسولؐ میں آنکھوں سے بہنے والی جوئے خوں سے کس طرح دو شمعیں فروزاں ہو رہی تھیں۔ خواجہ صاحب کے چہرے پر جو نور، جو سکینت اور جو جمال و جلال کی کیفیت میں نے اس وقت دیکھی تھی، اس سے قبل تیس سال کے عرصے میں مجھے کبھی دیکھنے کو نہیں ملی، جی ہاں بات ہی کچھ ایسی تھی۔ کیونکہ:۔

جس انجمن میں ذکر رسالت مآب ہے
اس انجمن میں سانس بھی لینا ثواب ہے

اس دنیا میں موت سے زیادہ کوئی چیز یقینی نہیں جو ہر ذی روح کا مقدر اور ہر مادی وجود کا مقسوم ہے۔ پھر بھی انسان اور ایک ایسے انسان کی موت جو نمونۂ تہذیب و شرافت اور معنی لفظ آدمیت ہو انسانی زندگی میں ایک بڑا سانحہ اور ایک ناقابل فراموش حادثہ ہوتا ہے اس لئے ایک عالم کی موت کو ایک عالَم کی موت کہا گیا ہے۔

۱۹۹۵ء کے آخری مہینے کا آخری دن یعنی ۳۱ر دسمبر کو پوری دنیا کے اردو کے ادبی حلقوں میں یہ اندوہناک خبر سننے کو ملی کہ دہلی یونیورسٹی کا شعبۂ اردو یتیم ہو گیا ہے اور اس کے بانی اور اردو زبان و ادب کے محسن پروفیسر خواجہ احمد فاروقی اس دارِ فانی سے کوچ کر کے اپنے خالق حقیقی سے جا ملے ہیں۔ اِنّا لِلّٰہ وانّا الیہِ راجعون۔ اللہ ان کی روح پر اپنی رحمتوں کے سائے سائے جلوہ فگن کرے اور ان کی قبر کو اپنے نور سے منور فرما کر اس آئڈیل کے دیدار سے مشرف فرمائے جو رہتی دنیا تک کل انسانوں کے لئے منجانب اللہ آئڈیل بنا کر بھیجا گیا تھا

آمین، ثم آمین

بارے دنیا میں رہو، غم زدہ یا شاد رہو
ایسا کچھ کر کے چلو یاں، کہ بہت یاد رہو

☆☆☆

Marfat.com

دھرم پال گپتا وفاؔ

جنوری ۱۹۵۰ء میں میری ملازمت روزنامہ انڈین نیوز کرونکل میں ہوئی جس کا دفتر موری گیٹ میں تھا یہی اخبار اب ''انڈین ایکسپریس'' کے نام سے بہادر شاہ ظفر مارگ سے نکلتا ہے۔ انڈین نیوز کرونکل کے منیجنگ ایڈیٹر اس وقت دیش بندھو گپتا تھے جو لوک سبھا کے ممبر بھی تھے ان کے بھائی جیالال جی انتظامی امور کے سرپرست تھے اور سب سے چھوٹے بھائی دھرم پال گپتا وفا روزنامہ ''تیج'' کے مالک تھے جس کا دفتر موری گیٹ سے چند قدم کے فاصلے پر نیا بازار میں تھا، نیچے پریس تھا، پہلی منزل میں شعبہ ادارت اور دفتر دوسری منزل میں وفا صاحب اپنی فیملی کے ساتھ رہتے تھے۔ یہ اخبار چار بجے شام تک منظر عام پر آجاتا تھا۔

وفا صاحب صبح نو بجے پریس میں آجاتے تھے، مشینوں کے پاس داہنی طرف ان کی میز تھی جس کے اطراف تین چار کرسیاں رہتی تھیں وہ پریس میں عموماً دھوتی کرتا اور جواہر کٹ پہنتے تھے اور جب گھر سے باہر نکلتے تو چوڑی دار پائجامہ، شیروانی، اسی کپڑے کی ٹوپی، سفید موزہ سفید ناگرہ جوتا، کڑھی ہوئی شال شانے پر ڈالے نظر آتے تھے۔ رنگ سانولا بھرا ہوا گول چہرہ جس پر عینک لگی ہوئی، آنکھوں میں ذہانت کی چمک ماتھے پر شکن کے نشان، متوسط قد، آواز میں وقار تھا، رویوں میں اخلاقی قدریں تھی جو محسوس کرتے اس کے اظہار میں کوئی تامل نہیں کرتے تھے جس سے لہجے میں ہلکی سی سختی نمایاں تھی۔ وفا صاحب سے ملاقات کا وقت صبح نو بجے سے گیارہ بجے تک تھا لیکن اس کے بعد بھی کوئی آجائے تو تواضع میں کمی نہیں ہوتی تھی البتہ مشینوں کی گڑگڑاہٹ اور پریس کی ذمہ داریوں کی وجہ سے پوری طرح سے مخاطب نہیں ہو پاتے تھے، آنے والے شاعروں سے ان کا کلام بھی سنتے تھے اور خود بھی سناتے تھے جس کی غزل پسند آئی اس سے کہتے یہ لکھ کر دے دیجئے

Marfat.com

اور وہ ''تیج'' میں شائع ہوتی تھی، دوبارہ ملاقات پر اس سے کہتے تھے غزل شائع ہوگئی تھی دیکھی تھی۔ مشین کی آواز میں کبھی کبھی ایک مصرع کو دو تین مرتبہ پڑھواتے تھے جب پورا شعر سن لیتے تھے تو زیر لب تبسم کے ساتھ داد میں واہ، بہت خوب، اچھا ہے کہہ کر حوصلہ افزائی کرتے تھے۔

ایک مرتبہ کامل نظامی ترنم میں اپنی غزل سنا رہے تھے کہ مشین بند ہوگئی اس پر کام کرنے والے جھانک کر کامل صاحب کو دیکھنے لگے وفا صاحب نے دیکھا تو کامل صاحب کو اشارے سے چپ رہنے کی ہدایت کی اور اٹھ کر مشین کی طرف چلے گئے، جب مشین چلنے لگی تو اپنی کرسی پر بیٹھتے ہی فرمایا، ہاں، جناب پڑھیے اور کامل صاحب سے پوری غزل سنی پھر یہ کہہ کر خود بھی غزل سنائی کہ یہ تازہ ہے۔

پریس میں وفا صاحب دوران گفتگو ٹوپی اتار کر میز پر رکھتے تھے اور داہنے ہاتھ سے سر کو سہلاتے تھے جس کے درمیانی حصے پر شاذ و نادر بال تھے پھر ہاتھ کی دو انگلیوں کو ملا کر نیم جھٹکے سے ہاتھ اوپر اٹھاتے اور پھر اسے دیکھ کر جھاڑ دیتے ایک مرتبہ ان کا یہ عمل پوری توجہ سے دیکھا تو دونوں انگلیوں کے درمیان سر کا بال تھا۔ وہ کلام ہمیشہ تحت میں پڑھتے تھے شعر سناتے وقت کبھی کبھی ہاتھ کو جنبش ضرور ہوتی تھی لیکن چہرے سے کوئی تاثر ظاہر نہیں ہوتا تھا، شعری نشست ہو یا مشاعرہ وہ پرچے پر لکھا ہوا کلام سناتے تھے بیاض کبھی نہیں رکھتے تھے اگر دوسری غزل کی فرمائش ہوتی تو جیب سے کئی مڑی ہوئی پرچیاں نکالتے اور اس میں سے منتخب کلام سناتے تھے۔

مزاج میں بذلہ سنجی تھی لیکن سنجیدگی کے ساتھ قہقہہ لگا کر نہیں ہنستے تھے، وضع داری کے پابند تھے، مہمان نوازی میں خوشی محسوس کرتے تھے جس اظہار چہرے سے ہوتا تھا۔ ان کی طبیعت دیر آشنا تھی، جس سے تعلقات ہو گئے وہ بالکل ایک جان دو قالب کی طرح لیکن اس تعلق کے اعتماد میں کسی سے کوئی رکیک حرکت ہوگئی تو مراسم ہمیشہ کے لئے منقطع ہو جاتے تھے پھر وہ شخص وفا صاحب کے ساتھ نظر نہیں آتا تھا۔

انجمن تعمیر اردو جس کے بانی گلزار دہلوی تھے اس کا طرحی مشاعرہ ارونا آصف علی ہال اردو بازار میں تھا، مشاعرہ ابھی شروع نہیں ہوا تھا کہ افضل پیشواری نے اپنی شعری صلاحیتوں کا ذکر وفا صاحب سے چھیڑ دیا اور کہنا شروع کیا میں علم عروض علامہ سحر عشق آبادی سے پڑھ رہا ہوں، ایک غزل صبح کہتا ہوں ایک رات میں وفا صاحب نے کہا کیوں دوپہر میں وقت نہیں ملتا افضل صاحب نے کہا ہوٹل کی ذمہ داری بھی رہتی ہے، وفا صاحب نے کہا پھر بھی تھوڑا بہت وقت نکال

Marfat.com

لیا کرو، مشاعرہ شروع ہوا، افضل صاحب جب پڑھنے کے لئے آئے تو وفا صاحب نے پوچھا یہ غزل صبح کی ہے یا رات کی، افضل صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا جی آج صبح کہی ہے۔ اس طرح وفا صاحب سنجیدگی سے گفتگو میں مزاح پیدا کرتے رہتے تھے۔

حکیم شریف کے مکان بلی ماران میں ایک شعری نشست وفا صاحب کی صدارت میں تھی، سردی کا موسم تھا، کشور جوہر جن کا گھر نزدیک ہی تھا وہ نیا کمبل اوڑھے تشریف فرما تھے وفا صاحب نے کمبل کو چٹکی سے ملا اور جوہر صاحب سے پوچھا اچھا ہے کیا گھر میں بُنا ہے، کشور جوہر نے ہنستے ہوئے کہا جی گھر میں بُنا ہے میں جلاہا ہوں وفا صاحب کے ساتھ سب ہنسنے لگے۔

وفا صاحب اپنے بھائی لالہ دیش بندھو گپتا کی یاد میں سالانہ مشاعرہ کراتے تھے، پہلے دو تین مشاعرے نیا محل میں ایک مکان کے بالائی حصے میں ہوئے جس میں مقامی شعرا شریک ہوتے تھے، پھر یہ مشاعرہ آل انڈیا پیمانے پر نئی دہلی میں ہونے لگا، جس کی نظامت کے فرائض خود انجام دیتے تھے، شاعر کو کلام سنانے کی دعوت دینے کا انداز قطعی سادہ اور انوکھا تھا مشاعرے کے آغاز میں شعرا کی فہرست وغیرہ پڑھ کر سامعین کو نہیں سناتے تھے بلکہ شاعر کو آواز دیتے پھر اس کی طرف دیکھ کر ڈائس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہتے آیئے۔ اگر کسی شاعر نے شعر پڑھتے وقت دو تین مرتبہ ان کی جانب مڑ کر دیکھا اور سامعین کی طرف سے پشت کر لی تو وفا صاحب فوراً شاعر سے کہتے ادھر دیکھئے ادھر ادھر کیا دیکھ رہے ہیں پھر مسکراتے ہوئے باقی شعرا کی طرف دیکھتے تھے۔

مشاعرہ کا دعوت نامہ خود گھروں پر پہنچاتے تھے، میں حویلی حسام الدین حیدر بلی ماران میں رہتا تھا میرے غریب خانے تشریف لائے اور عوت نامہ دیا میں نے کہا آپ نے کسی سے کہلوا دیا ہوتا فون کر دیتے، آپ کی زحمت سے مجھے شرمندگی ہو رہی ہے۔ کہنے لگے واہ یہ کیا بات ہوئی، شرمندگی کیسی مشاعرہ میں کر رہا ہوں یا کوئی اور پھر ہاتھ میں کئی اور دعوت نامہ لئے فوراً واپس ہوتے۔

شام کے وقت وفا صاحب کبھی اردو بازار میں مولوی سمیع اللہ کے کتب خانے جاتے تھے جہاں شاعروں اور ادیبوں سے ملاقات ہوتی تھی وہاں کبھی شاعری کا دور بھی شروع ہو جاتا تھا برابر میں بین کے ہوٹل سے وفا صاحب سب کے لئے چائے بھی منگواتے تھے، بین کے ہوٹل کے بعد جامع مسجد کی سیڑھیوں پر نظیر کا ہوٹل تھا جہاں ہمہ وقت کوئی نہ کوئی شاعر مل جاتا تھا شام کے وقت یہاں بھی وفا صاحب آتے تھے اور وہاں موجود شاعروں کا کلام سنتے اور خود بھی سناتے

Marfat.com

تھے۔ ان مختصر شعری نشستوں کے روح رواں زیادہ تر گلزار دہلوی ہوا کرتے تھے۔

جوش ملیح آبادی کے اعزاز میں لالہ سوہن لال نے میریڈینس ہوٹل علی پور روڈ پر ایک شعری نشست کا اہتمام کیا تھا جس میں چیف کمشنر شنکر پرساد، شیوراج بہادر، ودیا شنکر، ڈاکٹر سکسینہ اور شاعروں میں جوش صاحب کے علاوہ تلوک چند محروم، گوپی ناتھ امن بسمل سعیدی، جگن ناتھ آزاد، عرش ملسیانی، ساحر ہوشیار پوری کنور مہندر سنگھ بیدی، دھرم پال گپتا وفا اور راقم الحروف موجود تھے۔

وفا صاحب کی جب باری آئی تو انہوں نے غزل سنائی اور جب یہ شعر پڑھا:

جس وقت میں بے پردہ اسے دیکھ رہا تھا
دنیا تھی کہ حیرت سے مجھے دیکھ رہی تھی

شعر کی تعریف ہوئی بسمل صاحب نے دوبارہ شعر پڑھوایا، جوش صاحب نے کہا" صرف دیکھ رہے تھے یا" سب ہنسنے لگے۔ کچھ دنوں بعد لالہ پنالال جوہر نے اپنے استاد بے خود دہلوی کی صدارت میں ایک مشاعرہ اپنے مکان میں کیا جس میں وفا صاحب نے یہی غزل سنائی لیکن مندرجہ بالا شعر نہیں پڑھا۔

سہارنپور کے ایک مشاعرے سے واپسی پر میرا وفا صاحب کا ساتھ ہوا، ان کے ساتھ فتح چند نسیم اور ڈگمبر پرشاد گوہر بھی تھے، ہم لوگ بس کے ذریعہ دہلی آرہے تھے، تھوڑا سفر طے ہونے پر گوہر صاحب نے ٹیک لگانے کے لئے ہاتھ کی کوہنی بس سے کچھ باہر کر دی۔ وفا صاحب کی نظر پڑی تو انہوں نے کہا ہاتھ باہر نہ کرو، گوہر صاحب نے فوراً تعمیل کی لیکن کچھ دیر بعد پھر اسی طرح کوہنی کا حصہ باہر کر کے ٹیک لگالی اب وفا صاحب نے ڈانٹتے ہوئے کہا اندر کرو۔ گوہر صاحب پورے وجود سے ہلے اور بالکل سیدھے بیٹھ گئے ابھی وہ بیٹھے ہی تھے کہ سامنے سے آتی ہوئی بس نے اس جگہ ٹکر ماردی جس جگہ گوہر صاحب کی کوہنی تھی وہ حصہ دھنس کر اندر نمایاں ہو گیا تھا، بسیں بہت دیر تک رکی رہیں، ہم سب بس کی دوسری سواریوں کی طرح دہل گئے تھے گوہر صاحب کا تو برا حال تھا وہ کانپتے ہوئے اپنے ہاتھوں سے وفا صاحب کا ہاتھ دبا دبا کر کہنے لگے آپ نے مجھے بچایا ورنہ میں گیا تھا کم سے کم لولا تو ضرور ہو جاتا گوہر صاحب ہم لوگوں کے علاوہ دوسرے مسافروں سے بھی وفا صاحب کی طرف اشارہ کر کے کہہ رہے تھے انہوں نے مجھے بچایا، میرا ہاتھ بالکل اسی جگہ تھا، پھر وفا صاحب سے پوچھنے لگے آپ کو کیسے خبر ہو گئی۔ وفا صاحب کہا میں نے تو

Marfat.com

ایک اصولی بات کہی تھی جو بسوں میں بھی لکھی ہوتی ہے کہ جسم کا کوئی حصہ چلتی بس سے باہر نہ کرو۔ اس میں خبر و بر کیسی اتفاق ہے کہ اسی جگہ ٹکر ہوگئی جہاں تمھارا ہاتھ تھا۔

وفا صاحب کی تاریخ ولادت ۳/مارچ ۱۹۰۷ء ہے انھوں نے دہلی یونیورسٹی سے گریجویشن کیا تھا، شوگر کے مریض تھے جس سے گردوں میں خرابی پیدا ہوگئی تھی بیمار ہوئے حالت زیادہ خراب ہوئی، گنگا رام اسپتال میں داخل ہوگئے جہاں ۱۵/نومبر ۱۹۸۵ء کو رات دو بجے داعی اجل کو لبیک کہا، دہلی کے ادبی حلقوں میں ان کا سوگ منایا گیا، دیش بندھو گپتا کے چار بیٹے ہیں، تیسرے بیٹے رمیش گپتا کو وفا صاحب نے گود لیا تھا اسی کے ہاتھوں ان کا کریا کرم ہوا۔ وفا صاحب نے غزلیہ شاعری کے علاوہ نظمیں بھی کہی ہیں اور ان کی نعتیں اور سلام کی تعداد بھی خاصی ہوگی، میں ۱۹۵۱ء سے حویلی حسام الدین حیدر بلی ماران میں سولہ برس تک رہا جہاں ہر سال طرحی نعتیہ مشاعرہ اور مسالمہ ہوتا تھا جس میں وفا صاحب برابر شریک ہو کر خراج عقیدت پیش کرتے تھے کبھی کبھی صدارت کے فرائض بھی انجام دیتے تھے۔ لیکن ان کے کلام کا ابھی تک کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا ہے۔

☆☆☆

حاجی انیس دہلوی

رشید خاں صاحب

ہندوستان کی جنگِ آزادی کے لیے بلالحاظ مذہب وملت، وطن کے جانبازوں نے بے مثال قربانیاں دیں، قید و بند کی سخت اور ہولناک اذیتیں برداشت کیں، بار بار جیل کی صعوبتوں کو گلے لگایا، لیکن آزادی کی جدوجہد کے لیے اٹھے ہوئے قدموں میں ذرا لغزش نہیں آئی۔ ایسے ہی ایک مجاہدِ آزادی، شاہ جہاں آباد، دلّی کے بے باک نڈر سپاہی ''خاں صاحب'' یعنی رشید خاں صاحب بھی تھے، جنھوں نے خوشی خوشی جنگِ آزادی کی ہر تحریک میں حصہ لیا۔

رشید خاں صاحب محلّہ سوئیوالان گلی کوتانہ میں ۱۸۹۷ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد نظیر خاں، ایک اوسط درجے کے دست کار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ شاید اسی وجہ سے غربت و افلاس کی پاسداری رہی۔ ابتدائی تعلیم تراہا بہرام خاں کے دست کاری اسکول سے حاصل کی۔ گھریلو ماحول مذہبی تھا۔ عصری تعلیم کے ساتھ ساتھ مذہبی تعلیم بھی دینی مدرسے میں پائی۔ اردو سے اچھی طرح واقف تھے، خوش خط تحریر بہترین اور عمدہ لکھتے تھے۔ انگلش اور ہندی کے خطوط بھی پڑھ لیا کرتے تھے اور اچھی طرح سمجھ بھی لیا کرتے تھے۔ خاندان کے لوگ آپ کو پیار سے ببّو کے نام سے پکارتے تھے۔ علاقے کے لوگ بھی بھائی ببّو کے نام سے جانتے تھے۔ بچپن سے ہی مذہب میں دلچسپی تھی اور جلالی قسم کے وظیفے پڑھا کرتے تھے۔ تقریباً بارہ تیرہ سال کی عمر میں ہی سلطان جی، یعنی حضرت نظام الدین اولیا کی درگاہ پر حاضری دینے اور وہاں کی مسجد میں فجر کی نماز ادا کرنے کے لیے دہلی سے پیدل جایا کرتے اور فجر کی نماز پڑھ کر پیدل ہی واپس آیا کرتے تھے۔

یہ ورد ایک دو دن کا نہیں بلکہ کئی سال تک جاری رہا۔ رشید خاں صاحب کے تین بھائی اور

Marfat.com

ایک ہمشیرہ تھی۔ سب سے چھوٹے بھائی بشیر خاں تھے جو نوجوانی میں ہی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ہمشیرہ بھی شادی کے بعد بہت جلد اپنے مالکِ حقیقی سے جاملیں اور اپنے پیچھے ایک لڑکا چھوڑ گئیں، جس کا نام عبدالسلام تھا۔ خاں صاحب کو اپنے بھانجے کی بے چارگی اور معصومیت نے بہت متاثر کیا۔ انھوں نے اپنے بھانجے عبدالسلام کی پرورش اپنی اولاد کی طرح کی۔ اچھی تعلیم دلائی، بہترین تربیت دی اور پال پوس کر جوان کیا اور شادی کرادی۔

رشید خاں صاحب دہلی کے قدیم دست کار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ گھر میں گوٹہ کناری کے کام کے ٹھیے لگے ہوئے تھے۔ خاں صاحب کے دونوں بھائی عمر دراز خاں اور سردار خاں بھی گوٹہ کناری کے کام میں مشغول تھے۔ گھر کی لڑکیاں، خواتین اور ان کے لڑکے صاحبزادے سعید خاں بھی اس کام میں اپنے والد کا ہاتھ بٹایا کرتے تھے۔

اس کے علاوہ دہلی میں ''ٹسر کی ٹوپی'' پہننے کا رواج تھا۔ ٹوپی کے ایک جانب لڑی دار طرّہ بھی ہوتا تھا۔ ٹسر کی یہ ٹوپی دہلی کے شرفاء اور کارخانہ والے بڑی شان سے پہن کر نکلا کرتے تھے۔ یہ طرّے بھی خاں صاحب کے گھر میں تیار ہوتے تھے۔ دن بھر یہ کام ہوتا رہتا اور شام کو دریبہ، کناری بازار میں دکانداروں کو لے جا کر پہنچا دیتے۔

رشید خاں صاحب کی سماجی زندگی کی شروعات ٹھکرائے ہوئے اور مظلوم لوگوں کی حمایت سے شروع ہوتی ہے۔ آپ مزاجاً غریبوں، بے کسوں، مزدوروں اور مجبور لوگوں کے ہمدرد اور حمایتی تھے۔ اکثر اہلِ علاقہ اپنے مختلف مسائل جیسے کرایہ دار مالکان کے جھگڑے، شادی بیاہ طلاق کے مسائل، آپسی رنجش اور اسی طرح کے قضیے لے کر آتے، خاں صاحب دونوں فریقین کی باتیں بغور سنتے اور ایک مناسب فیصلہ کرتے، جسے دونوں فریق تسلیم کرتے اور ہنسی خوشی اپنے گھر چلے جاتے۔

خاں صاحب نے اپنی شادی اور بچوں کی پیدائش کے بعد یہ محسوس کیا کہ اب دہلی میں دستکاری کا چل چلاؤ ہے اور زوال قریب ہے۔ کرگھوں اور دیسی اوزاروں کی جگہ بجلی کی مشینوں نے کام شروع کر دیا تھا اور دست کاری کے گھرانے غربت کی سطح سے بھی نیچے آ گئے تھے۔ اِن حالات کی روشنی میں خاں صاحب نے گوٹہ کناری کا خاندانی پیشہ ترک کر کے، ڈیکوریشن سروس کا کاروبار شروع کر دیا۔ دری، چاندنی، قنات، کھانے پینے کی کراکری اور شامیانے بھی کرایہ پر مہیا کیے جاتے تھے، اس کے بعد علاقہ کے لوگ ان کو ''خاں صاحب دری چاندنی والے'' کے نام سے

Marfat.com

پکارنے لگے۔ ڈیکوریشن سروس کا یہ کام بازار مٹیا محل پر واقع مشہور تاریخی حویلی صدور الصدر کے باہر ایک دوکان لے کر شروع کیا۔ یہ حویلی بادشاہ کے زمانے میں منصف گاہ تھی۔ جہاں شہر کے متنازعہ امور پر شاہی منصف عدالت لگایا کرتے تھے۔ اس جائیداد کے مالک ابوالحسن کے آباؤ اجداد تھے، اس دوکان میں اِن دنوں مثالی کتاب گھر اور لالہ اچار والے کا کاروبار ہے۔

چوں کہ خاں صاحب غریب کرایہ داروں کے بے باک اور نڈر حمایتی تھے اور مالک جائیداد نواب ابوالحسن کی زیادتیوں کے خلاف ڈٹ کر مقابلہ کرتے تھے، جس کی وجہ سے نواب ابوالحسن، رشید خاں کے سخت مخالف تھے۔ آخر کار ایک روز موقع ملتے ہی خاں صاحب کی دوکان کا سارا سامان نکال کر سڑک پر ڈال دیا اور دوکان پر غاصبانہ قبضہ کرلیا۔ نواب ابوالحسن کی اس زیادتی پر بھی آپ نے ڈٹ کر مقابلہ کیا، جو اس زمانے میں ایک ناکام کوشش تھی۔ غالباً یہ واقعہ ۱۹۳۰ء کا ہے جب خاں صاحب نے متاثر ہوکر کرایہ داروں کی یونین بنائی، جس کا نام ''غریب کرایہ داروں کی جماعت'' رکھا، جس کے لیٹر پیڈ پر یہ شعر تحریر تھا:

ہمارے ہی دم سے ہے تعمیر عالم
مگر آج تک ہم بے خانما ہیں

اس واقعہ کے بعد رشید خاں صاحب نے ڈیکوریشن سروس کا کاروبار پہاڑی املی کی اس دوکان پر شروع کردیا، جہاں ان دنوں ان کے صاحبزادے سعید خاں ایک پریس چلا رہے تھے۔ یہ جائیداد خاں صاحب کی اہلیہ کو ورثہ میں ملی تھی اس کا کچھ حصہ فروخت کرکے وہ سرمایہ کاروبار میں لگایا اور رفتہ رفتہ اس کام میں کافی ترقی وشہرت پائی۔

خاں صاحب رشید خاں کی سیاسی زندگی کا آغاز ۱۹۱۹ء سے قبل ہی ہو چکا تھا۔ آپ کو سیاسی زندگی میں جن رہنماؤں سے تحریک ملی، ان میں احرار لیڈر مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری، خاکسار تحریک کے رہنما عنایت اللہ مشرقی، اسیر مالوہ مولانا محمود الحسن اور قومی رہنما مولانا ابوالکلام آزاد کے نام نمایاں ہیں۔ ان رہنماؤں کی مجاہدانہ اور حب الوطنی سے سرشار تقریروں اور تحریروں نے خاں صاحب کی نوجوان زندگی میں ہلچل مچادی اور جنگِ آزادی کی تحریک میں ایک جانباز، نڈر اور بے باک سپاہی کی طرح شامل ہوگئے۔ آپ زندگی بھر خادم بنے رہے، ورکروں کے ساتھ ورکر بن کر زندگی گزاری۔ آپ نے کبھی کوئی خاص تقریر نہیں کی، وہ مقرر نہیں تھے، لیکن اکثر اجلاس میں انتہائی بے باک انداز میں کام کی بات کہہ دیا کرتے تھے۔ تحریکِ خلافت سے لے کر

Marfat.com

ہندوستان چھوڑو تحریک تک ہر موقعہ پر سرگرم حصہ لیا اور بار بار جیل کی ہوا کھائی اور سخت سے سخت اذیتیں برداشت کیں۔ان کا پختہ عقیدہ تھا کہ:

آزاد جلد اپنا ہندوستان ہوگا
ہم بلبلیں بنیں گے ، یہ گلستان ہوگا
غیروں کی ٹھوکریں پھر کھائیں گے کس لیے ہم
قبضے میں مالکوں کے اپنا مکان ہوگا

رشید خاں صاحب طبعاً باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے، نہایت مضبوط جسم، تاثرات سے عاری چہرہ، پختہ رنگ بڑی بڑی آنکھیں، جن میں سوچ کی گہرائی نمایاں نظر آتی۔ نرم گفتار، منکسر المزاج، خلوص، ایثار اور قربانی کا پیکر، لیکن اندر ہی اندر ایک طوفان موجزن تھا۔ ایک انقلاب آفریں آتش فشاں، جو انھیں بے چین رکھتا اسی لیے بے چین روح کو سکون دینے کے لیے ۱۹۹۱ء میں جب خلافت کی تحریک زوروں پر تھی ایک نڈر سپاہی کے ناطے بیرسٹر آصف علی کی قائم کی گئی آصف والنٹیرز کور میں شامل ہو گئے اور اپنی انتظامی خوبیوں کی وجہ سے کور کے سکریٹری بنادے گئے۔

۱۲ر دسمبر ۱۹۲۱ء کو بیرسٹر آصف علی نے اپنے مکان کوچہ چیلان سے عام سول نافرمانی، کے تحت پچاس والنٹیرز کے ساتھ مارچ شروع کیا، جس میں سب سے آگے آصف علی صاحب اور ان کے بعد خاں صاحب رشید خاں تھے۔

یہ سب سے پہلا دستہ تھا، جس نے دہلی میں انگریزوں کی دہشت کا خوف توڑ کر گرفتاری دی اور لوگوں کے دلوں سے جیل کے خوف کو بے اثر کر کے رکھ دیا۔

خاں صاحب جیل جا کر بھی چین سے نہیں بیٹھے۔ جیل کے اندر کی خرابیوں کے خلاف جیل کے حکام سے ٹکرائے، جس کے نتیجے میں جیل کی شاید ہی کوئی ایسی سزا ہو کہ خاں صاحب کو نہ دی گئی ہو، لیکن خاں صاحب نے ہر سزا نہایت عزم و استقلال کے ساتھ برداشت کی اور جیل میں اصلاح کرانے اور اپنے مطالبات منوانے میں کامیاب ہو گئے۔ اگر میں یوں کہوں کہ خاں صاحب نے جتنی جیلیں کاٹیں اور جیلوں کی سزائیں اور تکلیفیں برداشت کیں دہلی کے مجاہدینِ آزادی میں ان کا نمبر اول رہا تو ہرگز بے جا نہ ہوگا۔ نان کوآپریشن موومنٹ کے دوران جب آپ نے گرفتاری دی تو انھیں ہندوستان کی مختلف جیلوں میں ساڑھے چار ماہ تک رکھا گیا اور پھر

Marfat.com

میانوالی جیل بھجوادیا گیا۔ میانوالی جیل صوبہ سرحد کی سب سے سخت جیل کہی جاتی تھی، لیکن خاں صاحب نے تمام صعوبتوں کی خوشی خوشی برداشت کیا اور اپنی جرأت مندی و بہادری کا ثبوت دیتے رہے۔ ایسے ہی موقع کے لیے غلام ربانی تاباں نے کیا خوب کہا ہے:

ہونٹ جلے سینہ سلگے کوئی ترس کب کھاتا ہے
جام اسی کا جس نے تاباں جرأت سے کچھ کام لیا

جرأت مندی کا تو یہ حال تھا کہ ایک بار کسی قومی مسئلہ پر مولانا احمد سعیدؒ سے بھی کشمکش ہوگئی اور پوسٹروں کے ذریعہ خوب سوال و جواب ہوئے۔ مولانا کے حواریوں نے آپ کو شہر کی مناسبت سے دری چھٹ جیسا خطاب دے ڈالا، مگر آپ اپنی سطح سے نیچے نہیں آئے۔ خاں صاحب رشید خاں نے جنگِ آزادی کی جدوجہد میں حب الوطنی کے جذبے سے سرشار ہوکر ہر تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ جب وہ موڈ میں ہوتے تو اپنی زبانی جیل کے دن اور جیل کی راتوں کا تذکرہ بڑے اثر انگیز انداز میں کرتے تو سننے والوں کی آنکھیں نم ہوجاتی تھیں۔

۱۹۴۲ء میں ہماری قومی تاریخ اور جنگ آزادی کا وہ فیصلہ کن مرحلہ آیا جو ''انگریزو ہندوستان چھوڑو'' کی تحریک کے نام سے مشہور ہے۔ جس میں عوام کو تشدد اور توڑ پھوڑ کی بھی ترغیب دی گئی تھی، آزادی کے متوالوں کی سرگرمیاں پورے ہندوستان میں پھیل چکی تھیں، عوام جوق در جوق جیلوں کو بھر رہے تھے، اس موقعہ پر تحریک کو کامیاب بنانے میں خان صاحب نے بڑا جان جوکھوں کا کام اپنے ذمہ لے رکھا تھا۔ دلّی والے جانتے ہیں کہ ۱۹۴۲ء میں اروناآصف علی اور شری جگل کشور کھنہ ہی اس فیصلہ کن تحریک کو چلانے کے لیے انڈر گراؤنڈ ہوگئے اور ان کی طرف سے ''کرو یا مرو'' کی تحریک کے مضامین چھپا کرتے تھے اور تقسیم ہوتے تھے۔ اس کی ذمہ داری خاں صاحب نے لے رکھی تھی، تقسیم کرنے والوں میں ان کے صاحبزادے سعید خاں بھی تھے جو ان دنوں صرف نو سال کی عمر کے تھے وہ خاموشی سے لٹریچر درکروں میں تقسیم کرکے آتے تھے۔ جورات کے اندھیرے میں کوتوالی، تھانے ٹاؤن ہال اور دہلی کے دیگر اہم مقامات پر چسپاں کردیے جاتے تھے۔ اس کام کے لیے خاں صاحب نے اپنے مکان میں ایک خفیہ دستی پریس لگا رکھا تھا، اس پریس میں وہ تمام بلیٹن چھپتے تھے جو عوام میں تقسیم ہوتے تھے۔ اس کی اطلاع کسی طرح پولیس کو ہوگئی اور پولیس کو یہ بھی معلوم تھا کہ اروناجی اور کھنہ جی کا رابطہ خاں صاحب سے قائم ہے اور خاں صاحب کو ان کی خفیہ رہائش کا بھی علم ہے۔ سرکار نے اروناجی اور

Marfat.com

کھنہ جی کی گرفتاری پر ایک بڑے انعام کا اعلان بھی کر رکھا تھا۔ پولیس نے ۱۹۴۲ء میں بہت بڑی جمعیت کے ساتھ خاں صاحب کو گرفتار کرلیا۔ ان سے معلومات حاصل کرنے کے لیے پولیس نے بے حد تکلیفیں پہنچائیں اور لالچ بھی دیے، لیکن خاں صاحب اپنے ارادے اور عزم پر اٹل رہے، بالآخر ڈبل ڈبل بیڑیاں پہنا کر زنداں میں ڈال دیا گیا۔ لیکن پولیس اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوسکی۔ حالاں کہ ارونا جی برقعہ پہن کر گھر آتی جاتی تھیں اور روپوشی کے دوران کئی دن وہاں گزارے بھی۔ خاں صاحب جامع مسجد کے علاقے میں رہتے تھے، جو مسلم لیگ والوں کا گڑھ کہلاتا تھا، لیکن خاں صاحب کبھی مسلم لیگ ذہنیت کے نہیں رہے بلکہ ہمیشہ مسلم لیگ کے خلاف کمربستہ رہے۔ ۱۹۴۰ء میں جب مسلم لیگ نے لاہور کے اپنے اجلاس میں ''لاہور ریزولیوشن'' پاس کیا جو بعد میں ''پاکستان ریزولیوشن'' کے نام سے مشہور ہوا فوراً دہلی میں اس کی مخالفت میں زبردست کانفرنس گاندھی گراؤنڈ میں کی گئی، جس کو آل انڈیا آزاد مسلم کانگریس کا نام دیا گیا۔ اس کانفرنس کے رہنماؤں میں ڈاکٹر شوکت اللہ انصاری، مفتی کفایت اللہ اور مسٹر آصف علی تھے۔ خاں صاحب اس شاندار کانفرنس کے روحِ رواں اور آفس سکریٹری تھے۔ کانگریس نے پاکستان ریزولیوشن کی جم کی مخالفت کی اور اس کے ہولناک نتائج سے مسلمانوں کو آگاہ کیا۔

خاں صاحب رشید خاں اپنے ارادے کے بہت پختہ اور جواں عزم رکھنے والے انسان تھے۔ انگریزی سرکار کے لیے ہر لحہ خطرہ بنے رہتے۔ ۱۹۴۳ء میں بھی آپ کو ایک ماہ کے لیے نظر بند رکھا گیا۔ رہائی کے بعد ان کی سرگرمیوں پر سخت پابندیاں لگادی گئیں۔ لیکن اس کے باوجود مجاہدانہ طور پر ان پابندیوں کو توڑ کر تحریکِ آزادی کے لیے بلاخوف وخطر سرگرم رہے۔ خاں صاحب کے جیل کے ساتھیوں میں ڈاکٹر یدھ ویر سنگھ، جگل کشور کھنہ، گوپی ناتھ امن، رادھا رمن لالہ دیش بندھو گپتا، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، عزیز حسن بقائی، اسماعیل چوٹی اور نرسنگم وغیرہ کے نام نمایاں ہیں۔

خاں صاحب رشید خاں نے بہت سے ورکروں کو اپنی نگرانی ورہنمائی میں سیاسی سوجھ بوجھ اور اونچ نیچ کے راستے دکھائے۔ خاں صاحب رشید خاں کی خدمت سے دہلی کے پرانے شہری پوری طرح واقف ہیں۔

چودھری برہم پرکاش نے اپنی چیف منسٹری کے دوران خاں صاحب کو پٹرول پمپ اور سندر نگر میں ایک پلاٹ کی پیش کش کی، لیکن آپ نے یہ کہہ کر لینے سے انکار کردیا ''کیا آپ آزادی

Marfat.com

کی قربانیوں کے عوض یہ سب کچھ دے رہے ہیں؟'' یہ تھے خاں صاحب کے درویشانہ خیالات! آپ کو کسی طرح کا لالچ یا خواہش نہیں رہی جب کہ خاں صاحب چودھری برہم پرکاش کے دستِ راست سمجھے جاتے تھے۔

۱۹۵۰ء میں جب ہندی کو قومی زبان کا درجہ دیا گیا تو خاں صاحب رشید خاں نے چتلی قبر کے چوراہے پر جہاں بلاک کانگریس کمیٹی کا دفتر تھا ایک شبینہ اسکول جاری کیا، جس میں ماسٹر پیارے لال کو ہندی پڑھانے کے لیے مقرر کیا۔ علاقہ کے لوگوں نے ہندی سیکھنے میں کوئی دلچسپی نہیں دکھائی۔

خاں صاحب رشید خاں کی دیش بھگتی اور خدمات کو دیکھتے ہوئے مٹیا محل بلاک کانگریس کمیٹی، سوئیوالان منڈل کے صدر بنائے گئے۔ دہلی پردیش کانگریس کمیٹی کی ایگزیکٹیو کونسل کے کافی عرصہ تک ممبر رہے اور چھ سال تک آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ممبر بھی چنے گئے۔

خاں صاحب کی ساری زندگی قوم و وطن کی خدمت کرتے گزری۔ آپ نے آزادی کی لڑائی غیر منقسم ہندوستان کے لیے لڑی، لیکن ہندوستان کی تقسیم وجود میں آگئی اور بدقسمتی سے وہ ہو گیا جو نہ ہونا چاہیے تھا۔ تقسیم کا جو نتیجہ سامنے آیا وہ سب کے علم میں ہے۔ خاں صاحب کو بے حد رنج رہا، اس کے باوجود وطنِ عزیز کو غلامی کی زنجیروں سے نجات دلانے کے بعد بھی خاں صاحب خاموش نہ بیٹھے اور ملک و قوم کی خدمت کرنے میں پیش پیش رہے۔ فسادات کے دوران آپ کو اسپیشل پولیس آفیسر بنا دیا گیا۔ آپ نے رضا کارانہ طور پر پناہ گزینوں کی بے پناہ خدمت کی۔ مال و اسباب، گم شدہ عزیزوں کی تلاش، اغوا کی گئی لڑکیوں کی برآمدگی جیسے معاملات میں اپنی طاقت لگا دی۔ بے سہارا اور تباہ حال لوگوں پر اپنی دری چاندنی کی دکان نچھاور کر دی، ان کے لیے دری، چاندنی، شامیانے، قنات اور خیمے دان کر دیے۔ دوسری جانب ان کے بیٹے سعید خاں کا اسٹال جو کناٹ پلیس میں میرینہ ہوٹل کے پاس تھا فسادات میں لوٹ لیا گیا اور آپ بری طرح سے ٹوٹ گئے۔ گزر اوقات کے تمام راستے ختم ہو چکے تھے۔ جب یہ حالات آریہ سماجی لیڈر پنڈت گیان چند کے علم میں آئے تو انھوں نے آریہ انا تھالیہ پٹودی ہاؤس کا کچھ کام بائنڈنگ کا دلایا۔ ان کے علاوہ لالہ چمن لال بترا، پرس رام کالرہ اور دیگر احباب نے بہت مدد کی، جس کا ذکر اکثر خاں صاحب کیا کرتے تھے۔

بعد ازاں آپ محمد احمد، اسحاق برادران صندوق والوں کی جائیداد کے مختارِ عام بن گئے۔

Marfat.com

آزادی کے بعد خاں صاحب کی زندگی کا سب سے بڑا المیہ اپنی بیٹی کنیز خاتون کا نقلِ وطن تھا جو اپنے شوہر سید شریف الرحمٰن خلف الرشید حضرت مولانا لطیف الرحمٰن کلکتہ والے کے ہمراہ پاکستان ہجرت کر گئی تھی۔ خاں صاحب کو بیٹی کی جدائی کا بہت غم تھا۔ وقت کی ستم ظریفی دیکھیے ۱۹۴۹ء میں جب خاں صاحب انڈین پرمٹ حاصل کر کے کراچی گئے تو حکومت پاکستان نے ۲۴ گھنٹے میں پاکستان سے نکل جانے کا آرڈر دے دیا۔ یہ سب ان مسلم لیگیوں کی شرارت تھی جو خاں صاحب کی وطن دوستی اور تقسیم وطن کے خلاف ان کی سرگرمیوں سے سخت نالاں تھے اور انھوں نے شکایتیں کر کے ۲۴ گھنٹے میں پاکستان سے باہر نکلوا دیا اور وہ اپنی بیٹی سے چند یوم بھی سکون سے نہ مل سکے۔

خاں صاحب رشید خاں آخری بار ۱۹۶۴ء میں اپنے بیٹے حمید خاں کے ساتھ ۲۳ دن تک تہاڑ جیل میں نظر بند رہے، کیوں کہ انھوں نے کرنل جمال عبدالناصر کی دہلی آمد پر سید قطب شہید اور دیگر علما کو پھانسی دینے پر احتجاج کا اعلان کیا تھا۔ ۱۹۶۴ء کی نظر بندی کے دوران جیل میں ان کے ہمراہ مولانا ابواللیث، افضل حسین، حافظ علی بہادر خاں، مولانا سمیع اللہ قاسمی اور ڈاکٹر عباس ملک بھی تھے۔ اس واقعہ کے بعد امیر جماعت اسلامی مولانا ابواللیث صاحب سے بہت قریبی تعلقات ہو گئے۔ مولانا ہر عیدالفطر کی نماز کے بعد خاں صاحب سے ملنے ان کے گھر تشریف لاتے تھے۔

۱۹۶۵ء کے بعد کانگریس پارٹی کے اندر بدعنوانیوں اور کرپشن اور پارٹی کے بنیادی اصولوں کی بے ضابطگیوں اور مفاد پرست عناصر کے غلبے نے ایمان دار اور بے لوث ورکروں کا پارٹی کے اندر رہنا دشوار بنا دیا۔ خاں صاحب رشید خاں کی زندگی کا ایک امتیازی پہلو یہ ہے کہ آپ نے بلاحرص و لالچ وطنِ عزیز کو آزادی دلانے کے لیے قربانیاں دیں، قوم کی خدمات میں اپنا سب کچھ نچھاور کر دیا۔ لیکن کسی سے کوئی ذاتی فائدہ حاصل نہ کیا۔ قوم میں بیداری پیدا کرنے اور مفاد پرستوں کی نقاب کشائی کرنے کے لیے آپ نے میونسپل کارپوریشن کے حلقہ مٹیا محل سے آزادانہ الیکشن بھی لڑا، مگر ناکام رہے۔

قوم کی بے حسی اور بدعنوان پارٹی ممبروں کی حالت دیکھتے ہوئے بڑے افسردہ رہنے لگے، ملک کے بدلتے حالات سے وہ انتہائی بد دل اور بیزار تھے۔ اقتدار کی کشش کے لیے جو ہتھکنڈے اختیار کیے جاتے ہیں وہ سب خاں صاحب کی نظروں کے سامنے تھے یہ وہ ہندوستان

ہرگز نہیں تھا، جس کا خواب انھوں نے اور ان جیسے ہزاروں انقلاب پسندوں نے دیکھا تھا۔ عمر کے آخری حصے میں گوشہ نشینی اختیار کرلی اور نماز و وظائف میں اپنا وقت گزارنے لگے۔ ۸۹ سال کی عمر میں مالکِ حقیقی کا بلاوا آ گیا اور ۲۵ رجون ۱۹۸۵ء کو ان کی وفات ہوگئی۔ اب آپ درگاہ شاہ ولی اللہؒ مہندیان میں ابدی نیند سو رہے ہیں:

مختصر سی ہے یہ گل کی داستان
شاخ پر پھوٹا ، کھلا ، مرجھا گیا

☆☆☆

Marfat.com

مولوی حافظ سید حمید صاحب
(امام شاہی جامع مسجد)

بار بار اجڑی بسی دلّی کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ یہ ہمیشہ باہر والوں کو راس آئی اور باہر والے بھی بڑے شوق سے یہاں آتے ہیں اور اس شہر کے ہو رہتے ہیں ان کے رکھ رکھاؤ سے ایسا لگتا ہے کہ یہی دلّی کی آن وشان ہیں۔ لیکن بسا اوقات بعض غم روزگار کے مارے ہوئے ایسے غم زدہ بھی آتے ہیں جو یہاں کی تہذیب ووضعداری میں ضم نہیں ہو پاتے وہ شہر کی روایتی محفلوں کے آداب کو برقرار رکھنے میں خاموش تماشائی ہی بنے رہتے ہیں۔ اس کو سماجی المیہ ہی کہا جا سکتا ہے، اس المیہ کے تناظر میں اگر ایسی سرگرمیوں کو ایک طرف کر کے بھی سوچیں تو دلّی شہر کی وہ رونق برقرار نہیں رہی جو دلّی کی روایتی داستانوں کو مرصع کرتی تھی۔

پہلے زمانے میں یہ سنا جاتا تھا کہ دلّی ایک صاف ستھرے اور خوبصورت شہر کا نام ہے۔ خود میں نے اپنے بچپن میں ہی دیکھا تھا کہ حلال خور جھاڑوؤں سے نہ صرف سڑکوں سے کوڑا کرکٹ صاف کرتے تھے بلکہ گلی کوچوں کو بھی جگمگا دیتے تھے اور شام کو پانی کے ٹینکر چھڑکاؤ کر کے فضا کو خوش گوار بنا دیتے تھے۔ مگر اب جو حال ہے بس اللہ ہی اللہ ہے جگہ جگہ گندگی کے ڈھیر نہ کوئی دیکھنے والا اور نہ کوئی کہنے والا۔

صحیح معنوں میں کون دلّی والا ہے یہ تو ایک بے معنی بحث ہے میں سمجھتا ہوں کہ ہر وہ شخص دلّی والا ہے جو کہیں سے بھی آئے لیکن یہاں آ کر یہاں کی تہذیب وتمدن میں رچ بس جائے اور تیوہار یہاں پر منائے اور قربانی بھی یہاں کرے۔

Marfat.com

صحیح معنوں پر میں دلّی کی شان وشوکت، شاہی جامع مسجد سے دوبالا رہی ہے اگر کوئی سیاح آتا ہے تو اس کی سیاحت اس وقت تک مکمل نہیں کہی جاسکتی جب تک کہ وہ دلّی کی جامع مسجد کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لے اور باہر سے آنے والے مسلمان تو یہاں نماز پڑھنا بڑی سعادت سمجھتے ہیں۔ شاہ جہاں بادشاہ نے جب ایشیاء کی اس عظیم مسجد کی تعمیر کا منصوبہ بنایا تو اس نے دنیا بھر میں ایسے کسی عالم کو بھی تلاش کرایا جو اس مسجد کی امامت کے شایان شان ہو۔ چنانچہ ۱۹۶۰ء میں بخارا کے اس وقت کے مشہور عالم وفاضل حضرت مولانا شاہ عبدالغفورؒ کو اس منصب جلیلہ کے لئے منتخب کیا گیا اور آج تک آپ کے خاندان کے افراد ہی اس منصب پر فائز ہیں اور امامت کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ ایک یہ بھی روایت ہے کہ جامع مسجد کے پہلے امام صاحب کے دست مبارک سے ہی شہنشاہ اورنگزیب کی تاج پوشی ہوئی تھی اور یہ سلسلہ آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کی تاج پوشی یعنی ۳۰ ستمبر ۱۸۳۷ء تک جاری رہا جو کہ آٹھویں پیڑھی کے حضرت مولانا شاہ احمد علیؒ کے ہاتھوں انجام پذیر ہوئی تھی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ہمیشہ سے ایوانِ حکومت میں جامع مسجد کے امام صاحبان کا دبدبہ رہا ہے اور شہر کی سماجی زندگی میں بھی اس خاندان کے لوگوں کو بڑی عزت اور توقیر کی نگاہ سے دیکھا جاتا رہا ہے۔

۱۵ اکتوبر ۱۸۹۷ء کو دسویں امام حضرت مولانا سید احمد کے یہاں جو پہلا بچہ پیدا ہوا اس کا نام سید حمید رکھا گیا جو بعد میں اس شاہجہانی مسجد کے گیارہ ہویں امام ہوئے۔ مولانا سید حمید صاحب کی شخصیت بڑی پرکشش اور دلنواز تھی آپ کا قد میانہ اور رنگ گوراچٹا تھا۔ چہرہ لمبا، بدن چھریرہ اور اس پر خوش نما سفید شرعی داڑھی، سر پر ٹوپی اس پر لمبا رومال، ٹخنوں سے اوپر پاجامہ، شیروانی، اوپر سے کالا چوغہ، ہاتھ میں چاندی کی دستے والی چھڑی، جس سے ان کی شخصیت میں جاذبیت اور کشش کا اضافہ ہوجاتا اور رعب وداب الگ جھلکتا لگتا تھا اور پہلی نگاہ میں ہی دل ان کی طرف کھینچنے لگتا تھا یہ محسوس ہوتا تھا کہ کوئی فرشتہ صفت انسان ہے جس کے چہرے پر نور برس رہا ہے۔ میں نے بچپن میں سید احمد صاحب کو بارہا دیکھا تھا۔ میرے دادا مرحوم فضل الحق پراچہ سے ان کے بے تکلف اور دوستانہ مراسم تھے۔ مجھے یاد ہے میں نے سردیوں کے موسم میں مرحوم امام سید احمد صاحبؒ کے دولت کدے پر مومیائی آم بھی کھائے تھے۔ امام صوف کے یہاں رواج تھا کہ آموں کا موسم ختم ہونے سے قبل آموں کے منہ پر موم جامہ کرکے شہد میں ڈال کر محفوظ کرلیا جاتا تھا۔ اور پھر غیر موسم میں وہ اپنے مہمانوں کی تواضع ان آموں سے کرتے۔ امام سید حمید کے

Marfat.com

زمانے تک یہ رواج برقرار تھا۔

قبلہ امام سید احمدؒ کے متعلق یہ بات عام تھی کہ وہ ہندوستان کی ان چند برگزیدہ شخصیتوں میں سے تھے جو وائسرائے ہند سے بغیر وقت لئے ملاقات کر سکتے تھے۔ دلّی تو کیا ہندوستان بھر میں جب بھی کوئی ایسا مشکل معاملہ یا مسئلہ آپڑتا جس کو وائسرائے ہند کے سوا اور کوئی حل نہیں کر سکتا تھا تو اس وقت ہندوستان بھر کے لوگ اور خاص طور پر مسلمان قبلہ امام صاحب کی خدمات کا فائدہ اٹھایا کرتے تھے اور امام صاحب وائسرائے بہادر سے حسب ضرورت حکم صادر کروالیا کرتے تھے۔ اس سے عوام میں جامع مسجد کا وقار اور بھی دوچند ہو جاتا تھا۔

۱۸۸۴ء میں امام سید احمدؒ کے وصال کے بعد سید حمید صاحب منصب امامت پر فائز کئے گئے۔ چتلی قبر کی ایک حویلی میں امام صاحب اپنی فیملی کے ساتھ رہتے تھے۔ ان کا روزانہ کا معمول تھا کہ گھر سے رکشہ سے جامع مسجد تک آتے اور اگر کہیں دور جانا ہوتا تو آٹو رکشا سے سفر کرتے تھے۔ ٹیکسی کا استعمال بہت ہی کم کیا کرتے تھے۔ میں نے متعدد مرتبہ دیکھا ہے کہ امام صاحب موصوف جب کسی حاکم اعلیٰ کے پاس سفارش کے لئے تشریف لے جاتے تو وہ بے پناہ احترام سے ان کے ساتھ پیش آتا تھا اور امام صاحب کے کہنے کے مطابق کام انجام دے دیتا اور چلتے ہوئے عام طور پر یہ بھی ضرور کہتا کہ آپ نے آنے کی زحمت کیوں کی ہمیں حکم فرماتے تو خدمت میں حاضر ہو کر جامع مسجد کی زیارت بھی کر لیتے۔

جامع مسجد کے کپڑا فروشوں میں ایک دوکاندار صاحب تھے جن کا نام الیاس تھا ان کا جھگڑا ان کے پڑوسی سے ہو گیا اور غصے میں انہوں نے اس کا سر پھاڑ دیا پولیس نے ان کو گرفتار کر لیا۔ ان کے لواحقین قبلہ امام صاحب کے پاس دیر رات میں پہنچے اس زمانے میں نظم و نسق بھی ایس ڈی ایم کے پاس ہوتا تھا۔ امام صاحب نے رات کو ہی بذات خود ایس ڈی ایم کے گھر جا کر ضمانت کرائی صرف اس لئے کہ ان کو رات بھر حوالات میں رہنا نہ پڑے کہنے کو یہ بہت چھوٹا اور معمولی واقعہ ہے لیکن غور فرمائیں تو امام صاحب کے اندر جو خدمت کا جذبہ تھا وہ اس بات کا متقاضی تھا کہ اگر کوئی ضرورت مند وقت بے وقت ان کی مدد چاہے تو انکار نہ ہو اور وہ محروم نہ جائے۔

جامع مسجد کی تاریخ کا یہ بہت بڑا المیہ ہے کہ منصب امامت ہمیشہ تنازعہ کا شکار رہا ہے امام سید حمید صاحب بھی اس سے مبرا نہیں رہے ایک دور تو ایسا آیا کہ اس وقت کے وقف بورڈ کے طاقتور گروپ نے منصوبہ بند طریقے سے سنبھل کے ایک امام صاحب کو لا کر ان کی جگہ امام بنانا

Marfat.com

تقریباً طے کرلیا لیکن جیسے ہی یہ بات پھیلی تو باشندگان دلّی اس زمانے کے قائدین بیرسٹر نورالدین احمد حافظ زین العابدین، مولوی محمد سعید، حافظ عبدالعزیز، حاجی محمد فاروق اور خود راقم کے والد شیخ عبدالحق پراچہ مرحوم نے اس سلسلے میں بہت ہی سخت رویہ اختیار کر کے قضیہ کو ختم کرایا۔ افواہیں پھیلانے والے بھی بہت ہی کاریگر ہوتے ہیں۔ قبلہ امام صاحب کے لئے یہ افواہ پھیلا دی گئی کہ وہ کیمیا بنانے کا شوق رکھتے ہیں اور جامع مسجد کے حجروں کا اس سلسلے میں غلط استعمال کررہے ہیں۔ اس تحریک کے بانی مرحوم مولانا امداد صابری تھے۔ امام سید حمید صاحب کی معصومیت اور خلوص ہی تھا جس کی وجہ سے ان کی شہرت اور نیک نامی پر کوئی اثر نہیں پڑا وہ ہمیشہ اس قسم کی تحریکوں وفتنوں سے بچتے رہے۔ یوں تو امام صاحب سے میرا تعلق دور دور کا ساتھا غالباً ۵۵۔۱۹۵۴ء کی بات ہے تقسیم کے ہنگاموں کے بعد مشرقی پنجاب کی سیکڑوں مساجد میں پاکستان سے آئے ہوئے پناہ گزینوں نے رہائش اختیار کرلی موجودہ ہریانہ اور ہماچل پردیش میں مساجد کو واگزار کرانے کی کوشش میرے والد مرحوم شیخ عبدالحق پراچہ اور ان کے رفقاء کار نے شروع کیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں روہتک کی فردوس المساجد خالی کرائی گئی۔ اس میں از سرنو نماز شروع کرانے کی ایک تقریب منعقد ہوئی جس میں شرکت کے لئے سبحان الہند مولانا احمد سعید صاحب اور مولانا حمید صاحب تشریف لے گئے۔ میری خوش بختی تھی کہ ان بزرگوں کے ساتھ میں بھی ان کا خاموش ہم سفر تھا وہاں پر مجھے امام سید حمید صاحب کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ان کی سادگی خلوص اور شفقت سے بے حد متاثر ہوا۔ اس سفر نے مجھے ان کے بہت قریب کردیا۔ چنانچہ جب تک آپ حیات رہے مجھ سے ہمیشہ شفقت کے ساتھ پیش آتے رہے۔ اپنے مشاہدے کی بنا پر چند واقعات امام صاحب کی سادگی اور سماجی مقام کے بارے میں رقم کرنا ضروری خیال کرتا ہوں۔

قبلہ امام صاحب کی جدی جائیدادوں پر عموماً ۱۹۴۷ء کے زمانے میں پاکستان سے آئے ہوئے رفیوجیوں کا قبضہ ہوگیا تھا جب تمام قانونی کاوشوں اور جدوجہد کے بعد بھی امام صاحبؒ ان املاک کو خالی کرانے میں ناکام رہے تو انہوں نے اپنے اثر ورسوخ کی بدولت اس وقت کے دلّی کے چیف کمشنر ایل این جھا صاحب کی مداخلت سے ان کو خالی کرایا۔ چونا منڈی پہاڑ گنج میں جو کٹڑا امام صاحب کی ملکیت تھا زبردست فورس لگانے کے بعد ہی خالی کرایا جاسکا۔ لیکن امام صاحب نے اپنی سادگی اور لوگوں کی باتوں میں آکر صرف ۴۵ ہزار روپے میں فروخت کردیا

Marfat.com

جب کہ جولوگ اس میں آباد تھے وہ اس سے کئی گنا رقم دینے کو تیار تھے۔اس طرح قطب صاحب مہرولی میں ایک شاندار حویلی کے آپ مالک تھے اس کو بھی صرف ۲۵ ہزار روپے میں فروخت کردیا۔ جب کہ اس کی مالیت بہت زیادہ تھی۔

سرکار کے اعلیٰ حلقوں میں امام صاحب کا بے حد احترام کیا جاتا تھا۔کرنل سعید صاحب شملے والے کا قیام محلہ سوئیوالان میں تھا ان کے مراسم گولچہ سنیما دریا گنج والوں سے تھے گولچے والے نیپال میں کتھے کی ایک فیکٹری لگانا چاہتے تھے اور اس وقت کے وزیر کیمیکل شری کیشو دیو مالویہ اجازت نہیں دے رہے تھے۔ چنانچہ کرنل صاحب نے مرحوم شیخ رضی الدین جو کہ امام صاحب موصوف کے بہت ہی قریبی لوگوں میں سے تھے رابطہ قائم کیا اور ان دونوں حضرات نے قبلہ امام صاحب سے کہا کہ اگر آپ مولانا آزاد سے فرمادیں تو یہ کام ہوجائے گا چنانچہ امام صاحب نے مولانا آزاد کے سیکرٹری اجمل خاں صاحب سے رابطہ قائم کرکے مولانا آزاد سے ملاقات کا وقت مقرر کرلیا اور مولانا آزاد کے سامنے گولچہ والوں کی عرضی پیش کی مولانا آزاد نے وہ فائل فوراً اپنے پاس منگوا کر خود اپنے قلم سے حکم صادر فرمادیا۔ میں چوں کہ اس واقع کا خود شاہد تھا اس لئے حیرت زدہ تھا کہ محکمہ انچارج کوئی اور ہے حکم مولانا آزاد فرمارہے ہیں۔مگر حقیقت یہ ہے کہ مولانا آزاد امام جامع مسجد کا بے حد احترام کرتے تھے اور مولانا آزاد کی حکومت ہند میں جو حیثیت تھی وہ اس بات کی متقاضی تھی کہ امام صاحب کی سفارش کا نہ صرف احترام کیا جائے بلکہ اس پر فوراً عمل بھی کرایا جائے۔

قبلہ امام صاحب طہارت پسند تھے اور اپنے مزاج کے مطابق جامع مسجد کو ہمیشہ صاف ستھرا دیکھنا چاہتے تھے لیکن جامع مسجد کے اردگرد بدکردار عناصر نے جامع مسجد کی عظمت اور حرمت کو پراگندہ کرنا شروع کیا تو امام صاحب موصوف کو بہت افسوس ہوا پولیس اور حکام کے رویہ سے جب مایوس ہوگئے تو انہوں نے چوک کے دوکانداروں کو جمع کیا اور جامع مسجد سدھار کمیٹی کے نام سے ایک تنظیم اپنی سرپرستی میں بنائی اور اس کا صدر فریدالدین عرف راجہ کو اور راقم تحریر کے برادر خوردنذیر پراچہ کو سکریٹری بنایا اس کمیٹی نے جامع مسجد کے اطراف سے ہر طرح کی گندگی صاف کرائی جس سے جامع مسجد کی اجڑی ہوئی شان وشوکت واپس آنے لگی۔امام سید حمید صاحب کو دنیا بھر کے نایاب سکے جمع کرنے کا شوق تھا ایک اندازے کے مطابق یہ سکے لاکھوں روپے کی مالیت کے تھے مجھے پتہ نہیں کہ سکوں کا یہ ذخیرہ اب محفوظ بھی ہے یا نہیں۔امام صاحب نے دو ضخیم

کتابیں تالیف کی تھیں، چونکہ یہ نسخے اب نایاب ہیں اس لئے وثوق سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ اس میں امام موصوف نے اپنی مذہبی معلومات کو بہت سادہ زبان اور آسان انداز میں پیش کیا تھا تاکہ عام سمجھ بوجھ کا انسان بھی اس کو پڑھے تو اپنی مذہبی معلومات میں اضافہ کرلے۔

۱۳ رجنوری ۱۹۷۷ء کو امام موصوف کا انتقال ہوگیا ان کی تدفین جامع مسجد کے جنوبی حصے میں جہاں آج کل ''جنت نشان'' ہے عمل میں آئی۔

☆☆☆

Marfat.com

سیّد عزیز حسن بقائی

حافظ سید عزیز حسن بقائی ۱۱ر نومبر ۱۸۹۱ء بمطابق ۱۱ر شوال ۱۳۱۱ ہجری کو دہلی میں پیدا ہوئے حضرت خواجہ باقی باللہ کے خاندان کے چشم و چراغ تھے حسب ونسب کے اعتبار سے کھرے کے دہلی والے سیّد تھے نہایت خوبصورت گول چہرہ رنگ گورا پیشانی چوڑی سرگنجا میانہ قد سڈول جسم پر قمیص اور شرعی پائجامہ پہنتے تھے اور اس کے اوپر شیروانی اور اجمل کیپ پہن کر اور ہاتھ میں بیت لے کر جب نکلتے تو دلّی کی آن بان اور شان ان کی پرکشش اور رعب دار شخصیت سے پوری طرح آشکار ہوتی تھی۔

دوستوں کے ایسے دوست کہ اگر کسی دوست کی اس زمانے کی دوَنّی کنویں میں گر جائے اور چھلانگ لگا کر اسے نکالنے کا موقع آجائے تو فوراً تیار ہو جاتے تھے دشمنوں کے ایسے سخت دشمن کے اس کی سات پیڑیوں کی ہڈیاں قبر سے کھود کر نکال لائیں قلم کا استعمال تلوار کی طرح کرتے تھے اور اسی لئے اردو صحافت کے سیف الحق مشہور ہو گئے تھے گو کہ تعلیم زیادہ نہ تھی لیکن اردو نثر نگاری کا تیکھا اسلوب ان کی ہر تحریر میں نمایاں نظر آتا تھا اور اوائل عمری میں جب پتھروں پر لیتھو کی چھپائی ہوتی تھی تو حافظ صاحب نے دہلی کے مشہور اور بلند پایہ معیاری پریسوں میں سنگ سازی سے اپنی زندگی شروع کی تھی اس کے بعد کوچہ چیلان میں شاہی مہابت خانی خاندان کے جناب سید محمد ارتضٰی المعروف ملا واحدی صاحب کے رسالہ ''نظام المشائخ'' میں ملازمت اختیار کی یہ وہ زمانہ تھا جب حضرت خواجہ حسن نظامی، مفتی شوکت علی فہمی، منشی عبدالحمید اور مولانا عبداللہ فاروقی بھی ملا واحدی صاحب کے یہاں ملازم تھے حافظ سید عزیز حسن بقائی کو اردو صحافت سے دلچسپی اور خصوصاً اسلامیات پر لکھنے پڑھنے کا شوق اور جذبہ رسالہ نظام المشائخ سے ہی پیدا ہوا ملا واحدی

Marfat.com

صاحب کی ملازمت سے علاحدہ ہوجانے کے بعد انہوں نے اپنا اسلامی تعلیمات اور اسلامی تاریخ پر مشتمل ماہنامہ ''پیشوا'' شروع کیا اور اس کا دفتر بھی کوچہ چیلان میں قائم کیا ماہ نامہ پیشوا رسالہ ''مولوی'' کے بعد بے حد مقبول اور کثیر الاشاعت ماہنامہ مانا جاتا تھا۔ اسی زمانے میں اسلامیہ دار الاشاعت کے نام سے اسلامی دینی تاریخی کتب قرآن شریف اور یازدہ سورہ بھی شائع کئے اس ادارے سے حافظ صاحب موصوف نے ایک کتاب ''اسلامی تعلیم'' کے نام سے شائع کی جو اسلام پر ایک انسائیکلو پیڈیا کی حیثیت سے مقبول ہوئی اور جس کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہوتے رہے۔

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کے ترجمہ کا قرآن مجید اعجاز نما کے نام سے شائع کیا اور حضرت مولانا شاہ عبدالقادر محدث دہلوی کے ترجمہ کا قرآن مجید بڑے سائز پر آسان ترجمہ والے قرآن مجید کے نام سے صرف دس آنے ہدیہ رکھ کر اسے ماہنامہ پیشوا کے ذریعے ناظرین تک پہنچایا۔

حافظ صاحب موصوف سچے اور بڑے پکے قوم پرست اور محب وطن تھے ۱۸۵۷ء کے حالات نے انہیں انگریزی سامراج اور اس کے حمایتوں کا دشمن بنا دیا تھا چنانچہ دہلی کے ایک خان بہادر عبدالاحد جو انگریزوں کے زبردست حامی سمجھے جاتے تھے جب ان کا انتقال ہوا اور جنازے کا جلوس مسلمانوں کے قبرستان میں لے جایا جارہا تھا تو حافظ صاحب نے اپنے ایک گہرے دوست مولانا عبداللہ آٹے والے کے ساتھ جنازے کے جلوس کو روکنے کی کوشش کی اور مغلوب الغضب ہوکر مسلمانوں کے قبرستان میں ان کی تدفین پر سخت احتجاج کیا پولیس نے دونوں کو گرفتار کر کے جیل بھجوادیا۔ جب جیل سے رہا ہوکر آئے تو فرنگی سرکار کے خلاف اور زیادہ مشتعل ہوگئے اور ہندوستان کی جنگِ آزادی کی تحریکوں کی مکمل حمایت کرتے رہے۔

اپنا ایک ہفت روزہ اخبار ''حریت'' بھی شائع کرنا شروع کردیا جس کے سرورق پر ترنگا جھنڈا اور درمیان میں آزاد ہند کے الفاظ ثبت ہوتے تھے حافظ صاحب حریت میں اپنی تحریروں کی تلخی سے اچھے اچھوں کا منہ کا مزہ خراب کردیا کرتے تھے خصوصاً اس زمانے کے مسلم لیگ لیڈروں کا۔ وہ مسلم لیگ کی سیاست کے سب سے بڑے مخالف تھے۔

پاکستان کی تجویز کی انہوں نے سینہ سپر ہوکر مخالفت کی اور اس سلسلہ میں مخالف شر پسندوں کی گالیاں اور دھمکیاں سنتے سنتے جب تنگ آگئے تو انہوں نے ہفت روزہ ''حریت'' کا ایک گالی

Marfat.com

نمبر شائع کیا جس میں تقریباً سات سو اچھوتی اور من گھڑت نت نئی گالیاں جواباً ان لوگوں کو دیں جو قوم پرست اور محب وطن مسلمان کو مطعون کرنے کے لئے دیا کرتے تھے گالی نمبر بقائی صاحب کا عدیم المثال کارنامہ تھا جس پر انہیں خود بہت ناز تھا۔

برطانوی حکومت کے دور میں داروغہ صفائی سے لے کر برطانوی وزیراعظم مسٹر چرچل تک کے خلاف اپنا زور قلم صرف کر دیا کرتے تھے اور پھر انہیں تحریروں کے تراشے متعلقہ حضرات کو ڈاک سے بھجوا دیا کرتے تھے۔

بے خوف اور نڈر بلا کے تھے ایک مرتبہ جامع مسجد کے صحن میں ایک جلسہ ہو رہا تھا اور مرحوم امام سید احمد کے خلاف تقریریں ہو رہی تھیں بقائی صاحب اس وقت بڑے امام صاحب کے مدّاح تھے۔ چنانچہ اپنے ایک ساتھی پہلوان اسماعیل غوری کو لے کر جلسہ میں جا دھمکے اور تقریر کرنے والوں کے خلاف کھڑے ہو کر غصہ میں انہیں لعن طعن کی تو مجمع میں سے کچھ لوگ ان پر ٹوٹ پڑے بقائی صاحب اپنے ہاتھ میں جو بیت رکھتے تھے اس میں گپتی تلوار ہوتی تھی چنانچہ اپنے دفاع میں انہوں نے گپتی کھینچ لی اور لہراتے ہوئے امام صاحب کے حجرے کی طرف پہنچ گئے جہاں انہیں اور پہلوان غوری کو امام صاحب نے حجرے میں بند کر لیا اور بھرے ہوئے مجمع سے ان کی جان بچائی۔

حافظ صاحب موصوف کی زندگی کے بہت سے پہلو تھے جہاں وہ ایک صحافی کٹر قوم پرست اور سماج میں اصلاح کرنے والوں میں اپنا ایک مقام رکھتے تھے وہیں معاشرہ میں ان کی مہمان نوازی علمائے دیوبند سے عقیدت اور علمائے سُو سے نفرت بھی قابل ذکر ہے خود کھانے پکانے کے شوقین اور پھر دعوتیں کرنا اور ان دعوتوں میں مجاہد ملّت مولانا حفظ الرحمٰن مفکّر ملّت حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن قاضی سجاد حسین صاحب صدر مدرسہ عالیہ فتح پوری اور سبحان الہند حضرت مولانا احمد سعید کو تو اکثر اپنے دفتر میں بلا کر دتی کے کھانے دسترخوان پر چنا کرتے تھے۔

ایک مرتبہ جب سہراب مودی نے سکندر اعظم فلم بنائی تو وہ اس کے افتتاح پر اپنی اہلیہ مہتاب کو لے کر آئے تو بقائی صاحب نے ان کو اپنے ہاتھ کے دتی کے کھانے کھلانے کے لئے دفتر میں مدعو کیا۔

گو کہ بقائی صاحب حضرت خواجہ باقی باللہؒ کی درگاہ کے اس وقت سجادہ نشین تھے لیکن علمائے دیوبند سے خصوصاً وہ علماء جو ہندوستان کی تحریک آزادی میں حصہ لے رہے تھے ان سے

Marfat.com

بہت متاثر تھے لیکن ان علماء سے جو علمائے سو کے نام سے پہچانے جاتے تھے سخت مخالف تھے اور انہوں نے ماہنامہ پیشوا کا علمائے سو نمبر بھی نکالا تھا یہ خاص ایڈیشن بھی اردو صحافت میں اپنی مثال آپ ہی تھا۔

جہاں قومی معاملات میں وہ اپنے نظریات دوقومی تھیوری سے الگ رکھتے تھے وہیں سماج میں روزمرہ کی پھیلتی ہوئی برائیوں اور بدعنوانیوں کے خلاف بھی تھے شہری مسائل میں صفائی اور امن وقانون کی پوری حفاظت ہو اس کے لئے میونسپل کمیٹی اور دلی انتظامیہ کو اپنے اخبار کے ذریعہ للکارا کرتے تھے اور افسران کو متوجہ کرنے کے لئے اردو بازار کا نام گندگی کی وجہ سے ''سنڈاس بازار'' رکھ دیا تھا تا کہ میونسپل کمیٹی کے صفائی عملہ کو جھنجوڑا جا سکے۔

مرحوم بقائی صاحب کی زندگی کا لطیفہ جو میری موجودگی میں ہوا وہ ناقابل فراموش تو ہے ہی لیکن ایک سردار صاحب کی ذہنی کاوش اور حاضر جوابی کا ایک شاہکار بھی ہے۔

ایک دن مولانا عبداللہ فاروقی مرحوم ایڈیٹر ''محشر خیال'' و'' خاتونِ مشرق'' پنجاب کے مشہور مجاہد آزادی سردار جواہر سنگھ کے ساتھ بقائی صاحب کے دفتر میں تشریف لائے۔ بقائی صاحب نے اس زمانے میں ایک کتاب بہت کم صفحات کی امرائے ہنود کے نام سے شائع کی تھی سرورق پر مصنف کا نام اس طرح لکھا تھا۔

''از... سیف الحق حافظ سیّد عزیز حسن بقائی ایڈیٹر پیشوا حریت آزاد ہند آرٹ وسجادہ نشین و متولی درگاہ حضرت خواجہ باقی باللہ فانی فاللہ گلستان اردو بازار جامع مسجد دلی''۔

بقائی صاحب نے یہ کتاب '' امرائے ہندو'' سردار جواہر سنگھ کو پیش کی جو اردو جانتے تھے جب انہوں نے مندرجہ بالا عبارت مصنف کے نام کی پڑھی تو برجستہ کہا کتاب اتنی چھوٹی سی ہے اسے اتنے سارے آدمیوں نے مل کر لکھا ہے اس پر بقائی صاحب ایک منٹ کے لئے جز بز ہو گئے اور ان سے جواب نہ بن پڑا۔ یہ حالات زندگی بہت مختصر اور بڑی احتیاط سے لکھے گئے ہیں۔

مرحوم حافظ سید عزیز حسن بقائی ایک ایسی شخصیت تھے جن کا نام زبان زد خاص وعام رہتا تھا جہاں وہ اردو، اسلام اور سماج کی خدمت کرتے تھے ان کی زندگی کا ایک پہلو بے تکلف دوستوں میں بیٹھ کر دلی کی پھکڑ زبان میں گالیاں دینا بھی تھا اور اس کے وہ مقابلے بھی منعقد کیا کرتے تھے آہ! اس دار فانی سے ۱۱/اپریل ۱۹۵۷ء مطابق ۱۱/رمضان المبارک ۱۳۷۶ھ کو رخصت ہو گئے۔

حافظ صاحب موصوف کے حالاتِ زندگی میں ان کی تصانیف تالیف کا ذکر نہ کیا جائے تو یہ تذکرہ

Marfat.com

نامکمل سمجھا جائے گا اس لئے مختصر طور پر ان کی کتابوں کے نام حاضر ہیں:

حالات علی برادران، سیرت باقی، اسلام کے سورما سپاہی حسین، زینت کبریٰ، سیّدہ کا لال، کربلا کے بعد، شاہی باورچی خانہ، تعلیم خانہ داری، گھر والی کی تربیت، بچی کی استانی، عام فہم قاعدہ، عالم گیر غازی، محمود غزنوی، درس معاشرت، پنجتن پاک، مشاہیر اسلام، فقرائے اسلام، خاتونِ جنت، آلِ رسول، بارہ امام، مجدد الف ثانی سالکانی طریقت، خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ، خواجہ غریب نوازؒ، محبوبِ الٰہیؒ، تاریخ اسلام، امرائے ہنود، اردو کی پہلی کتاب، اردو کی دوسری کتاب، اردو کی تیسری کتاب، اردو کی چوتھی کتاب، شب عروسی، عورت، لذت شباب، دوشیزہ کی ڈائری، برتھ کنٹرول، انسانیت زندہ ہے، شعلے، وغیرہ وغیرہ۔

ان کتب کے علاوہ اسلامی کتاب میں انتخاب صحاح ستہ، تجرید بخاری شریف، مشکوٰۃ شریف کامل اردو، ترمذی شریف کامل، خلفائے راشدین، مسلم شریف کامل اردو، اسلامی تعلیم (انسائیکلوپیڈیا آف اسلام) جیسی مؤقر کتب بھی اپنے ادارے سے شائع فرماتے رہے۔

☆☆☆

Marfat.com

سیدہ سیدین

صالحہ عابد حسین

کھلتا ہوا گندمی رنگ کھڑا ناک نقشہ عینک کے پیچھے دو چمکدار آنکھیں ہونٹ پر ایک نمایاں تل۔ گھر میں غرارہ۔ جلسوں میں ساری۔ کبھی جاڑے کی دھوپ میں باہر بیٹھی چھوٹی میز پر لکھ رہی ہیں۔ کبھی نوکروں سے الجھ رہی ہیں، کبھی اپنے صحن میں بہترین ٹی روز یز کی کانٹ چھانٹ کر رہی ہیں۔ کبھی کسی پڑوسن کے گھریلو جھگڑوں کی داستان بہت ہمدردی سے سن رہی ہیں، کبھی کسی بور کو انتہائی صبر سے نواز رہی ہیں۔ مہینے کی پہلی تاریخ کو پابندی سے پرانے ملازموں، غریب عزیزوں اور ضرورت مندوں کو منی آرڈر روانہ کر رہی ہیں۔ یہ تھیں صالحہ عابد حسین پچاس سے زیادہ کتابوں کی مصنفہ، ایک بہت وسیع خاندان کی محور جامعہ کی محبوب ہستی۔ صالحہ اپنے والدین کی آخری اولاد تھیں۔ پانی پت میں ۱۸ اگست ۱۹۱۳، رمضان المبارک کی پندرہ تاریخ کو پیدا ہوئیں۔ بقول ان کے کہ لوگ بچی کو دیکھ کر دم بخود رہ گئے کہ اتنے حسین ماں باپ کی بچی اور اتنی کالی سوکھی اور مریل۔ پھوپی اماں بولیں" پیٹ کی کھرچن دیگ کی کھرچن کی طرح سلونی ہوتی ہے۔ شاید کھرچن جل گئی!" دو سال کی تھیں کہ والد خواجہ غلام الثقلین کا انتقال ہو گیا۔ دو بھائی خواجہ غلام السیدین اور خواجہ اظہر مبارک اور دو بہنیں مختار فاطمہ اور سیدہ خاتون کے ساتھ ساتھ شفیق ماں اور چچا خواجہ غلام السبطین کے زیر سایہ پرورش پائی۔

ماں کا نام مشتاق فاطمہ تو بیٹی کا نام مصداق فاطمہ رکھا گیا۔ مگر اسکول میں کرسچن استانی نے یہ سمجھا کہ والد کا نام" مسٹر داق ہے" اور بیٹی" مس داق" تو ماں کے مشورہ سے اپنا نام صالحہ خاتون بتانا شروع کیا اور اسی نام سے ادبی دنیا میں شہرت حاصل کی۔

صالحہ عابد حسین کا بچپن چھوٹے سے قصبے میں گزرا مگر اس میں بھی تحریک آزادی کا کچھ کچھ

اثر پہنچ چکا تھا۔اپنی سوانح میں لکھتی ہیں۔'' کھدر، چرخا، سوت کاتنے کا شوق ہمارے گھرانوں میں رواج پانے لگا۔ پرانے چرخے نکال کر تیل وغیرہ دیئے گئے۔نو جوان لڑکیوں نے نئے نئے رنگین چرخے بنوائے۔تکلیاں منگوائی گئیں اور سبھی نے سوت کاتنا شروع کر دیا۔ایک دفعہ بی اماں پانی پت آئی تھیں اور جلسہ بھی ہوا تھا۔مگر ہم بچے جلسے میں نہیں جا پائے۔مگر انجانے میں قومی تحریک کا جو بیج دل میں بو گیا تھا اور گاندھی جی، مولانا محمد علی، بی اماں اور مولانا آزاد کے ناموں سے جو لگاؤ تھا وہ کم ہونے کی جگہ بڑھتا گیا یہاں تک کہ ایک تناور درخت بن گیا۔''

۱۹۲۲ء میں پہلا سفر عراق کا کیا۔پھر تو زندگی بھر دنیا کے بیشتر ممالک کی سیر کی۔حج سے لے کر یوروپ امریکہ تک۔اور ہندوستان کا طول وعرض ناپ ڈالا ۷/اپریل ۱۹۳۳ء بروز بقرعید صالحہ خاتون کا نکاح ڈاکٹر عابد حسین سے ہوا عابد صاحب جامعہ سے چالیس آدمیوں کی ایک مختصر سی بارات لے کر آئے۔ان دنوں ڈاکٹر اقبال دہلی آئے ہوئے تھے۔عابد صاحب نے انہیں اپنی شادی میں چلنے کے لئے مدعو کیا۔'' صبح ہمارے ساتھ چلئے نکاح میں شریک ہو کر واپس ہو جائیے گا'' اقبال مسکرائے'' ارے میاں یہ سب زحمت تو وہ جھیلے جس کی اپنی شادی ہو۔''

شادی کی تیرہویں سالگرہ پر ایک مضمون لکھ کر انہوں نے عابد صاحب کو پیش کیا۔اور چودہویں پر عابد صاحب نے انہیں۔عابد صاحب کا مضمون تھا'' اسیری کے چودہ برس''۔شیخ سعدی کے ایک شعر میں تھوڑی سی ترمیم کر کے پہلے مصرعہ سے عیسوی سال اور دوسرے مصرعہ سے ہجری سال نکالا۔

زن نیک وخوب وخوش وپارسا
کند باشد مرد درویش را

کہا کرتے تھے آپ نے سچ مچ مرد درویش کو بادشاہ بنا دیا۔مضمون میں لکھتے ہیں'' نئی دلہن کی صورت اور سیرت مجھے دل سے پسند آئی۔وہ ایک خوش ادا دلکش سچی کھری صاف باطنی صاف گو زندہ دل ہنس مکھ سلیقہ شعار فرض شناس ملنسار اور محبت کرنے والی لڑکی ہے۔میں نے دیکھا کہ مصداق میں خوش خلقی اور خوش مزاجی کے ساتھ میری طرح خودداری زود حسی ضد اور مجھ سے بھی زیادہ تیز مزاجی ہے۔اور یہ سمجھ لیا کہ اس آہوئے وحشی کو رام کرنے کے لئے بڑی احتیاط سے کام لینے کی ضرورت ہے۔

پانی پت کے لڑکیوں کے اسکول میں کچھ دن پڑھا پھر مڈل کا امتحان پنجاب یونی ورسٹی سے

دیا اور فرسٹ کلاس میں پاس ہوئیں۔شادی کے بعد پھر پنجاب یونی ورسٹی سے ادیب فاضل کا امتحان خاص امتیاز سے پاس کیا۔ لکھنے کا شوق بقول ان کے شاید آٹھ سال کی عمر ہوگی جب کے بزعم خود باقاعدہ مضمون نگاری شروع کردی۔ مضمون کہانیاں اور نظمیں لکھتیں اور بھائی بہنوں کے مذاق اڑانے کے خوف سے ایک لٹھے کی تھیلی میں رکھ کر لوہے کی صندوقچی میں رکھتی جاتیں۔ مزید احتیاط کے طور پر تھیلی پر جلی حروف میں 'خفیہ تھیلی بھی لکھ دیا۔

اتفاق سے تھیلی میں ''ی'' کے نقطے دینارہ گئے تھے۔ ایک دن آخر کار بھائی بہنوں نے صندوقچے کو کھوج کر نکالا اور خفیہ تھیلی چرائی۔ پھر اسے ''خفیہ تھیلی'' کہہ کر خوب نچایا۔ اور مذاق اڑایا لکھتی ہیں صد حیف کہ اب وہ پیارے دوست اور ساتھی اور بھائی اور بہن دوسری دنیا کو سدھار چکے ہیں۔ آگے کہتی ہیں ''تو اس طرح ہمارے لکھنے کی ابتداء ہوئی۔ آج پینسٹھ سال کی عمر تک اس شوقِ فضول اور جراءت رندانہ نے ساتھ نہیں چھوڑا۔''

خانہ داری اور انشا پردازی میں بقول عابد صاحب مصداق نے جتنی کامیابی حاصل کی تھی معاشرتی زندگی میں اس سے بھی زیادہ حاصل کر لی اپنے میکے سسرال میں اپنے اور عابد صاحب کے دوستوں کے حلقے میں جامعہ کے لوگوں میں اپنے خلوص اور ہمدردی اپنی ملنساری اور وضع داری کا سکہ بٹھا دیا۔

محمد یحییٰ تنہا جو خاصے مشہور نقاد تھے ایک بار عابد صاحب سے کہنے لگے صالحہ بی بی کو آپ ہی لکھ کر دیتے ہیں نا۔ عابد صاحب بولے بہت خوب میں کیوں لکھتا۔ وہ خود لکھتی ہیں۔'' بے ساختہ جواب دیا ''تو پھر معاف کیجئے گا آپ سے اچھا لکھتی ہیں۔

اردو ادب میں وہ صالحہ عابد حسین کے نام سے شہرت پا چکی تھیں۔ مگر لوگوں نے شروع شروع میں شک کیا کہ واقعی صالحہ خود لکھتی ہیں یا ڈاکٹر صاحب لکھ کر دیتے ہیں۔ مگر دونوں کا Style اس قدر مختلف تھا کہ کوئی کند ذہن بھی اس بات کو باور نہیں کر سکتا تھا۔ جامعہ میں صالحہ نے برقعہ میں رہ کر ہر طرح کی Activities شروع کیں۔ ''سہیلی سبھا بنائی'' یہ عورتوں کی انجمن تھی جس میں جلسے ہوتے۔ ادبی اور مذہبی موضوعات پر مضمون پڑھے جاتے پکنک ہوتی۔ فوٹو گرافی کا شوق بھی برقعہ میں رہ کر پورا کیا اور بقول ان کے کشمیر میں تین ٹانگوں کے کیمروں سے سینکڑوں تصویریں لے ڈالیں۔ جس چیز کو دل چاہا بے خوف کیا۔ چاہے بچیوں کو لے کر فلم دیکھنے جانا ہو۔ یا ڈرامے میں پارٹ لینا ہو۔ بچپن میں بھائی بہنوں نے مل کر جو ڈراما کلب بنایا تھا اس میں بزرگوں

Marfat.com

سے چھپ کر برقعہ اوڑھ کر مجاہد کی بہن کا رول کیا۔ خواجہ احمد عباس جو مرد مجاہد بنے انہوں نے بہن کو اسلام پر قربان کر دیا بس یہی شوق جامعہ میں آ کر میچور ہوا اور ان کے لکھے اور ڈائریکٹ کئے ڈرامے جامعہ کی محفلوں کی جان بن گئے۔

۱۹۳۴ء میں صالحہ ماں بنیں مگر بچی پیدا ہوتے ہی خدا کو پیاری ہوگئی پھر ان کے کوئی اولاد نہیں ہوئی جس کا انہیں بے حد رنج رہا مگر بھائی بہنوں کے ننداور دیور کے بچوں سے اس قدر محبت کی اور اس قدر محبت پائی کہ اولاد والے شاید ہی پاتے ہیں۔

بچپن میں والدہ سے افضل علی کا ''گودڑ کا لال'' پڑھا تھا اور اس کی ہیروئن ثریا کو اپنا آئڈیل بنایا تھا۔ مگر لکھتی ہیں کہ کبھی حاشیہ خیال میں نہ آیا کہ لاشعوری طور سے مہر جبیں کو آئڈیل تسلیم کر لیا تھا۔ مہر جبیں جو یوسف کی دوسری بیوی تھی جس نے اس کی پہلی بیوی سے خود اپنے تعلقات استوار کئے تھے اور بہت محبت اور احترام کا سلوک کیا تھا۔

عابد صاحب کی پہلی بیوی اور اپنے رشتے کو معجزہ کہتی تھیں۔ واقعی تھا بھی معجزہ۔ کیسے رفتہ رفتہ ان کے مزاج کو سمجھا اور ان کو بڑی بہن کا درجہ دیا۔ لکھتی ہیں'' وہ کھری سچی مخلص صاف گو محبت کرنے والی اور انصاف پسند عورت تھیں۔ اولاد کی محرومی کا ان کے دل پر کتنا گہرا داغ تھا۔ اس کا کوئی بھی اندازہ نہیں لگا سکا۔ ایک بار برسوں پہلے انہوں نے مجھ سے ایک جملہ کہا تھا'' بدنصیب ہم ہی ہیں بیٹا۔ کاش بیٹی زندہ رہتی ہم اس کو اپنا کہہ سکتے۔ وہ کچھ اور نہ کہہ سکیں اور رونے لگیں اس دن مجھے پورا احساس ہوا اس دکھ کا جو انہیں تھا۔ دور کے اس رشتے نے جو میرے اور ان کے درمیان تھا ہمیں اور زیادہ قریب کر دیا۔ قرآن شریف وہ ہمیشہ اردو ترجمے اور تفسیر کے ساتھ پڑھتیں۔ انہیں مولانا آزاد کا ترجمان القرآن بہت پسند تھا جس پر مولانا نے اپنے ہاتھ سے لکھ کر انہیں تحفہ میں دیا تھا۔ اکثر ہم سے کہا کرتی تھیں کہ مذہب صرف بندھے ٹکے طریقوں سے عبادت کرنے کا نام نہیں ہے بلکہ مذہب اور خاص طور سے اسلام تو زندگی گزارنے کا طریقہ ہے۔ یعنی ہم جو کام بھی کریں وہ مذہب کے مطابق ہو مجلس ہو یا میلاد۔ عورتوں سے کھچا کھچ بھرے کمرے میں وہ سامنے بیٹھ کر ایک نظر محفل پر ڈالتیں پھر اپنے مخصوص انداز میں ذکر شروع کرتیں جس میں واقعات کے ساتھ ایک بہت نمایاں اصلاحی پہلو بھی ہوتا تھا جس کی وراثت ان کو اپنے پرنانا مولانا حالی اور والد خواجہ غلام الثقلین سے ملی تھی۔ اپنے فن کا محاسبہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں میں نے ہلدی کی گرہ لے کر پنساری کی دوکان نہیں کھولی۔ میں نے دس بارہ کتابیں شائع ہونے تک

Marfat.com

اپنے آپ کو فنکار کہنے کی جراءت نہیں کی۔ میں نے پہلے بھی اور اب اور بھی اپنے فن کا محاسبہ کیا ہے۔ میں یہ سمجھتی ہوں کہ اگر میرا دل اور زیادہ سخت ہوتا تو اپنی کہانیوں میں اور زیادہ کتر بیونت کر سکتی اپنے ناول کے کرداروں سے اور سختی سے نمٹ لیتی تو وہ فنی لحاظ سے بہتر ہوتے۔ اپنے فن پر کڑی نظر رکھتے ہوئے اپنے فلسفہ زندگی کا جواز دیتی ہیں مگر کبھی Self Importance کا شعار نہیں بنتیں اپنے بارے میں لکھتی ہیں کہ اب کئی سالوں سے میں اردو ریسرچ اسکالرز کا موضوع سخن بنی ہوئی ہوں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ میں ابھی زندہ ہوں میری کتابیں مل جاتیں ہیں۔ مجھ سے ملا جا سکتا ہے اور طالب علم کو بہت زیادہ بھاگ دوڑ نہیں کرنی پڑتی۔ اب یہ تو ہم جانتے ہیں کہ ان پر ریسرچ کیوں کی جاتی تھی اور کیوں کی جا رہی ہے ان کے یہ کہنے سے کیا ہوتا ہے۔

☆☆☆

Marfat.com

شیخ عبدالحق پراچہ

پیدائش ۱۱ر دسمبر ۱۹۱۱ کوچہ پندری (کوچہ استاد داغ) چاندنی چوک، دہلی۔
وفات ۸ر دسمبر ۱۹۷۹ کراچی، پاکستان۔

والد کا نام شیخ فضل الحق پراچہ

آٹھویں کلاس تک اردو کی باقاعدہ تعلیم اور اپنی محنت اور مطالعہ سے پنجاب یونیورسٹی سے ادیب فاضل۔

اکاؤنٹ کے کام کی مہارت... سبحان الہند مولانا احمد سعید صاحب دہلوی کی مجالس خانہ اور مجالس وعظ کی پابندی سے شرکت کے سبب دینی معلومات سے بہرمند۔

قومی تحریکات سے گہرے مطالعہ اور عملی شرکت کے سبب قومی مسائل پر اور تقسیم ہند کے خلاف مضامین نگاری کا اچھا خاصا ملکہ اور تقریر پر بقدر ضرورت قدرت۔

سفید و سرخ رنگ گٹھا ہوا ڈیل، شرعی بھرواں ڈاڑھی، موٹے کھدر کے کرتے پاجامے پر موٹی شیروانی، سر پر گاندھی کیپ سردیوں میں بالوں والی ٹوپی۔

اعصاب محنت کش، چال میں تیزی لیڈری کا فطری شوق ہوش سنبھالا تو دلی کو تحریک آزادی کی سرگرمیوں کا مرکز پایا، دیوبندی مکتب فکر سے پراچہ برادری گہری عقیدت کے ساتھ وابستہ تھی اسی وجہ سے یہ برادری قومی تحریکات سے دلچسپی لیتی تھی۔

پراچہ صاحب نے ابتدائی زندگی میں کاروبار میں حصہ لیا۔ پھر تحریکات سے اتنی دلچسپی بڑھی کہ اپنے تمام شب و روز دینی اور سیاسی تحریکات کے لئے وقف کر دیئے۔ مولانا احمد سعید صاحب نے شیخ پراچہ کی ذہانت اور دلی والوں سے ان کی واقفیت اور دہلویت کے ساتھ ان کی محبت کو دیکھ کر

Marfat.com

انہیں اپنے سے اتنا قریب کرلیا کہ لوگ پراچہ صاحب کو مولانا احمد سعید کا قاصد کہنے لگے مولانا کے منجھلے لڑکے مظہر سعید اپنے والد سے ناراض رہتے تھے کیونکہ مولانا ان کی آزادی کو پسند نہیں کرتے تھے۔ مظہر سعید صاحب اپنے والد کے رفقاء کو مولانا کے نورتن کہا کرتے تھے ان میں غوری پہلوان، عبدالعزیز صدر ڈھلیا یونین، عبدالستار صاحب سکریٹری ملک یونین عبدالحمید تیلی خلیفہ عیوض (گھونسی) محمد مرزا اور عبدالحق پراچہ شامل تھے، مولانا احمد سعید صاحب واقعی بڑے نیک طبیعت کے مالک تھے۔ ترک موالات کی تحریک کے سلسلہ میں گھنٹہ گھر دلی پر گرفتاری دیتے ہوئے مفتی اعظم مولانا محمد کفایت اللہ اور مولانا عبدالحلیم صاحب صدیقی کو پولیس کی لاٹھی چارج سے بچانے میں ہلال احمد صاحب زبیری کامریڈ ایڈیٹر انصاری اخبار اور شیخ پراچہ کو سخت چوٹیں آئیں۔ پراچہ صاحب کی کلائی ٹوٹ گئی جس میں آخر عمر تک خم نظر آتا تھا اور زبیری کا سر پھٹ گیا۔

پراچہ صاحب اس عہد کی قومی جماعتوں، کانگریس، مجلس احرار اور دینی جماعت جمعیۃ العلما ہند کے ساتھ وابستہ رہے اور اپنے شب و روز انہی قومی سرگرمیوں میں صرف کئے۔

دہلی جمعیۃ العلماء کے ناظم بنا دئے گئے سٹی کانگریس کے صدر چنے گئے مجلس احرار ایک رضا کار تنظیم تھی اس سے گہری دلچسپی لیتے رہے۔

جمعیۃ العلماء اور کانگریس کے اجلاسوں اور جلوسوں کے انتظامی معاملات میں آگے آگے رہتے تھے۔

مرکزی جمعیۃ العلماء کی طرف سے ملک کے مختلف حصوں میں برپا ہونے والے فرقہ وارانہ ہنگاموں میں مظلوم مسلمانوں کی مدد کے مشن پر جاتے رہتے تھے۔ اور ان بیرونی اسفار میں حکیم سید حسین دہلوی (لال محل بستی نظام الدین) ان کے رفیق سفر رہتے تھے۔

شیخ پراچہ کی دینی سرگرمیوں اور قومی جدوجہد میں ہمہ وقتی خدمت رضا کارانہ تھی۔ ان کی اہلیہ زبیدہ بیگم مشرقی خواتین کی طرح اپنی آنکھوں کا تیل نکال کر گھر کا خرچہ چلاتی تھیں۔ ان کے گھر میں خاندانی کام ٹوپیاں بنانے کا ہوتا تھا۔ وہ خاتون اسے سنبھالتی تھیں۔ شیخ صاحب جب کبھی وقت ملتا تو گھر جا کر اس کام کی دیکھ بھال کرلیا کرتے تھے۔

باپ کی لاپرواہی کے نتیجہ میں اکثر اولاد بے پرواہ ہو جاتی ہے مگر ایک خاندانی اثرات اور دوسرے خاندانی ماں، قناعت شعار و صابرہ۔ کی تربیت نے پراچہ صاحب کے سات لڑکوں اور لڑکیوں کو شرفاء بنا کر پروان چڑھایا۔

ان کے صاحبزادے سراج پراچہ اور نذیر پراچہ اور منظور پراچہ معقول کاروباری زندگی میں مشغول ہیں۔

پراچہ صاحب کو سیاسی مسائل پر لکھنے کا شوق تھا۔ کتابوں اور اخبارات کا مطالعہ بھی وہ بڑے انہماک سے کرتے تھے۔

مضامین نویسی کے شوق کو اپنی غریب معاشی زندگی کے باوجود پورا کرنے کے لئے پراچہ صاحب نے ایک ادبی رسالہ جمیل کے نام سے جاری کیا جس کی ادارت علامہ اخلاق حسین دہلویؒ کرتے تھے اور اس کے سرپرست پنڈت برج موہن دتاتریہ تھے۔

شیخ صاحب نے جمعیۃ العلماء ہند کی تاریخ میں کئی قسطوں میں مضامین لکھے تھے جو الجمعیۃ اخبار میں شائع ہوئے تھے، مگر اس اخبارات کے پرانے فائلوں کے ساتھ جو بے اعتنائی برتی گئی وہ افسوس ناک ہے۔ پرانے فائل دیمک کی نذر ہو گئے اور پراچہ صاحب کے وہ محنت سے لکھے ہوئے مضامین ضائع ہو گئے۔

شیخ صاحب مسلم نوجوانوں کو قومی سرگرمیوں میں شریک کرنے کی بڑی جدوجہد کرتے تھے اور جب راقم السطور (اخلاق حسین) کی صدارت (جمعیۃ العلماء دہلی) میں دلّی جمعیۃ العلماء کے ناظم تھے تو دلّی کے کئی تعلیم یافتہ نوجوانوں کو جمعیۃ العلماء کے کاموں میں شریک کیا تھا جو آج تک قومی سرگرمیوں میں شریک ہیں۔

پراچہ صاحب کا تعلق دلّی کانگریس کے لالہ گروپ سے تھا، اس گروپ کے لیڈر لالہ شام ناتھ جی تھے۔

لالہ جی پراچہ صاحب سے بڑا تعلق رکھتے تھے۔ اور الیکشن (پارلیمنٹ) میں مسلم علاقوں کے انچارج کی حیثیت سے انہیں مقرر کرتے تھے۔

۱۹۴۷ء کے انقلابی حالات میں شیخ صاحب پراچہ اور حکیم سید حسین صاحب دہلوی دونوں ایک جان اور دو قالب بن کر مسلمانوں کے امدادی کاموں میں سرگرم رہتے تھے۔

دلّی کے قریب مولا جاٹوں (نومسلم جاٹوں) کی آبادی نجف گڑھ کے علاقہ میں سکونت رکھتی تھی۔ انقلاب میں ان پر دباؤ ڈال کر دوبارہ ہندو بنا دیا گیا۔ اور نجف گڑھ کی مسجدوں کی عبادت سے محروم کر دیا گیا۔

پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی معتمد خاص مسز مردولا بین (گجرات) کو مسلم عورتوں کی

Marfat.com

بازیابی، مقبوضہ مساجد کے انخلاء اور مرتد مسلمانوں کی بحالی کے کاموں کا انچارج بنادیا تھا۔

گاندھی جی کے خاص چیلے پنڈت سندر لال جی (کھتولی) اس قسم کے امدادی کاموں میں جمعیۃ العلماء کے کارکنوں کے ساتھ تعاون کرتے تھے۔

نجف گڑھ میں مساجد کھلوانے، مولا جاٹوں کو دوبارہ اسلام میں داخل کرنے کی مہم میں جمعیۃ العلماء کی طرف سے حکیم سید حسین دہلوی اور شیخ پراچہ مقرر تھے۔

اس مہم میں ان دونوں صاحبان نے پوری لگن کے ساتھ کام کیا، پنڈت جی نے اپنے ہاتھ سے مولا جاٹوں کی چوٹیاں کاٹیں۔

حکیم سید حسین صاحب نے اپنے چھوٹے بھائی سید محمد حسین صاحب کو نجف گڑھ کی جامع مسجد میں بطور امام و معلم مقرر کرلیا۔

محمد حسین صاحب نے بڑی استقامت کے ساتھ یہ فرض انجام دیا اور اپنے بڑے بھائی علامہ اخلاق حسین دہلوی کی وفات کے بعد اپنے خاندان کی دیکھ بھال کے لئے لال محل نظام الدین میں قیام کیا۔

حکیم سید حسین صاحب اور پراچہ صاحب نے راجستھان کے مسلم اوقاف کی حفاظت کے لئے مسلمانوں کی قانونی امداد میں بڑی محنت سے کام کیا۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب حکیم صاحب کی خدمات کی بڑی تعریف کرتے تھے۔

میں نے راجستھان کے تبلیغی دورہ میں حکیم صاحب کے وسیع تعلقات کو محسوس کیا حکیم صاحب کے اثر سے پیرزادہ تقدس حسینی صاحب مرحوم نے حضرت خواجہ کی یوم ولادت کے اجتماع میں اس ناچیز کو تقریر کے لئے دعوت دی اور میں پہلا دیوبند مکتب فکر کا مقرر واعظ تھا جس نے درگاہ کے تاریخی دالان (بیگمی دالان) میں کھڑے ہوکر پیرزادگان اور اجمیر شریف کے زعماء میں حضرت خواجہ صاحب کی روحانی عظمت پر اظہار خیال کیا۔

پھر اس کے بعد میں نے کئی تبلیغی سفر حکیم صاحب کی رفاقت میں اجمیر شریف اور جے پور کے کئے۔

بڑے بھائی علامہ اخلاق دہلوی علمی فضیلت کے ساتھ آل نبوت کی سیادت کا اور فقرِ حیدری کا روشن نمونہ تھے اور حکیم صاحب کا دوسرا رنگ تھا۔ ان میں سماجی میل جول قائم کرنے کی بڑی صلاحیت تھی، جے پور اور اجمیر کے خاندانی شرفاء انہیں اپنے گھر کا فرد سمجھ کر اپنے پاس ٹھہراتے

Marfat.com

تھے۔ حکیم صاحب لاولد تھے، مگر انہوں نے اپنے دونوں بھائیوں کی اولاد کو اپنی اولاد سمجھا حکیم صاحب آخری عمر میں ایک ایکسیڈنٹ میں زخمی ہو گئے تھے اور مرحوم کی کوہنی کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔

یہ بیماری غیر متوقع طور پر طویل ہو گئی، حکیم صاحب کے بھتیجوں اور بھتیجیوں نے ان کی وہ خدمت کی کہ حق ادا کر دیا۔

حکیم صاحب مولانا اسعد مدنی صاحب کی عیادت کے لئے ولنگڈن ہسپتال جا رہے تھے کہ سڑک پھلانگتے ہوئے اسکوٹر کی چپیٹ میں آ گئے اسی ابتلاء میں وفات پا گئے۔

حکیم صاحب کی وفات سے مدرسہ حسین بخش جامع مسجد (جہاں میں وعظ کہتا ہوں) کی مجلس سونی ہو گئی، مرحوم نماز جمعہ تو جامع مسجد میں ادا کرتے مگر نماز کے بعد میری مجلسِ وعظ میں شریک ہوتے اور اس کے بعد چائے پانی کی مجلس کو اپنی باتوں سے بہرمند کرتے۔

اس مجلس میں مولانا احمد سعید کے نورتن جمع ہوتے تھے، جو آہستہ آہستہ خدا کو پیارے ہو گئے۔ صرف ایک محمد مرزا صاحب حیات ہیں۔ جو میم افضل صاحب کے ممیا سسر ہوتے ہیں۔

شیخ پراچہ کے ساتھ حکیم صاحب کا جو خاص تعلق رہا اس کا تقاضا تھا کہ میں پراچہ صاحب کے تذکرہ میں ان کا ذکر خیر کروں۔

شیخ پراچہ اور حکیم سید حسین دونوں میں دہلویت کی عصبیت کارفرما تھی اور اس دہلویت پر فخر و ناز یوپی والوں کو بہت کھٹکتا تھا اور ۱۹۴۷ کے بعد دلی والوں کا مکھن پاکستان چلا گیا تھا اور دلی کے ہر شعبہ پر یاران طریقت قابض ہو گئے تھے۔

یہ زوال دراصل اوروں کی طرح انہیں بھی پریشان کرتا تھا۔ علماء کے طبقہ میں اس احساس کا ایک سبب یہ تھا کہ جمعیۃ العلماء ہند کے صدر اور ناظم کی تبدیلی کچھ ایسے انداز میں ہوئی تھی کہ جیسے یوپی والوں کو دلی پر فتح حاصل ہوئی ہے۔

شیخ صاحب جمعیۃ علماء ہند کے دہلوی گروپ مولانا احمد سعید، مولانا عبدالماجد سے تعلق رکھتے تھے اور ان کے دل میں اس بات کی لگن تھی کہ دلی کے مولوی تیار ہوں اور دلی یوپی والوں کے غلبہ سے محفوظ رہے۔

چنانچہ جب یہ ناچیز دارالعلوم دیوبند سے پڑھ کر آیا اور جمعیۃ العلماء کے ساتھ تعلق کے سبب جماعتی سرگرمیوں میں شریک ہوا تو مرحوم اس طالب علم (اخلاق حسین قاسمی) کو بڑے بڑے جلسوں میں تقریر کرنے کھڑا کر دیا کرتے تھے، حالانکہ میں ابھی اس قابل نہ تھا کہ بڑی اجتماعات

Marfat.com

میں بولنے کے لئے مائک پر آؤں۔

مرکزی جمعیۃ علماء ہند کے اکابر (یوپی گروپ) سے تعلق رکھتے تھے۔ مگر مولانا حفظ الرحمٰن صاحب دلّی یوپی کی چپقلش سے پاک دماغ رکھتے تھے، وہ پراچہ صاحب کے کام کی قدر کرتے تھے اور انہیں مرکزی جمعیۃ کے کام سونپتے تھے، جبکہ یوپی سے تعلق رکھنے والے دفتر کے ملازم پراچہ صاحب سے گھبراتے تھے۔

مرحوم پراچہ صاحب کا تعلق مشتاق احمد صاحب سے بھی بڑا قریبی رہا، صبح کو سید صاحب اپنے دفتر میں بیٹھتے تھے۔ پراچہ صاحب میر صاحب کے کمرہ پر پابندی سے جاتے تھے اور میر صاحب اُن سے شہر کے کام لیتے تھے۔

دلّی وقف بورڈ کی تشکیل ایک وقت میں اس طرح ہوتی تھی کہ شہر کے متولیوں کا ایک متولی بطور نمائندہ الیکشن لڑ کر آتا تھا۔

اس الیکشن میں شیخ پراچہ اور سید عزیز حسن بقائی مرحوم کے درمیان مقابلہ ہو گیا بڑے کانٹے کی یہ کشتی تھی۔

شیخ پراچہ چلنے پھرنے والے آدمی اور عوامی تعلقات کے آدمی۔ بقائی صاحب بہت بڑے کانگریسی، صحافی، لیکن بقائی صاحب الیکشن میں رہ گئے پراچہ نکل گئے۔

بقائی صاحب اور کارکنوں کا مخالف گروپ بھلا کب چین سے بیٹھ سکتا تھا۔ پراچہ کے خلاف عدالت میں رٹ دائر کر دی گئی۔ اور معاملہ کافی دنوں تک الجھا رہا میری یاد کام نہیں کر رہی کہ آخری انجام کیا ہوا۔

اس برادری کا تعلق ناچیز کی تحقیق کے مطابق پنجاب کی نومسلم برادریوں سے ہے۔

دلّی کی اکثر برادریاں اپنے آپ کو سرزمین عرب سے جوڑتی ہیں جیسے لاہوری برادری اور راعین برادری لیکن اس تعلق کا ان کے پاس کوئی تاریخی ثبوت نہیں۔

پریچنگ آف اسلام کے مصنف نے لکھا کہ حضرت بابا فرید گنج شکر کی تبلیغ و دعوت سے پنجاب کی سولہ برادریوں نے اسلام قبول کیا۔ مگر ان کی تفصیل تحریر نہیں کی۔

آخر وہ سولہ برادریاں کہاں گئیں؟

میں نے لاہور کے ایک وکیل (شیخ اسد اللہ پراچہ) سے پوچھا تھا تو انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ ہماری برادری لاہور سے تعلق رکھتی ہے اور ہمارے پڑوسی کی رہائش لاہور کے جس محلہ میں تھی

Marfat.com

وہ محلّہ اسی نام سے مشہور ہے۔

واقعات دارالحکومت نے مصنف لکھتے ہیں.....

''ملکہ کی باغ کی مغربی دیوار سے ملا ہوا داہنی طرف کوچہ قابل عطار ہے، اس میں ٹوپی والے پارچہ فروش اور پرانچے رہتے ہیں'' (حصہ دوم صفحہ ۲۳۷) دوسری جگہ یہ مصنف لکھتا ہے۔

''مسجد فرینچاس۔ کوچہ قابل عطار کے پاس ہے، پنجابی کھتری فرینچاس کہلاتے ہیں جو نو مسلم ہیں (۲۲۲)''

کوچہ قابل عطار کے پاس قدیم محلّہ گلی سیدانیاں ہے جس میں ایک مسجد ہے۔ فرینچاس نام کی کسی قوم کا کوچہ قابل عطار کے پاس پتہ نہیں چلتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کو سہو ہوا ہے اور اس نے پراچہ کو فرینچاس کر دیا ہے۔ لفظ بگڑ گیا ہے مصنف یا کاتب سے یہی برادری پنجاب کی کھتری برادری ہے۔

شاہجہاں کے عہد میں لاہور سے آنے والی برادریوں میں یہ تین برادریاں مشہور ہیں۔

لاہوری برادری، سادہ کار، راعین برادری، باغ بان اور پراچہ برادری، تاجر پارچہ۔

یہ برادری اگر عرب سے آئی ہوتی تو اسے بزاز کہا جاتا، پارچہ فارسی لفظ ہے، عربی لفظ نہیں ہے۔

ہر مسلم برادری کا اپنے آپ کو عرب سے جوڑنا یہ تاثر کر دیتا ہے کہ ہمیں سرزمین ہند کی مٹی سے اپنے آپ کو جوڑنا پسند نہیں۔

اس سرزمین کا سپوت ہونا اگر علامہ اقبال کے لئے فخر ہے تو ہم کس گنتی میں ہیں۔ اقبال کہتے ہیں۔

میرِ عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے
میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

شیخ صاحب آخر عمر میں مختلف مصائب کا شکار ہو گئے تھے، اور ان صدموں نے مرحوم کو دل کا مریض بنا دیا تھا۔ مگر دل کے دورہ کے بعد چند دن بستر پر لیٹ کر پھر کھڑے ہو جاتے تھے اور اپنی چلت پھرت شروع کر دیا کرتے تھے۔

خدا کی قدرت دیکھئے کہ جس پاکستان کی زندگی بھر مخالفت کی، مسلم لیگ والے دور سے انہیں دیکھ کر گھبرا جاتے تھے، لیگ کے جلسے میں پراچہ کے آنے پر نظر رکھی جاتی تھی اور مسلم لیگ کے رضا کاروں کو چوکنا کر دیا جاتا تھا،

Marfat.com

اسی پاکستان میں جا کر خدا کو پیارے ہو گئے۔

دلّی کے مشہور لیگی خاندان سراج الحق گوٹے والے شجاع الحق گوٹے والے کی اولاد پڑوس کے رشتہ سے ان کی بڑی عزّت کرتے تھے۔

اس خاندان کے ممتاز حضرات نے ان کے جنازہ میں شرکت کی اور کراچی کی سرزمین پر ہمیشہ کے لئے آرام کی نیند سو گئے۔

یہی وہ خاندان تھا جس سے شیخ مرحوم کی براہ راست چپقلش رہتی تھی اور یہ ایمان و اسلام کا کرشمہ ہے کہ مومن کے مردے کو دوست دشمن سب پورے احترام سے کندھا دیتے تھے۔

دلّی کے مشہور مسلم لیگی خاندان (سراج الحق گوٹے والے) کے ممتاز فرد شجاع الحق صاحب صدر مسلم لیگ کے صاحبزادے محمود الحق صاحب کو صدر ضیاء الحق نے سندھ کا چیف جسٹس بنا دیا تھا اور یہ پاکستان اسکاؤٹ کے چیرمین بھی تھے۔

عبدالحق کی وفات کے بعد محمود صاحب دلّی آئے بین الاقوامی اسکاؤٹ کا اجلاس تھا، یہ میرے بھانج داماد تھے اس وقت مجھ سے ملنے بھی آئے میں نے ان سے پراچہ صاحب کے متعلق معلوم کیا وہ بولے، ماموں جان پراچہ برادری کے بڑے چھوٹے افراد نے تو برادری کے رشتہ سے جنازہ میں شرکت کی مگر ہم لوگوں کو پرانا اختلاف یاد آ گیا۔

پراچہ صاحب سے ہمارا سیاسی اختلاف تھا مگر ایک تو دیوبندی فکر کے تعلق سے دوسرے ان کے اخلاق کے اثر سے ہم لوگ بھی بڑے عقیدت سے شریک ہوئے۔ ہم نے دیکھا تھا کہ یہ شخص اپنے سیاسی مَسلک میں کتنا مخلص تھا اسے نہ گھر بار کی فکر تھی نہ روٹی کپڑے کی رات دن علماء کرام کے ساتھ سرگرداں رہتا تھا۔

☆☆☆

Marfat.com

مسلم احمد نظامی

حاجی علی جان

ایک گوشہ نشین ضعیف العمر...مجھ جیسا کم علم...جس کی دنیا بھی الگ ہے۔جس کے سوچنے کا ڈھنگ بھی مختلف ہے اس کو ارکان کمیٹی نے ایسے کام کے لئے چنا جس کا وہ اہل کہیں سے کہیں تک نہیں۔یہ حسن ظن دراصل بزرگوں سے نسبت کا آئینہ ہے جو اپنے نام روشن کر گئے۔

مذہب اور ادب کے یہ نامور محسن تو گئے...نام ان کا باقی ہے اور رہے گا بھی ان کو ملک وملت نے بھرپور خراج عقیدت ان کی یاد کو باقی رکھ کر دیا ہے۔قبول عوام کی دولت سے وہ آج بھی مالا مال ہیں۔اتنا ضرور کیا ہے کہ کچھ حضرات نے پیشہ وارانہ تقاضوں کے تحت ان کی تصانیف کو زیور طبع سے آراستہ کیا تو ہم معترض نہیں ہوئے بلکہ ان حضرات کو بنظرِ تشکر دیکھا کیوں کہ وہ ہمارے بزرگوں کے نام کو شہرت دوام بخش رہے ہیں...اردو اکادمی بھی اسی صف میں ہے جس نے میرے والد ماجد مولوی بشیر الدین احمد مرحوم کی معرکۃ الآراء ''واقعاتِ دارالحکومت دہلی'' چھاپی۔

کہنا یہ ہے کہ ہم جس انداز سے سوچنے کے عادی ہیں یہ دلّی والوں کا اپنا منفرد جداگانہ انداز ہے بجز تشکر کے لفظ شکوہ زبان پر نہ لائیں۔حاجی علی جان مرحوم کے ورثا بھی اس دلّی میں ہیں اور اسی نام سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔عنوان مجبور کر رہا تھا.....دلّی کی وضعداری کا تقاضہ تھا کہ ان کے خاندانی حضرات کچھ تعاون کا ہاتھ بڑھاتے کچھ معلومات مہیا کرتے ..... بلا واسطہ اور بالواسطہ ان سے رابطہ قائم بھی کیا۔وعدے بھی ہوئے۔تقاضے بھی ہماری طرف سے ہوئے مگر یہ دروازے معلومات کے ہم پر بند ہی رہے .....اور ہم اندھیروں میں بھٹکتے ہوئے آپ کے سامنے حاضر ہیں.....

حاجی علی جان کے بارے میں خواجہ صالح حیات ہوتے یا حاجی سلیم زندہ ہوتے تو شاید

Marfat.com

دست گیری فرماتے مگر اسی گھرانہ کے متعدد حضرات نے تو ہم کو خالی ہاتھ ہی لوٹا دیا۔ کیوں؟ یہ وہ جانیں۔

مگر قاعدہ کلیہ سے بھی استثنا ہوتا ہے بعض دفعہ مجذوب کی بڑ کام کر جاتی ہے..... یہ ہے اس عاجز کا کھلے دل سے اقرار کہ جس شخص کو زمانہ بھلا نہ سکا اس پر قلم اٹھا ہے ایسے شخص کا جس کا مقام کچھ نہیں۔

علم داں دلّی والا کوئی ہوتا تو وہ حاجی علی جان پر اظہار خیال کرتا.....ہم تو ''من آنم کہ من دانم'' کہ تحت یہی سمجھتے ہیں کہ

قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند

اب لاج رکھ لے اللہ: حق ادا ہو جائے ہم سے۔

حاجی علی جان مرحوم کی مقدس روح سے معذرت کرتے ہوئے یہ فقیر چند کلمات پیش کر رہا ہے۔ مجلس دلّی والوں کی ہو نہ ہو تذکرہ ضرور دلّی والوں کا ہے۔ دلّی کی نامور شخصیت کا ہے جو ہر دلعزیز تھی۔ قابل تعظیم ہے جس کا نام باقی ہے جس کی حیات میں بظاہر ابدیت کی جھلک ہے...اس لئے اس علی جان پر لاکھوں سلام جس کو محبت سے اچھے علی جان کہا جاتا تھا۔

حاجی علی جان کشمیری کا نام ہم دلّی والوں کے لئے باعثِ افتخار ہے۔ اور رہے گا۔ بھیک مانگتے آؤ محنت کرو.....ایمان داری سے تو فقیر سے امیر ہو جاؤ۔ بے ایمان۔ باہر کا آنے والا بھی اپنے طور پر ایک طرز خیال کا مالک ہوتا ہے اس لئے وہ دلّی میں رہتے ہوئے اپنی زندگی کو اپنے ہی سانچوں میں ڈھالے رکھنا چاہتا ہے اور اِس کا اُس کو حق بھی ہے۔ دیکھ لیجئے۔ پنجاب، سندھ، بنگال، مہاراشٹر، مدھیہ پردیش، راجستھان سے آنے والے دلّی میں رہتے ہیں۔ دلّی میں کماتے دھماتے ہیں مگر اپنی زبان اپنی تہذیب پر قائم۔ اپنے رِیتی رواج سے چمٹے ہوئے۔ دلّی تو ان کے لئے اپنی آغوش وا رکھتی ہے مگر باہر والے آج کل کے دلّی والوں سے متاثر نہیں ہوتے کیوں کہ اول تو دلّی والے ہیں ہی نہیں۔ ملائی تو گئی۔ کھرچن باقی ہے تو اب ان دلّی والوں میں کشش کہاں سے آئے؟ دلّی کے صدیوں کے رچے بسے تعلیم یافتہ لوگوں کو تو تقسیم ملک نے تباہ برباد کر دیا۔ ہجرت کر کے آج بھی پچھتا رہے ہیں۔ جہاں گئے اس جگہ نے ان کو مہاجر ہی سمجھا۔ دھوبی کا کتا۔ گھر کا نہ گھاٹ کا.....جو ٹوٹے پھوٹے دس بیس گھرانے دلّی کے قدامت کو سینہ سے لگائے ہوئے ہیں وہ گوشوں کونوں میں منہ چھپائے زندگی کے دن دلّی کے ماتم میں گزار رہے

Marfat.com

ہیں۔ہاں باہر والوں نے یہاں ردّو بدل کا طوفان سر پر اٹھایا۔تاریخ بتاتی ہے کہ پہلی مرتبہ دلّی دب کر رہ گئی دلّی کی تہذیب نے دم توڑ دیا۔ باہر والوں کی اکثریت نے دلّی کی وجہ امتیاز کے سارے نشان مٹا دیے۔

حاجی علی جان بھی دلّی آئے اور اپنے شال وکار چوب کے کام میں لگ گئے .....ترقی مقدر میں ہوتو تنزلی کا کیا کام .....اور مقدر کھوٹا ہوتو ترقی کہاں الغرض حاجی علی جان نے مغلیہ بادشاہوں سے اچھی خاصی مراعات حاصل کر لیں..... بادشاہ تک پہنچ ہوتو پھر کیا چاہیے!امراء.....درباری سب سے ہی تعلق ہو جاتا ہے۔علی جان کوئی جانے پہچانے آدمی کا نام نہیں ہے.....ایک تاجر اور وہ بھی امراء کے مخصوص حلقہ میں مشہور.....عوام بیچاروں کو تو دو روٹی بوٹی سے ہی فرصت نہ تھی۔تن ڈھانکنے کے لیے موٹا جھوٹا کپڑا ہی غنیمت .....وہ شال دوشالوں کو کیا جانیں یہ تو امیروں کے چونچلے ہیں .....ان کو اپنی زیبائش آرام کے لیے اعلی لباس درکار.....اس لئے امیروں نے ان دستکاروں کی خوب مدد کی۔فن کی ترقی ہوئی ایک سے ایک بہتر دستکار ابھرا۔امیروں نے اس کی محنت کا جی کھول کر معاوضہ دیا اور جو شخص علی جان کہلاتا تھا حاجی علی جان کے نام سے مشہور ہو گیا۔ایک گوشہ نشین گمنام کا اس سے بڑھ کر اور کیا امتحان ہوگا کہ اس کے جہل کا مذاق اڑایا جائے.....زندگی کا ۴۷واں سال ہے پڑھتے پڑھتے آنکھوں نے چشمہ مانگ لیا.....لکھتے لکھتے انگلیاں ٹیڑھی ہو گئیں ..... پتہ یہ چلا کہ علم نام سنا ہے علم تو حاصل کیا ہی نہیں .....جہل کا یہ تمغہ طرۂ امتیاز ہے اور تازیانۂ عبرت ہے کہ اُسے دنیا نے اتنی مہلت ہی نہ دی کہ کسی قابل ہو کر علم داں حضرات کی جوتیاں سیدھی کرتے .....ان کو سر پر رکھتے آنکھوں سے لگاتے !تھوڑا بہت وقت عادتاً پڑھنے لکھنے میں لگایا تو پتہ چلا کہ دنیا خراب نامہ اعمال سیاہ.....اللّٰھم احفظنا.....کچھ لوگ اللہ جانے کیوں گوشہ نشینوں کو ٹٹولتے پھرتے ہیں.....ہم نہ عالم.....نہ اچھے دنیادار نہ اچھے دین دار.....پھر بھی.....مجبور ہو کر کمزور ہونے کی وجہ سے کبھی قلم اٹھانا پڑتا ہے.....مگر اب قلم بھی شکوہ کرنے لگا ہے کہ کیوں مجھ سے کام لے کر سیاہی کاغذ خراب کرتے ہو؟ ہزاروں صفحات کالے کر کے کیا کیا؟ کہاں جائیں گے یہ پلندے؟ کون پڑھے گا ان کو.....مگر تم اپنی جگہ قائم .....نہ خود چین لیتے ہو نہ مجھے چین لینے دیتے ہو .....میاں اس ردّی کے ڈھیر کا وزن نہ بڑھاؤ.....کوئی پڑھنے والا نہیں۔کوئی سننے والا نہیں .....ناقدروں کا دور ہے اور ہمارا ہی کیا ذکر ہے.....علم والے تو سارے ہی شاکی ہیں.....

کبھی اتفاقاً مجمعِ عام میں کچھ کہنے سننے کا موقع ملا .....تو جو سنا اس پر حیرت! جو کہا اس پر تعجب! بھینس کے آگے بین بجانے سے تو خاموش رہنا بہتر ہے .....اربابِ فن کا حسن مذاق دیکھئے:

بلبل کو دیا نالہ تو پروانہ کو جلنا
غم ہم کو دیا سب سے جو مشکل نظر آیا

حاجی علی جان کوئی ادیب ہو نثر نگاری، شاعری کرتا ہو۔ عالم دین ہو.... سیاسی لیڈر ہو تو قلم اٹھاؤ اور لکھتے چلو مگر ایک مختلف العقیدہ شخص کو مجبور کرنا کہ وہ اہل حدیث عقیدہ نہ رکھتے ہوئے ایک اہل حدیث کو پردۂ خفا سے باہر لائے .....ایک تجارت سے نا آشنا شخص کو مجبور کرنا کہ وہ ایک تاجر کی حیات کے رخ سے نقاب اٹھائے۔ کہاں کا انصاف ہے.....مگر حکم حاکم مرگِ مفاجات! لکھنے کو تو لکھا جائے گا مگر حق ادا نہ ہوگا.....معلومات کا حصول بھی ایک نازک مرحلہ ہے صاحبِ عنوان کے رشتہ دار ہی ایک ذریعہ ہے اللہ جانے ان کی معلومات کا معیار کیا ہے.....کتابیں تو خاموش ہیں ہاں اس خاندان کے حضرات نے جو بتایا وہ قلم بند کر دیا.....دروغ بر گردن راوی۔

حاجی علی جان کا نام سنتے ہی سڑک، گلی حاجی علی جان، مسجد حاجی علی جان اور کوچہ میر عاشق کے نام سامنے آتے ہیں جہاں یہ شخصیت رہتی بستی تھی اور آج ان کی اولاد در اولاد بس رہی ہے۔

حاجی علی جان کی دوکان آج بھی نئی سڑک پر موجود ہے۔ وہی کاروبار ہے مگر صورتیں لامحالہ بدلی ہوئی ہیں.....یہ وہ تاریخی حقیقت ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اچھے لوگوں نے اچھی بنیاد رکھی تھی جو غدر ۱۸۵۷ء کے انقلاب کو بھی برداشت کر گئی اور ۱۹۴۷ء کے انسانیت سوز ہنگامہ بھی اس کے سر پر سے گزر گیا مگر دکان اپنی جگہ ہے اور نام بھی وہی چلا آرہا ہے۔

حضور سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیاء کا مقام۔ اللہ اللہ! سات سو سال ہو گئے تمام دنیا کے چپہ چپہ پر پھیلا ہوا ہے.....عقیدت مند ہو تو سبحان اللہ! بدعقیدہ ہو تب بھی حضور سلطان مشائخ کا اسم گرامی اس کی زبان پر کسی نہ کسی انداز میں آنا لازمی ہے.....یہ ان کی روحانی عظمت ان کی شان محبوبی ہے کہ فضائے کائنات ان کے نام سے واقف و منور ہے۔ عوام کا حافظہ کمزور ہوتا ہے.....بہت جلد غیروں کا تو ذکر کیا ہے اپنوں کو بھی بھول جاتے ہیں مگر کچھ شخصیات کو مولائے کریم قبول عوام کی نعمت سے نوازتا ہے.....کیوں کہ ان کے نام میں عظمت و برکت سموئی ہوئی ہوتی ہے یوں تو بائیس خواجگان اس دلّی کی دھرتی میں سمائے ہوئے ہیں مگر نام گونج رہا

Marfat.com

تھا حضور سلطان المشائخ کا.....

حاجی علی جان کا نام بھی باقی ہے .....لامحالہ ان میں بھی کچھ خوبی ہوگی ان کے بھی کچھ محاسن ہوں گے جوان کا نام بھی باقی ہے .....کاروبار بھی باقی ہے اور دلّی کے بسنے والے صرف کوٹھی حاجی علی جان کے نام سے نئی سڑک پہنچ جاتے ہیں کاروبار کوئی بھی ہو اس کے مستحکم ہونے کے لئے ایمان داری۔ حسن معاملہ ضروری ہے اور حاجی علی جان میں یہ دونوں صفات ان کے اپنے عقیدہ کی پختگی کا ثبوت ہے.....اہلِ حدیث! بڑے سخت عقیدہ کے لوگ ہوتے ہیں ان کے مزاج میں نرمی ڈھونڈنے سے ہی ملتی ہے اور اس طبقے کو تو سہارے سیاسی بھی ملے .....اور یہ پھیلے پھیلے پھرے۔ میاں نذیر حسین محدث دہلوی کو کون نہیں جانتا۔ بڑے نامی گرامی عالم فاضل بزرگ تھے مگر خلاف معمول ان کے مزاج میں نرمی تھی اس لئے سب ہی ان کو میاں صاحب کے نام سے یاد کرتے ہیں حاجی صالح اور ان کے صاحبزادے حاجی سلیم کو تو ہم نے خوب دیکھا ہے۔

یہ حضرات حاجی علی جان والے ہی کہلاتے ہیں.....حاجی صالح تو بقول ڈپٹی نذیر احمد مرحوم دیگی چمچہ تھے۔ کہنے کو اہل حدیث مگر عرسوں میں شریکِ محفل سماع میں موجود.....وعظوں میں ہر جگہ.....سیاسی جلسوں میں بھی دکھائی دیتے تھے .....سربراہان ملک سے رابطہ قائم رکھنا ان کی عادت تھی..... پنڈت نہرو سے ان کے خوردی بزرگی کے مراسم تھے.....شاید اس خاندان کا مزاج ہی یہ ہو.....حاجی صالح کے والد۔ ان کے والد تو ہم نے بہت پہلے کی بات ہے! مگر اس خاندان کے بارے میں تذکرے خاموش تاریخ مہر برلب کیوں ہے؟ اس کا جواب اہلیان دہلی ہی شاید دیں.....ہم تو خود حیرت میں ہیں کہ کشمیر سے آیا ہوا ایک تاجر دلّی میں بس کر نہ ادیب کہلایا نہ سیاست داں.....نہ کوئی مولوی ملا نہ کوئی پیر شیخ .....پھر بھی اس کا نام چلا آرہا ہے.....کیوں؟ اس کا جواب ہے کوئی جودے۔

بڑے تلاش کے بعد ایک محترمہ کا مکالمہ ملا.....مگر:

زبانِ یار من ترکی و من ترکی نمی دانم

یا ذرا سی تبدیلی کر کے یہ کہتا چلوں کہ:

زبان یار من ہندی و من ہندی نمی دانم

تو یہ مکالمہ ہندی رسم الخط میں ساجدہ اسد صاحبہ کا ہے.....جو اس ناچیز کے علم میں ضلع بجنور سے متعلق ہیں ..... یہ دلّی کا معجزہ ہے کہ ان صاحبہ کو حاجی علی جان مرحوم کے گھرانہ کے ایک

Marfat.com

بزرگ حاجی محمد صالح سے شرف کلام حاصل ہوا.....حاجی صالح کو بھی گئے کافی عرصہ ہو گیا..... ایک خاص وضع قطع کے بزرگ مرنجاں مرنج.....سیدھے سادے.....تصنع بناوٹ سے دور.....مگر اپنی خاندانی روایت کے تحت وہ ۱۹۴۷ء کے انقلاب کو جھیل گئے۔تو محترمہ اسد صاحبہ نے ان سے جو گفتگو کی وہ کچھ زیادہ معلوماتی تو نہیں ہے مگر ضبط تحریر میں لائی ہوئی اس لئے تحریر کا کچھ ماحصل شاید میں بیان کر پاؤں اور آپ اس کو سن پائیں۔

ساجدہ صاحبہ نے کوٹھی حاجی علی جان نئی سڑک کا کچھ چشم دید حال لکھا اور پھر حاجی محمد صالح صاحب سے ان کی جو گفتگو ہوئی۔اس کو نقل کیا۔یہ حاجی صالح صاحب حاجی علی جان صاحب کے پڑپوتے تھے۔بزرگوں کی جیتی جاگتی نشانی۔یہ ملاقات اس زمانہ کی ہے جب حاجی صالح صاحب بوجہ ضعیف العمری خانہ نشین ہو چکے تھے.....اس لئے یہ ملاقات بڑے گھر میں ہوئی جو ان کا پشتینی مکان کوچہ میر عاشق چاوڑی بازار دہلی میں ہے اور ''بڑے گھر'' کے نام سے اس لئے مشہور ہے کیوں کہ واقعی گھر بہت بڑا۔کنبہ بڑا۔اور حاجی صالح جیسا عمر رسیدہ بزرگ بڑا اسی مکان میں رہا بسا ساجدہ صاحبہ نے اس مکان کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے۔

> ''دروازہ میں پہنچ کر میں دنگ رہ گئی کہ اس گوچہ میں محل کا دروازہ اتنا بڑا ہے کہ دلی میں مکان نہ ملنے سے پریشان کئی خاندان اس میں رہ لیں۔دروازہ میں بہت لمبا اور مضبوط تخت پڑا ہوا ہے جس پر پہلے دربان بیٹھا کرتے ہوں گے''۔

اب سوچیے.....جس مکان کا دروازہ ایسا عظیم الشان ہو تو مکان کیسا ہوگا بقول ساجدہ گھر کیا تھا چھوٹا موٹا قلعہ لگ رہا تھا۔اس کی بناوٹ کا اندازہ دیوان عام، دیوانِ خاص اور دربار عام کا سا تھا۔چھت پر کئی کمرے یا یوں کہئے کہ کئی حویلیاں بنی ہوئی تھیں۔دو بہت بڑے بڑے دالان جن کے دونوں طرف کمرے بنے ہوئے تھے.....

اس کے بعد اس عظیم الشان مکان کی موجودہ حالت کا نقشہ ساجدہ صاحب نے اس طرح کھینچا ہے:

نہ وہاں چاندنی بچھی ہوئی تھی نہ قالین۔دیواروں کا پلاسٹر جگہ جگہ سے بیتے ہوئے دنوں کی یاد میں دکھی ہو کر اتر رہا تھا نیچے کے آنگن میں دونوں طرف چھوٹی چھوٹی کوٹھریاں اور دالان بنے ہوئے تھے۔وہیں ایک چھوٹے سے دالان میں حاجی صاحب (محمد صالح) ایک پلنگ پر دو تکیوں کے سہارے لیٹے ہوئے تھے ان کے پاس اردو کے بہت سے اخبار رکھے ہوئے تھے۔پورے

Marfat.com

پلنگ پر بستر نہ تھا۔ پائینتی پر ایک گرم چادر اور ایک چھڑی رکھی ہوئی تھی۔ کھونٹی پر دو شیروانیاں ایک کالی اور ایک سفید لٹکی ہوئی تھیں۔ اور مختلف رنگوں کے (تاگے) سے کڑھی ہوئی دو ٹوپیاں بھی رکھی ہوئی تھیں۔ کچھ پرانی کتابیں الماری میں پڑی تھیں اور پھٹا ہوا کیلنڈر منہ چڑھا رہا تھا۔''

حاجی علی جان مرحوم کے مکان کی یہ دردناک کیفیت اگر کوئی دلّی والا لکھتا تو مکان کی کہنگی میں بھی ایک حسن پیدا کر دیتا مگر ساجدہ صاحب نے جو دیکھا اسے سپرد قلم کر دیا۔

الغرض حاجی علی جان کے مکان پر ہی کیا موقوف ہے..... دلّی کے شرفاء کی بڑی حویلیوں پر جو گزر گئی اس پر زبان کو خاموش رکھنا ہی مناسب ہے۔ ۱۹۴۷ء کے انقلاب نے تو تہذیب و تمدن کا ہی نقشہ بدل دیا۔ مکان حویلیوں کا کیا ذکر ہے آثارِ قدیمہ کو ہی دیکھ لیجیے مرقعۂ عبرت بنے ہوئے ہیں.....

حاجی محمد صالح کی عمر بقول ان کے اس وقت دس کم سو کی تھی انقلاب کے سلسلہ میں حاجی صاحب نے فرمایا:

''کیا پوچھتی ہو۔ یاد کر کے اندھیرا آ جاتا ہے۔ اللہ اکبر! میں چار چار پانچ پانچ گھنٹے قلعہ میں کھیلا کرتا تھا قلعہ کے ملازمین اور بیگمات کے بارے میں حاجی صاحب نے فرمایا ''جب شہر اجڑ گیا سب ادھر ادھر بھاگ گئے'' حاجی علی جان صاحب کے بارے میں حاجی صالح صاحب نے بتایا کہ ''ہمارے دادا حاجی علی جان کو شاہ عالم یا جہانگیر کشمیر سے لائے تھے۔

حاجی محمد صالح کی مستورات بھی بڑی آبرومندانہ شریفانہ اور مخلصانہ اسلامی زندگی گزارتی تھیں۔ انہوں نے حاجی صاحب کے مزاج کو پہچانتے ہوئے مہمانوں کی پس پردہ تواضع ہی نہیں کی بلکہ دل ہلا دینے والے یہ فقرات بھی کہے:

''اب تمھاری خاطر کرنے کے لئے ہمارے پاس رکھا ہی کیا ہے یہ حویلی بھی (آدمیوں سے) بھری رہتی تھی۔ بہن، کھالو، یہ ہے کیا۔ حاجی صاحب نے فرمایا کہ ان چیزوں میں محبت کی چاشنی ملی ہوئی ہے۔ دلّی کی ویرانی جو ۱۸۵۷ء میں ہوئی حاجی صاحب نے خود دیکھی تھی۔ فرماتے ہیں ''بہن! کیا کہوں۔ جب شہر اجڑ گیا۔ سب ادھر ادھر بھاگ گئے۔ نور جہاں بیگم، قدسیہ بیگم، شاہ جہاں بیگم، ساری بیگمات اپنے اپنے محلات میں رہتی تھیں۔ مرزا اثر یا جاہ بادشاہ کے داماد تھے۔ ہمارے گھر بھی

تشریف لاتے تھے۔ بے تکلفی بھی تھی۔ عزت تھی۔ آبرو تھی۔ ہمارے دادا علی جان کو شاہ عالم یا جہانگیر کشمیر سے لائے تھے"۔ اپنی مستورات کے بارے میں حاجی صاحب نے فرمایا: ارے بہن! کیا پوچھتی ہو وہ تو شہزادیاں تھیں۔ کبھی اٹھ کر پانی بھی نہیں پیتی تھیں۔ بس بنی سنوری ٹھنی رہتیں پاندان ان کے سامنے کھلا رہتا تھا۔"

میاں نذیر حسین محدث دہلوی جو میاں صاحب کے نام سے جانے جاتے ہیں حاجی علی جان صاحب کے مکان پر ہر ہفتہ زنانی مجلس میں وعظ کہنے آیا کرتے تھے تو سارے شہر سے ان کا وعظ سننے کے لیے عورتیں بڑے مکان میں جمع ہوتی تھیں۔ بڑے اعلیٰ درجہ کے شاہی زمانہ کے مولوی تھے۔ ایک سو پندرہ سال کی ان کی عمر ہوئی۔ بیری کے درخت کے نیچے نواڑ کے پلنگ پر وہ بیٹھ جاتے۔ قرآن شریف ان کی بغل میں ہوتا تھا۔ نیلے رنگ کا چادرہ سر پر ڈالے رہتے تھے۔

حاجی صالح نے چاندنی چوک کے بازار کے بارے میں فرمایا:

"یہ جو چاندنی چوک ہے نا اس کے درمیان میں نہر بہتی تھی جو آگرہ سے آتی اور لال قلعہ سے گزر کر جمنا میں چلی جاتی تھی۔ پٹڑی کے دونوں طرف نیم کے پیپل کے بڑے بڑے پیڑ تھے جن پر تین چار سو سیال سے چڑیاں چہچہاتی رہتی تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ ہم باغ میں ہیں عجیب سماں تھا۔ نہر کا نام نہر سعادت خاں تھا"۔

کوٹھی حاجی علی جان کے بارے میں قصہ درویش بزبانِ درویش حاجی صالح سے زیادہ کون جان سکتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

"سب وقت کی بات ہے۔ کیا بتاؤں وہ ایک وقت تھا کہ جب کسی دُکان میں ساٹھ یا پینسٹھ ہزار روپے سالانہ کی آمدنی تھی۔ ہم کبھی حساب بھی نہیں رکھتے تھے۔ پیسے کی ریل پیل تھی۔ ہمارے یہاں زیورات بنتے تھے۔ شاہی محل میں ہمارے دادا (حاجی علی جان صاحب) پر اتنا بھروسہ تھا کہ ان سے کہہ دیا جاتا اور وہ قلعہ میں زیور بھیجتے تھے۔ قیمت ویمت کا کیا حساب!"۔

جو حاجی صاحب کہتے مل جاتا تھا۔ کیا کہوں بہن! حقیقتیں خواب و خیال ہو جاتی ہیں۔ رونا آجاتا ہے۔ وہ کیا دن تھے! آج ہم کیا ہیں ہم نے دو ٹوپیاں بنائیں۔ ایک مسلمانوں کی مغلئی کامدار ٹوپی جو اس وقت اپنے کام کے حساب سے دو روپے سے چار روپے تک تھی۔ دوسری ہندوؤں کی دوپٹی چوکھونٹی ٹوپی جو نو آنے سے دو روپے تک تھی۔ میرے پاس کچھ ٹوپیاں بچی ہوئی

Marfat.com

تھیں۔ رنگون سے کچھ میمیں آئیں اور اس کے بٹوے بنا کر لے گئیں! اب تو دو ایک ٹوپیاں پڑی ہیں دلّی میں ہمارے کام کی برابری کون کر سکتا تھا۔ ہم نے جموں کشمیر کے مہاراجہ کے دوشالے بنائے ہیں۔ ہمارے کام کے صرف نمونے ہی چار چار سو پانچ پانچ سو کے بنتے تھے۔ ساٹھ سال پہلے کی جیکٹ آج بھی ویسی ہی چمک دے رہی ہے۔ ہم نے دولہا کی گدیاں اور مسندیں بنائی تھیں۔ ڈرائنگ روم کے غالیچے بنائے تھے۔ کپڑا پھٹ جائے مگر ہمارا آرٹ کبھی خراب نہیں ہوتا تھا۔ ہم نے ایسے بھی کام بنائے ہیں کہ کپڑا بالکل دکھائی نہیں دیتا۔ یہ دیکھو جامع مسجد کا نقشہ! سنہری جامع مسجد۔ ہماری فرم میں ایسے کاریگر تھے مگر آج کوئی نہیں۔ یہ حویلی نوکروں سے بھری رہتی تھی آج ایک بھی نوکر نہیں ہے۔ ہمارے گھر کی عورتوں کو کام کرنا پڑتا ہے ہم تو آرڈر کا کام کیا کرتے تھے۔ نواب صاحب مالیر کوٹلہ کی گدی نشینی کے وقت ہمارے یہاں سے بہت سامان بن کر گیا تھا لکھنؤ اور حیدرآباد کی بیگموں کے لباس اور جوتوں پر کام ہم نے ہی بنایا تھا ہماری دُکان اپنے کام کی اچھائی اور سچائی کے لئے مشہور تھی۔ اب کیا کریں نہ نواب رہے نہ زمیندار۔ بھولے بھٹکے اب بھی کوئی قدردان آتا ہے تو ہم اسے مایوس نہیں کرتے.....اب بھی کام بنوا دیتے ہیں۔ پاکستان بن گیا بہت سے امیر چلے گئے.....کاریگر چلے گئے۔ ملک کی حالت بدل گئی ۱۹۶۲ء کے گولڈ کنٹرول نے تو ہماری کمر ہی توڑ دی۔ ہمارے کارخانہ میں زیور بننے بالکل بند ہو گئے۔ سامان مہنگا ہو گیا۔ اب تو آبرو سنبھالنا مشکل ہے۔ عزت آبرو بڑی چیز ہے۔ جائیداد بھی لاکھوں کی تھی۔ کچھ سستے کرایہ پر ہے کچھ زمین سرکار نے دبالی۔ ہم نے کسی سے کچھ نہیں کہا۔ بس اپنی آبرو بچائے بیٹھے ہیں۔ باپ دادا کی عزت ہے اس کو بیچ بھی کیسے سکتے ہیں۔ بس اپنی آبرو سنبھالے جی رہے ہیں۔

حاجی محمد صالح مرحوم کے مکالمہ سے جہاں ماضی کی شاندار روایتوں کی جھلک دیکھنے کو ملتی ہے وہیں حال کی دردناک داستان بھی سننے کا موقع ملتا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ وقت کی الٹ پلٹ میں مسلمانوں پر کیا گزری.....ان کے روشن دور کو خدا جانے آسمان کھا گیا یا زمین نگل گئی مگر پھر بھی دلّی والوں کی آن بان ماند نہیں پڑی۔ وہی اخلاص وہی حفظ مراتب.....وہی شرفا کا انداز۔ وہی وضع داری وہی باہمی محبت بھرا ربط ضبط گویا اعلیٰ کردار کا جاذب نظر مرقع دلّی والوں کی رگ و پے میں ۱۹۴۷ء تک سمایا رہا۔ مگر ۱۹۴۷ء کے انقلاب نے صدیوں کی بنی سنوری دلّی کی تہذیب کا شیرازہ بکھیر دیا۔ حاجی صالح کی باتیں کاش ٹیپ ہوتیں تو یہ مکالمہ ایک ادبی شاہکار بن جاتا....

Marfat.com

ان کی ہی زبان ہوتی.....ان کا ہی طرزِ بیان ہوتا.... ان کی ہی نہیں دلّی کی ہزار سالہ داستان ہوتی مگر افسوس:

وہ بات کوہ کن کی گئی کوہ کن کے ساتھ

ہم نے تو اپنے ہوش میں ان بزرگوں کو خود دیکھا تھا ہمارے گھروں کی تقاریب میں زیورات، کپڑوں پر کارچوبی کام.....مالاؤں.....پہنچیوں..... بازو بندوں.....چمپا کلیوں میں ڈورے ڈلوائے.... ہزاروں کا سامان لکھت نہ پڑھت ان کو دے دیا جاتا تھا جو بن سنور کر ایسا آتا تھا کہ آج تک اس پر زمانہ کا اثر نہیں ہے۔ ہم لوگوں نے قدیمی کارچوبی کپڑوں کو ابھی تک حفاظت سے رکھا ہوا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آج ہی بن کر آئے ہیں۔ حاجی علی جان نے قلعہ معلیٰ کے ہی سربراہوں کو اپنا گرویدہ نہیں بنایا تھا بلکہ ہر صاحب حیثیت اپنی تقاریب کی شان حاجی علی جان کی صنعت سے بڑھاتا تھا۔

سچے علی جان کہلائے جانے کی دو وجوہات تھیں اول تو یہ کہ بڑے سیدھے سچے لوگ تھے۔ دوسرے یہ کہ خالص سونے چاندی کے تاروں سے کلدار چوب ہوتا تھا جس کی آج بھی قیمت لاکھوں میں ہے.....ایک واقعہ سن لیجئے.....زینت محل بڑے ٹھاٹ کی بیگم تھیں مولوی عبدالقادر صاحب قلعہ کی موتی مسجد کے امام تھے اور شہزادیوں کے اتالیق بھی تھے.....زینت محل نے بھی ان سے ہی قرآن شریف پڑھا تھا جب مولوی عبدالقادر صاحب نے اپنی بیٹی صفیۃ النساء کی شادی شمس العلماء مولوی نذیر احمد صاحب سے کی تو زینت محل نے ایک عالیشان ریشمی جوڑا اپنی استادزادوں کو دیا.....اس جوڑے کا بیش قیمت ریشمی دوپٹہ آج بھی موجود ہے اور بالکل نیا معلوم ہوتا ہے۔ بہت بھاری سونے کا کام اس پر کیا گیا ہے جو سوائے حاجی علی جان کے اور کوئی کر ہی نہیں سکتا.....اور پھر قلعہ معلیٰ کے کپڑے تو حاجی علی جان کے یہاں ہی تیار ہوتے تھے۔ یہ دوپٹہ ہی نہیں ڈھیلے پاجامے، کرتے، شیروانیوں، جاکٹوں اور ٹوپیوں کے لاجواب کارچوبی کام سچے علی جان والے ہی کرتے تھے..... بادشاہوں، راجاؤں کا تو سہاگ ہی حاجی علی جان سے قائم تھا.....ان کا کام مشہور تھا۔ شرفاء کے متوسط الحال گھرانوں میں بھی یہ نام سب کی زبانوں پر رہتا تھا اور اب...

خواب تھا جو کچھ بھی دیکھا جو سنا افسانہ تھا

سچے علی جان کو دوسرے ممالک میں بھی شہرت حاصل تھی، ایمانداری کا معرکتہ الآرا، نادر کام

تو حاجی علی جان کے یہاں ہی ہوتا تھا.....اب نہ علی جان موجود ہیں نہ ان کی صنعت کاری اور ایمانداری موجود ہے مگر نام بدستور! جگہ بدستور! خاندان بدستور! مگر صورتیں بدلی ہوئیں۔ مزاج بدلے ہوئے۔ کام کی نوعیت بدلی ہوئی برکت تو برکت والوں کی ساتھ گئی۔ ان کی اقبال مندی کے لئے یہی کہنا کافی ہے کہ ان کا نام باقی ہے، ان کی دکان باقی ہے، ان کا مکان باقی ہے، ان کی نسل باقی ہے مگر پہلے والی بات کہاں۔

ہمیشہ رہے نام اللہ کا

عبارت آرائی سے کام لیا جائے تو سینکڑوں صفحات قلم بند ہو سکتے ہیں مگر اس مختصر سے مقالہ میں حقیقت کو اجاگر کرنے پر اکتفا کرنا اس لئے ضروری ہے کیوں کہ ذوق تو کبھی کا ختم ہو گیا..... دلّی اور دلّی والے سب تاریخ کے صفحات میں دفن ہو چکے.....کچھ نام باقی ہیں.....کچھ خاندان باقی ہیں.....کچھ باقی ہے مگر اس کچھ کو انگلیوں پر گن لو وہ بھی جب جب کہ اس دلّی سے محبت ہو جو ان داتا ہے غریب نواز ہے دلّی کی آبادی کہاں سے کہاں پہنچ چکی ہے؟ لاکھوں سے بڑھ کر کروڑ کی حد میں.....مگر دلّی میں اب دلی والا گھٹ کر صفر کے دائرہ میں آچکا ہے۔ جس کے پاس اب سب کچھ ہے مگر نہ دلّی کی تہذیب ہے نہ تمدن نہ دلّی کی وضع داریاں ہیں نہ دلّی میں دلّی کی زبان ہے اب تو دلّی ایک کھچڑی ہے۔ پنج میل دال ہے۔ پک رہی ہے وہ بھی کاٹ کی ہنڈیا میں....اللہ جانے کب تک!

☆☆☆

Marfat.com

مجتبیٰ حسین

فکرتونسوی

مجھ سے خواہش کی گئی ہے کہ میں فکرتونسوی کے بارے میں کوئی نیا مضمون پڑھوں۔ پرانی شخصیت کے بارے میں کوئی نیا مضمون پڑھنا یوں بھی دشوار کار ہے۔ ابھی دو سال پہلے میں نے ان کی شخصیت پر ایک بھرپور خاکہ لکھا تھا۔ اب پھر ان کی شخصیت کے بارے میں نیا مضمون لکھنے کی فرمائش پر مجھے وہ لطیفہ یاد آرہا ہے۔

''ایک نواب صاحب کو کسی نے بتادیا کہ علی الصبح گھوڑے کی سواری کی جائے تو صحت اچھی رہتی ہے۔ نواب صاحب فوراً بازار گئے ایک گھوڑا خرید کر لے آئے اور ایک سائیس کو ملازم رکھ لیا۔ سائیس کو پابندی کیا کہ وہ انہیں گھڑ سواری کے لیے علی الصبح جگایا کرے۔ دوسرے دن سائیس علی الصبح گھوڑے کو تیار کر کے نواب صاحب کی خواب گاہ میں انہیں جگانے کے لیے پہنچا، بڑی آوازیں دی تو نواب صاحب نے سوتے سوتے ہی پوچھا'' بولو کیا ہے؟'' سائیس بولا ''حضور گھوڑا سواری کے لیے تیار ہے''۔ نواب صاحب نے اپنی خمار آلود آنکھوں کو پھر سے بند کرتے ہوئے کہا'' تم ذرا گھوڑے پر زین ڈال دو، میں ابھی بیدار ہوتا ہوں''... آدھے گھنٹے کے بعد وہ پھر نواب صاحب کی خواب گاہ میں پہنچا اور دوبارہ انہیں جگانے کی کوشش کرنے لگا۔ اب کی بار نواب صاحب نے لال لال ڈوروں والی آنکھیں کچھ دیر کے لیے کھولیں اور پوچھا'' بولو کیا ہے؟''۔

سائیس نے دست بستہ عرض کی'' حضور گھوڑا سواری کے لیے تیار ہے، بیدار ہو جایئے''۔
نواب صاحب نے بڑبڑاتے ہوئے کہا'' میں نے تو تم سے کہا تھا گھوڑے پر زین ڈال دو''۔

Marfat.com

سائیس نے کہا" سرکار آپ کے حکم کی تعمیل میں میں نے گھوڑے پر زین ڈال دی ہے"۔
اس پر نواب صاحب نے ایک لمبی جماہی لے کر کروٹ بدلتے ہوئے کہا" جاؤ تھوڑی سی زین اور ڈال دو"۔

اب میرے اس نئے مضمون کی حیثیت صرف اتنی ہے کہ میں فکر تونسوی پر تھوڑی سی زین اور ڈالنے چلا ہوں۔ مجبوری سائیس اور ادیب سے کیا نہیں کرواتی۔ مگر میں سوچتا ہوں کہ میں نے ان پر پہلا مضمون دو سال پہلے لکھا تھا، ان دو برسوں میں بہت کچھ ہو گیا ہے۔ ان دو برسوں میں وہ مزید بوڑھے ہو گئے اور میں مزید جوان ہو گیا۔ قانون قدرت کو یہی منظور تھا پھر ان دو برسوں میں وہ مجھ سے اتنے قریب آ گئے ہیں کہ لگتا ہے کہ وہ مجھ سے بہت دور ہو جائیں گے۔

میں نے پہلے مضمون میں بہت سی ایسی باتیں لکھ دی تھیں جنہیں بعد میں فکر تونسوی نے اپنے عمل سے غلط ثابت کر دیا۔ لہٰذا اب ضرورت اس بات کی تھی کہ فکر تونسوی کا ایک اغلاط نامہ شائع کیا جائے، چاہے اس کے لئے مجھے تھوری سی زین اور ڈالنے کی زحمت کیوں نہ اٹھانی پڑ جائے۔

یہ حضرت جو" ہنچ بیک آف نا ترے ڈیم" Hunch Back of Notre Dam سے بڑی مشابہت رکھتے ہیں بڑے عجیب و غریب آدمی ہیں۔ اونٹ کی کل سیدھی بھی ہو سکتی ہے لیکن ان کی کوئی کل سیدھی نہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ اس دنیا میں کیا کرنے کے لئے آئے ہیں اور کیوں آئے ہیں۔ آپ کہیں گے اردو میں طنز نگاری کرنے آئے ہیں۔ مانا کہ طنز نگاری کرنے آئے ہیں مگر میری عرض یہ ہے کہ طنز نگار بڑا ہوشیار آدمی ہوتا ہے، وہ دوسروں پر پتھر پھینکنے سے پہلے اپنے مکان کی دیواروں کو نہ صرف بلند کر لیتا ہے بلکہ انہیں مضبوط بھی بنا لیتا ہے وہ بڑی ہوشیاری اور کسی حد تک عیاری سے اپنی ذات کو کچھ اس طرح ڈھالتا ہے کہ کسی کو اس پر طنز کرنے کا موقع نہ ملے۔ اگر اس کو معیار مانا جائے تو گستاخی معاف، یہ جو حضرت فکر تونسوی اردو کے بڑے طنز نگار بنے پھرتے ہیں دنیا کے بے وقوف ترین آدمی ہیں۔ ان کی ذات بے برکات کا جتنا مذاق اڑایا جا سکتا ہے اتنا شاید ہی کسی کا اڑایا جا سکے۔ یہ اتنے بڑے طنز نگار ہیں مگر چھوٹی چھوٹی بات پر اتنے خوش ہوں گے کہ دیکھنے والا افسوس کرنے لگ جائے گا۔

ایک بار میرے ساتھ بس اسٹاپ پر بس کا انتظار کر رہے تھے ابھی انتظار کے دو سکینڈ بھی نہ گزرے تھے کہ بس آ گئی اور اتفاق سے خالی آ گئی۔ اب اس بات پر جو فکر تونسوی خوش ہوئے تو بس خوش ہوتے ہی چلے گئے۔ بار بار کہتے" بھئی کمال ہے آج ہمیں اتنی آسانی سے بس مل گئی"۔

بچوں کی طرح وہ تالیاں بجاتے ہوئے بس میں داخل تو ہوئے ہی تھے مگر جب بس سے اترنے لگے تو تب بھی تالیاں بج رہی تھیں۔فٹ پاتھ پر چلنے لگے تو پھر کہا" یار ایمان سے مجھے تو حیرت ہو رہی ہے، یقین ہی نہیں آتا کہ ہمیں اتنی آسانی سے بس مل گئی۔کافی ہاؤس پہنچے تو دوستوں کی میز پر پہنچتے ہی خوشی سے اچھل کر کہا، یارو تم یقین نہیں کرو گے آج ہمیں دو سکینڈ میں ہی بس مل گئی۔آخر یہ کیا ہو گیا ہے آؤ آج اس خوشی میں ہم سب کو کافی پلاتے ہیں"۔دو سکینڈ میں بس کو پکڑ کر وہ یوں سمجھ رہے تھے جیسے وہ زندگی میں بہت آگے نکل گئے ہوں۔میں چپ چاپ انہیں حیرت سے دیکھتا رہ گیا۔

چند دنوں بعد ان کی کتاب" چوپٹ راجہ" کو اتر پردیش اردو اکیڈمی کا انعام ملنے کی اطلاع آئی۔میں نے سوچا جو آدمی بس پکڑ کر اتنا خوش ہو سکتا ہے وہ یقیناً ڈیڑھ ہزار روپے کا انعام پا کر پھولے نہیں سمائے گا۔میں ان سے شام میں کافی ہاؤس میں ملا تو بڑے اداس بیٹھے تھے۔لگتا تھا گھر میں بیوی سے لڑ کر آئے ہیں۔میں نے سوچا کہ شاید انہیں انعام کی خوشخبری اب تک نہ ملی ہو۔

میں نے کہا" کیا آپ کو پتہ ہے کہ آپ کی کتاب یو پی اکیڈیمی کا انعام ملا ہے؟" یہ سنتے ہی آنکھوں میں تقریباً تین چار آنسو لا کر بولے" یار، ایمان سے میں انعام شنام میں یقین نہیں رکھتا۔تم نے ہی زبردستی میری کتابیں بھجوادی تھیں، مجھے تو بڑا دکھ ہو رہا ہے ایمان سے۔وہ کون ہوتے ہیں مجھے انعام دینے والے، کیا تم سمجھتے ہو کہ میں یہ سب کچھ انعام اور صلے کے لیے لکھتا ہوں۔تم نے میرے خلاف ایک بری سازش کی ہے، میں اپنے آپ کو کرپٹ نہیں کرنا چاہتا"۔

میں نے کہا" آخر بات کیا ہوئی آپ اتنے خفا کیوں ہیں؟"

بولے" ایمان سے مجھے بڑی شرم آ رہی ہے، کیا تم نے انعامات کی فہرست میں ڈیڑھ ہزاری منصب داروں کے نام پڑھے ہیں"۔

بولے" بیٹا کچھ تو شرم کرو میں اچھا خاصا کرشن چندر اور راجندر سنگھ بیدی کے ساتھ کھڑا ہوا تھا۔تم نے مجھے زبردستی گھسیٹ کر کن لوگوں کے ساتھ کھڑا کر دیا۔اس کے بعد میں مسلسل ہنستا رہا اور وہ مجھے مسلسل کوستے اور گالیاں دیتے رہے۔پھر کئی دن تک کافی ہاؤس نہیں آئے۔میں نے ایک دن فون کر کے وجہ پوچھی تو کہنے لگے" یار ایمان سے، اب میں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہ گیا ہوں۔ہر کوئی مبارکباد دے کر مجھے چھیڑ رہا ہے۔میں مزید چند روز تک کافی ہاؤس

Marfat.com

آنے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ مجھے رہ رہ کر تم پر غصہ آرہا ہے''۔

ایک طرف تو ان حضرت کے غصہ کا یہ عالم تھا چند دنوں بعد نارمل ہو گئے تو ایسے نارمل ہوئے کہ دو دن بھی میں ان سے نہ ملوں یا فون نہ کروں تو پریشان ہو جاتے ہیں۔ ایک بار میں کسی مصروفیت کی وجہ سے آٹھ دنوں تک ان کے پاس نہ جاسکا اور پھر اتفاق سے انہی دنوں میرا دفتر بھی منتقل ہو گیا۔ وہ مجھے فون بھی نہیں کر سکتے تھے۔ بے خبری کے آٹھ دن بڑے چین سے گزرے نویں دن ایک دوست میرے پاس آئے اور کہنے لگے یار فکر صاحب تمہارے لئے بہت بے چین ہیں۔ تم آج ان سے کسی طرح مل لو، یہ دوست گئے تو ایک اور صاحب آئے اور کہنے لگے'' بھئی فکر صاحب کو تم سے ایک ضروری کام ہے وہ سخت پریشان ہیں، تم آج ان سے ضرور ملو''۔

اس کے بعد تین چار اصحاب ملے اور انہوں نے ہو بہو یہی پیغام دیا، میں فطری طور پر پریشان ہو گیا کہ نہ جانے فکر صاحب کس آفت میں گرفتار ہو گئے ہیں۔ شام کو ٹیکسی لے کر کافی ہاؤس پہنچا تو دیکھا کہ موصوف کافی ہاؤس کی ایک ٹیبل پر صحیح وسلامت بیٹھے ہیں۔ میں تقریباً دوڑتا ہوا ان کے پاس پہنچا تو بڑی گرم جوشی سے ملے۔ بڑی شکایت کی کہ اتنے دن کہاں غائب رہے۔ ادھر میں نے مثالیں دے کر اپنے غائب رہنے کی ساری وجہیں بیان کیں۔ سن کر میری باتوں پر ایمان لے آئے اور خاموش ہو گئے پھر میں نے پوچھا'' یہ تو بتایئے آخر وہ کیا کام تھا جس کی خاطر آپ نے اتنے سارے دوستوں کے ذریعہ مجھ تک پیغام پہنچایا۔

بولے'' کام؟ کیسا کام؟ کیا کام کے بغیر ہمیں نہیں ملنا چاہئے، کیا کام کے بغیر میں تمہارے لئے بے چین نہیں رہ سکتا۔ میں تو بس یہ چاہتا تھا کہ تم آج شام کافی ہاؤس آؤ۔ کافی پیو، کچھ باتیں ہوں، کچھ گپ شپ ہو، کیا یہ کچھ اہم کام نہیں ہے؟''

میں نے کہا'' مگر ٹیکسی کا کرایہ'' ہنس کر بولے'' وہ تو ٹیکسی ڈرائیور کے پاس ہی رہے گا''۔

اس دن میں نے محسوس کیا کہ یہ حضرت پٹڑی سے اترے ہوئے ہیں۔ ان کے ساتھ نارمل آدمیوں کی طرح پیش نہیں آنا چاہتے۔ وہ اکثر مجھ سے کہتے ہیں۔'' مجھے تم سے عشق ہو گیا ہے''۔ ہوا کرے مگر میں یہ نہیں چاہتا کہ وہ مجھ سے عشق فرمانے کے لئے مئی جون کی چلچلاتی ہوئی دھوپ میں پیدل چل کر [redacted] صرف پانی کا ایک گلاس پی کر واپس ہو جائیں۔ میں نے فکر تونسوی کے [redacted] سے دیکھا ہے اس سے یہی اندازہ لگایا ہے کہ اردو کے اس بڑے

Marfat.com

طنز نگار کے اندر ایک معصوم گنوار بیٹھا ہے۔ یہ گنوار انہیں اپنے گھر کے خوبصورت صوفے پر اکڑوں بٹھواتا ہے۔ یہی گنوار ان کے کان میں سگریٹ کا ادھ جلا ٹکڑا رکھوا دیتا ہے۔ یہی گنوار ان سے ریفر یجریٹر میں ''بدنام کتاب'' کے نسخے رکھواتا ہے۔ پرسوں میں نے ان کے گھر کا فریج کھولا تو دیکھا کہ ''بدنام کتاب'' کے دو نسخے بڑی قابل رحم حالت میں وہاں پڑے تھے۔ میں ریفریجریٹر میں کتابیں دیکھ کر ہنسنے لگا تو خفت مٹانے کے لئے بولے بھئی میں اصل میں پانی پینے کے لئے فریج کھولا تھا شاید غلطی سے یہ نسخے وہاں رہ گئے ایمان سے پھر خود ہی کچھ سوچ کر ایک طنزیہ فقرہ میری طرف اچھالتے ہوئے بولے ''مگر یار یہ کوئی غلط بات نہیں ہے۔ اردو کی کتابیں اب ریفریجریٹر میں ہی بھلی معلوم ہوتی ہیں۔

میں پھر ہنسنے لگا تو بولے ''دیکھ بیٹا مجھے یہ فریج، یہ ٹی وی، یہ صوفہ سیٹ'' یہ قالین ایک آنکھ نہیں بھاتے ایمان سے، میں تو بڑی مشکل کے ساتھ ان سے اڈجسٹ کرتا ہوں۔ یہ پھول کمار نہ جانے گھر میں کیا کیا لا کر بھرتا چلا جا رہا ہے''۔

فکر تونسوی نے یہ بات کچھ اس معصومیت سے کہی کہ میں اپنے سارے وجود میں مٹی کی سوندھی خوشبو محسوس کرنے لگا۔ مجھے اپنے بچپن اور نوجوانی کے وہ دن یاد آ گئے جو کھیتوں کے درمیان گزرتے تھے۔ تازہ تازہ فصلوں کی مہک، ہرے بھرے کھیتوں کی دوشیزگی، مویشیوں کی آوازیں سب کچھ ذہن میں تازہ ہو گئیں۔ مجھے یوں لگا جیسے فکر تونسوی کے اندر چھپا ہوا گنوار میرے اندر چھپے ہوئے گنوار کو آنکھ مار رہا ہے۔ میں حیران رہ گیا کہ ٹی وی سیٹوں، ریفریجریٹروں، کولروں ایرکنڈیشنروں، صوفہ سیٹوں اور نیون سائن لائٹوں کے نیچے سوئے ہوئے گنوار جب جاگ پڑتے ہیں تو کتنے معصوم اور قابل محبت نظر آتے ہیں۔

میں تو کہتا ہوں کہ یہ جو فکر تونسوی اپنے مضامین میں سچ بات کہتے ہیں تو یہ اصل میں وہ نہیں کہتے بلکہ ان کے اندر بیٹھا ہوا گنوار ان سے سچ کہلواتا ہے۔ اسی لئے تو ان کے سچ پر اعتماد کرنے کو جی چاہتا ہے۔ ان حضرت کی کوئی ایک خامی ہو تو بیان کروں۔ ان کی ذات میں تو خامیوں کے دفتر کھلے ہیں۔ ایک بار مجھے اور قبلہ حضرت کو ایک جلسہ میں شرکت کے لئے حیدرآباد جانا پڑ گیا۔ ریل کا ریزرویشن نہیں مل رہا تھا۔ میں نے بڑی بھاگ دوڑ کی اور جان پہچان کے ایک کلرک کو فی برتھ دس روپے رشوت دے کر ریزرویشن کروا لیا میں نے موصوف کو سارا ماجرا کہہ سنایا تو دوسرے دن ''پیاز کے چھلکے'' میں اس کلرک کے خلاف ایک لمبا چوڑا کالم لکھ مارا۔ کلرک دوسرے دن بھاگا

Marfat.com

بھاگا میرے پاس آیا اور کہنے لگا۔ غضب ہوگیا۔ آپ کے فکر صاحب نے میرے خلاف کالم لکھ دیا ہے۔ میں نے تو آپ کی مدد کی تھی، آپ نے خوب صلہ دیا''۔

کالم پڑھ کر مجھے بھی غصہ آیا اور اسی حالت میں حضرت کے پاس پہنچا۔ جب سارا ماجرا کہہ سنایا تو بڑے نادم ہوئے۔ کہنے لگے'' بھول ہوگئی، آج کا کالم تو جا چکا ہے، پرسوں کا کالم اس کلرک کی حمایت میں لکھوں گا'' میں نے کلرک کو اطلاع دی کہ'' اب اگلا کالم تمہاری حمایت میں آئے گا، تم فکر مت کرو''۔

دوسرے ہی دن کلرک نے مجھے فون کر کے کہا'' فکر صاحب سے کہئے کہ وہ اب میری حمایت میں کالم نہ لکھیں۔ کیونکہ ہمارے ڈپارٹمنٹ نے اب تک ان کے پہلے کالم کا کوئی نوٹس نہیں لیا ہے۔ اب خواہ مخواہ اس مسئلہ کو چھیڑنے سے کیا حاصل؟''۔

کلرک کی بات معقول تھی۔ میں پھر فکر تونسوی کے پاس گیا اور بولا'' حضرت، اب آپ کالم نہ لکھئے کیوں کہ آپ کے پہلے کالم کا ڈپارٹمنٹ نے کوئی نوٹس نہیں لیا ہے۔ معاملہ دب گیا۔ اب آپ اس مسئلہ کو پھر کیوں چھیڑتے ہیں؟''۔

یہ سنتے ہی حضرت آگ بگولا ہوگئے بولے'' کیا کہا۔ ڈپارٹمنٹ نے میرے کالم کا کوئی نوٹس نہیں لیا ہے۔ یہ تو سراسر میری توہین ہے۔ میں اسے برداشت ہی نہیں کر سکتا۔ میں کل ہی اس ڈپارٹمنٹ کے خلاف کالم لکھوں گا کہ وہ عوامی شکایتوں کا کوئی نوٹس نہیں لیتا''۔

وہ ڈپارٹمنٹ کے خلاف کالم لکھنے پر تلے بیٹھے تھے۔ بڑی مشکل سے میں نے نتائج وعواقب سے انہیں آگاہ کیا۔ پھر یہ بھی بتایا کہ ان نتائج وعواقب سے اس بے چارے کلرک کی قسمت کس طرح وابستہ ہے۔ بڑی دیر کے بعد ان کی سمجھ میں بات آئی اور معاملہ رفع دفع ہوگیا، ورنہ بے چارے کلرک کا نہ جانے کیا بنتا۔

اسی حیدرآباد والے سفر کی بات ہے کہ ہم فرسٹ کلاس کے ڈبے میں سفر کر رہے تھے اور فکر صاحب کا بیان تھا کہ وہ پہلی بار فرسٹ کلاس کے ڈبے میں سفر کر رہے ہیں۔ اسی لئے ڈبے میں سوار ہوتے ہی انہوں نے ڈبے کی ایک ایک شے کو چھو کر دیکھنا شروع کیا۔ تاکہ پتہ چلے کہ فرسٹ کلاس کا ڈبہ کیسا ہوتا ہے۔ ابھی وہ ڈبے کا جائزہ لے ہی رہے تھے کہ دو فوجی عہدیدار جنہیں ہمارے کیبن میں جگہ ملی تھی داخل ہوگئے۔ حضرت نے دبی زبان میں مجھ سے کہا'' یار یہ تو بہت برا ہوا، کیا یہ حیدرآباد تک ہم پر پہرہ دیتے رہیں گے''۔ میں نے کہا'' لگتا تو ایسا ہی ہے''۔

Marfat.com

کچھ دیر تک حضرت سہمے رہے اور کہا " معاف کیجئے" ۔ پھر کھلکھلاتے ہوئے فوجی عہدیداروں سے بولے" میں پہلی بار فرسٹ کلاس کے ڈبے میں سفر کر رہا ہوں، آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ہے"۔

وہ بولے" ہمیں کیا اعتراض ہوسکتا ہے"۔

پھر حضرت خود ہی بولے" فکر تونسوی ہوں، اردو طنز و مزاح کا بریگیڈیر اور یہ ہیں مجتبیٰ حسین اردو طنز و مزاح کے فیلڈ مارشل"۔

فوجی عہدیداروں نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ اب جو حضرت نے اس قہقہہ کو پکڑ کر ان دونوں کے چھلکے اتارنے شروع کئے تو میں گھبرا گیا کہ کہیں یہ فکر تونسوی کے خلاف سنگین تان کر نہ کھڑے ہو جائیں۔ عجیب عجیب سوالات ان سے پوچھتے رہے۔ پوچھا" محاذ جنگ پر اگر آپ شکست کھا جائیں اور آپ کو مورچہ چھوڑ کر بھاگنا پڑے تو کیا آپ جوتوں سمیت بھاگتے ہیں یا آپ کو جوتے اتارنے پڑتے ہیں۔ اس معاملے میں فوجی قانون کیا ہے؟"۔

اب بے چارے فوجی عہدیدار اس کا کیا جواب دیتے۔ نظر جھکا کر خاموش ہوگئے۔ فکر تونسوی نے پے در پے ان پر حملے شروع کر دئے۔ یہاں تک کہ آدھے سفر کے بعد دونوں تقریباً پسپا ہوگئے اور اپنی اپنی وردیوں سے باہر نکل آئے۔ حیدرآباد تک فکر تونسوی انہیں اس طرح تنگ کرتے رہے کہ لگتا تھا یہ دونوں فوجی عہدیدار نہیں "Prisoners of war" ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سکندرآباد کے اسٹیشن پر یہ دونوں عہدیدار ہم سے نظریں بچا کر چھپتے چھپاتے اپنا سامان لے کر بھاگنے لگے تو حضرت نے پکار کر کہا" اب بھاگے جا رہے ہو تو ضرور بھاگ جاؤ مگر محاذ جنگ پر خدا کے لئے ہرگز نہ بھاگنا۔ یہ میری وصیت ہے سمجھے، ایمان سے"۔

میں نے بعد میں حضرت کو آڑے ہاتھوں لیا کہ" یہ کیا آپ خطرناک مذاق کرتے ہیں۔ فوجی عہدیدار ہیں، بندوق چلا دیں تو آپ ان کا کیا بگاڑ لیں گے"۔

بولے" یار یہ تو دشمن تک پر ٹھیک ڈھنگ سے گولی نہیں چلا پاتے، دوست پر کیا گولی چلائیں گے۔ یہ بات کہ میں نے انہیں کیوں چھیڑا تو بیٹا جواباً عرض ہے کہ ٹکر ہمیشہ اپنے سے طاقتور آدمی سے لینی چاہئے اور یہ بات بھی دھیان میں رکھو کہ تلوار اور قلم کی جنگ میں فتحیاب ہو کر واپس ہوئے ہو۔ ان کی ایک اور کمزوری لاہور ہے جسے وہ پیار سے" لہور" کہتے ہیں بات کسی بھی شہر کی چلے وہ اسے لاہور پر ہی لے جا کر ختم کریں گے۔ دہلی میں انہیں رہتے ہوئے پچیس برس بیت

Marfat.com

گئے مگر ابھی تک اپنے آپ کو دہلی کی سڑکوں اور گلیوں کے قابل نہیں بنا سکے۔ لاہور کا کہیں سے ذکر کیجئے اور دیکھئے کہ کس طرح لاہوران کی آنکھوں میں سمٹ کر آجاتا ہے ذرا اور ذکر کیجئے تو دیکھئے کہ کس طرح لاہوران کی آنکھوں سے آنسو بن کر ٹپکنے لگتا ہے۔

کہتے ہیں جب سے لاہور چھوٹا ہے تب سے کسی شہر میں رہنا نصیب نہیں ہوا۔ لاہور کی کیا بات ہے وہاں کا سورج ہی اور ہے، چاند ہی الگ ہے۔ وہاں پانی ایسے نہیں بہتا جیسے یہاں بہتا ہے۔ وہاں چڑیاں ایسے نہیں چہچہاتیں جیسے یہاں چہچہاتی ہیں۔

ایک بار ایک پاکستانی نژاد ادیب پاکستان سے ہندوستان آیا تو فکر تونسوی کو فون کیا وہ بھاگے بھاگے میرے پاس آئے۔ کہنے لگے" بھئی لاہور سے ایک نوجوان آیا ہوا ہے چلو ہم چل کر مل لیتے ہیں"۔

میں وہ اور مظفر حنفی مل کر پاکستانی ادیب کے پاس گئے تو فکر تونسوی وہاں جاتے ہی لاہوری ادیب سے یوں بغل گیر ہوئے جیسے انہیں پتہ ہی نہ ہو کہ ہم بھی ان کے ساتھ آئے ہیں۔

لاہوری ادیب کو یہ پتہ نہیں تھا کہ فکر تونسوی ہندو ہیں۔ وہ نام کی مناسبت سے انہیں مسلمان ہی سمجھ رہا تھا۔ اس نے رازدارانہ انداز میں فکر تونسوی سے پوچھا، یہ بتایئے آپ لوگ یہاں کس حال میں ہیں؟"۔

فکر تونسوی بولے" یہاں کیا اچھے رہیں گے جی۔ زندگی تو بس لاہور ہی میں ختم ہوگئی"۔

اس پر بھی نہ فکر تونسوی اس ادیب کی بات سمجھ سکے اور نہ ہی وہ ادیب فکر تونسوی کی بات کا مطلب سمجھ سکا۔ قبل اس کے کہ وہ کوئی اور رازدارانہ بات کہتا میں نے مذاق مذاق میں کہا" قبلہ یہاں ہم لوگ کس حال میں ہیں؟ یہ سوال تو آپ ہم سے پوچھئے۔ خدا کے فضل سے اچھے ہیں اور فکر تونسوی جیسے ہندو دوست ہمیں یہاں ملے ہوئے ہیں"۔

وہ معاملہ کو تاڑ کر فوراً سنبھل گیا مگر فکر تونسوی بھی بات کا مطلب نہیں سمجھے اور" لہور لہور" کی رٹ لگائے رہے۔ لاہور کے ایک ایک ادیب، ایک ایک شاعر کے بارے میں تفصیل سے پوچھا۔ پھر لاہور کی سڑکوں کی جانب متوجہ ہوئے۔ پوچھا وہ روڈ کیسی ہے، وہ گلی کیسی ہے۔ کیا انارکلی پر اب بھی شام کی رونق لگتی ہے اور یار وہ ایک پنواڑی ہوتا تھا، کیا وہ اب بھی زندہ ہے۔ نہ جانے وہ کیا کیا پوچھتے رہے۔ مگر جب انہوں نے بڑی دلچسپی کے ساتھ یہ سوال پوچھا کہ" یار یہ بتا کہ انارکلی کے چوراہے پر ایک بھوری گائے بیٹھا کرتی تھی میں اسے روز روٹی کھلایا کرتا تھا کیا وہ

Marfat.com

اب بھی وہاں بیٹھتی ہے؟۔

اس سوال کے بعد میں نے محسوس کیا کہ اب لاہور سر سے اونچا ہو گیا ہے۔ لہٰذا میں نے حضرت کو ٹوکتے ہوئے کہا کہ "قبلہ وہ گائے تو انارکلی کے چوراہے پر ضرور بیٹھتی ہو گی مگر کم از کم اب تو آپ یہاں سے اٹھئے، دفتر کے لئے دیر ہو رہی ہے"۔

بادل ناخواستہ اٹھے مگر "لہور لہور" کی گردان کرتے چلتے رہے۔

دوسرے دن میں نے ان کے بچپن کے دوست بلراج ورما سے کہا "ورما جی، یہ فکر صاحب ہمیشہ "لہور لہور" کیا کرتے رہتے ہیں؟۔

یہ سنتے ہی ورما جی نے کہا "کیا کہا 'لاہور۔

میں نے کہا "جی نہیں فکر تونسوی"۔

وہ بولے "ارے صاحب، لاہور کی کیا بات ہے، لاہور تو بس لاہور ہے۔ وہاں کا سورج ہی اور ہے، چاند ہی الگ ہے، وہاں پانی ایسے نہیں بہتا جیسے یہاں بہتا ہے"۔ اس پر میں نے "اب بس کیجئے میں جانتا ہوں کہ وہاں چڑیا ایسے نہیں چہچہاتیں جس طرح یہاں چہچہاتی ہیں۔" مجھے یوں محسوس ہوا جیسے لاہور شہر نہیں ہے، ایک مرض ہے اور وہ بھی متعدی۔ جس کے سامنے ذکر کیجئے وہ ہذیان بکنے لگتا ہے۔

ہاں تو میں حضرت قبلہ کا ذکر کر رہا تھا۔ حضرت قبلہ نے اس دنیا میں آ کر کوئی کام کیا ہے تو بس یہی کہ بیٹھے فقرے ڈھالتے رہتے ہیں۔ کسی نے انہیں کچھ کہہ دیا اور انہوں نے ایک فقرہ نکال کر اس کی خدمت میں پیش کر دیا۔ سماج نے ان کے خلاف کوئی زیادتی کی اور انہوں نے سماج کے خلاف ایک زوردار پھڑکتا ہوا طنزیہ فقرہ نکال دیا اور مطمئن ہو گئے۔

انہیں جب بھی دیکھتا ہوں تو مجھے اپنے گاؤں کا وہ مجذوب یاد آ جاتا ہے جو دن بھر پاگلوں کی طرح گھومتا رہتا تھا۔ ہم بچوں کی طبیعت موج میں ہوتی تو ہم میں سے کوئی جا کر اسے چھیڑ دیتا تھا۔ اس پر وہ ایک گندی گالی ہم لوگوں کی طرف پھینک دیتا تھا۔ ہم لوگ خوش ہو کر کرتالیاں بجاتے اور وہ ایک اور زبردست گالی ہماری طرف اچھال دیتا تھا۔ پھر یہ سلسلہ چلتا رہتا۔ وہ ایک سے ایک اعلیٰ وارفع گالی ہمیں دیتا۔ پھر ہم میں سے کوئی شریر بچہ اسے پتھر دے مارتا۔ اس کے ساتھ ہی وہ مجذوب زور زور سے چیخنے اور رونے لگ جاتا۔ اس کی چیخوں کو سنتے ہی ہمارے ہاتھوں سے پتھر خود بخود چھوٹ جاتے۔ ہم حیرت سے اسے دیکھتے رہتے۔ پھر رفتہ رفتہ ہماری

Marfat.com

آنکھیں بھی بھیگ جاتیں اور ہم میں سے کوئی اس کے لئے روٹی لاتا، کوئی اس کے لئے پانی لاتا، کوئی اسے سگریٹ دیتا اور وہ پاگل پھر سے ہنسنے لگتا۔

نہ جانے کیوں میں اپنے ذہن میں فکر تونسوی کا تقابل اس مجذوب سے کرنے لگ جاتا ہوں۔ شاید اس کے لئے کہ فکر تونسوی کو جب بھی سماج چھیڑتا ہے تو وہ ایک طنزیہ فقرہ اس کی طرف اچھال دیتے ہیں۔ فقرے نکالتے نکالتے اب ان کا طنز ایک چیخ بن گیا ہے۔ لیکن مجھے دکھ اس بات کا ہوتا ہے کہ جب گاؤں کے مجذوب کی گالی چیخ بن جاتی تھی تو ہمارے ہاتھوں سے پتھر خود بخود چھوٹ جاتے تھے اور ہم اس کے زخم کا مرہم بن کر اس کی طرف دوڑ پڑتے تھے، فکر تونسوی کی بدقسمتی یہ کہ سماج کے ہاتھوں میں پتھر جوں کے توں موجود ہیں۔ میں اس دن کا منتظر ہوں جب سماج اپنے ہاتھوں کے پتھر پھینک کر اور اپنی آنکھوں میں آنسو لا کر فکر تونسوی کی جانب بڑھے اور ان کے زخموں پر مرہم رکھ دے نہ جانے وہ وقت کب آئے گا، اس وقت کے آنے تک میں یہی سمجھوں گا کہ میرے گاؤں کا مجذوب اتنا بدنصیب نہیں تھا جتنے کہ فکر تونسوی ہیں۔

☆☆☆

Marfat.com

مخدوم زادہ مختار عثمانی

قیصر حیدری دہلوی

شہر دہلی جو زمانہ قدیم سے علمی و ادبی تہذیبی روایات کی ممتاز آماجگاہ رہا ہے آپ کی ولادت اسی شہر کی معروف محلّہ شاہ گنج میں ۱۷ر جون ۱۹۲۸ء کو ہوئی۔ آپ کے آباؤ اجداد براہ افغانستان ایران سے دلّی آئے اور یہیں مغل عہد کے شاہوں کے نمک خوار ہوئے۔ سرسید احمد خاں کی کتاب ''آثار الصنادید'' میں جو نشاندہی کی گئی اس میں آپ کے جدامجد مرزا اشرف بیگ کپتان کا تذکرہ شاہ عادل شاہ ثانی کے خاندان تک تحریر ہے اور شجرۂ نسب بھی اسی معروف ہستی کے نام نامی سے شروع کیا گیا ہے جس نے دلّی کی شاہ مرداں کی چہار دیواری اور قدم شریف نبی کریم کی عمارت وغیرہ بحکم والدہ شاہ عادل شاہ ثانی تعمیر کرائی تھی۔

انہیں کی ایک روایت کے مطابق ان کے اسلاف فنِ سپہ گری اور فنِ تعمیر کے ماہرین میں شمار کئے جاتے تھے حالات اور وقت نے اس خاندان کو تلوار اور دولت سے عاق کر کے قلم کا تحفہ دے دیا تھا۔ ان کے دادا آغا حسن وزیر دہلوی اور حقیقی ماموں خیام الہند سید جلال الدین حیدر دہلوی اپنے عہد کے ممتاز اور مستند اساتذۂ سخن میں شمار کئے جاتے تھے چونکہ حضرت حیدر دہلوی نے آپ کو متبنّٰی بنالیا تھا اس لئے آپ کی تمام تر ذہنی و تعلیمی تربیت کی نگرانی بھی موصوف ہی نے فرمائی یہی وجہ ہے کہ جب آپ نے ہوش سنبھالا تو خود کو آغوشِ شعر و ادب میں پایا۔

آپ کے والد بشیر احمد نے ان کا نام نور احمد تجویز کیا تھا کہ مگر نانی محترمہ جو خود بھی شاعری سے شغف رکھتی تھیں اور گجراتی زبان میں شعر کہتی تھیں، قیصر تجویز کیا اور یہی نام زباں زدِ عام ہوا۔ حیدری کا لاحقہ انہوں نے اپنے ماموں اور استاد خیام الہند حضرت حیدر دہلوی کے حوالہ سے لگا لیا۔ پرائمری اسکول کے بعد ان کی تعلیم نبی باغ نیو ماڈل ہایئر سکنڈری اسکول چتلی قبر میں ہوئی

Marfat.com

جہاں انہوں نے خود اپنی روایت کے مطابق انٹرمیڈیٹ تک تعلیم حاصل کی تھی اور پھر عربی فارسی اور اردو حکیم سید حسن دہلوی حکیم محمد صدیق دہلوی اور ماسٹر محمد حسین قانع چندوسوی سے پڑھی۔

اس دور کے جن اساتذہ سے آپ نے اپنے ماموں حیدر دہلوی کے توسل سے وقتاً فوقتاً اپنے ذوق شاعری کو جلادی ان میں ابو المعظم نواب سراج الدین احمد خاں سائلؔ دہلوی، وحید العصر وحید الدین بیخودؔ دہلوی، علامہ آرزوؔ لکھنوی، آغا شاعرؔ قزلباش دہلوی، علامہ برج موہن دتاتریہ کیفیؔ دہلوی، پنڈت گوپی ناتھ امنؔ لکھنوی، علامہ شہاب اکبرآبادی، پنڈت چنڈی پرشاد شیدؔا دہلوی، پنڈت امرناتھ مدان ساحرؔ دہلوی، نوحؔ ناروی، جگر مرادآبادی، نواب جعفر علی خاں اثرؔ لکھنوی، احسان دانشؔ، علامہ ناطقؔ گلاوٹھی، جوشؔ ملیح آبادی، منشی مہاراج برقؔ دہلوی، منشی چندر بھان کیفیؔ، حکیم آزادؔ انصاری، سر رضا علی، حفیظ جالندھری، قابل گلاوٹھی، مانی جائسی، بہزادؔ لکھنوی، حکیم ماہر اکبرآبادی، عبدالمجید سالک، صوفی غلام مصطفےٰ تبسم اور خواجہ حسن نظامی قابل ذکر ہیں۔ اردو مجلس خواجہ محمد شفیع دہلوی نے ۱۹۳۹ء میں قائم کی تھی قیصر حیدری کی شعری پرورش میں اس گہوارۂ علم وادب کا بھی بڑا ہاتھ رہا ہے۔ آپ نے ۱۹۴۰ء سے مشاعروں میں باقاعدہ شرکت کا آغاز کیا۔ آپ اپنے مخصوص ترنم سے مشاعروں کو لوٹ لیا کرتے تھے۔ آپ کو بار بار زحمتِ کلام دی جاتی تھی۔ اور پھر مسکراتے ہوئے تشریف لاتے اور سامعین کی فرمائش پر اپنی غزلوں کا جادو جگاتے۔

نکلتا ہوا قد۔ چھریرا بدن، سانولا رنگ، نورانی ریش مبارک، دراز زلفیں، گلے میں عربی رومال، روشن جبیں، چمکدار آنکھیں متبسم چہرہ، نیک دل بے غرض، مخلص، مہمان نواز، گفتگو میں اخلاص اور نرمی دوست نواز، دشمن فراموش، بلا کے ذہین، فنون لطیفہ کے دلدادہ، صوفی ازم سے متاثر اور ان کی اپنائیت ہر ملنے والے کو اپنی جانب کھینچتی تھی۔ یہ تھے جناب قیصر حیدری جنھوں نے مشاعروں میں خود کو مدعو کرانے کے لئے کسی چوکھٹ پر کبھی حاضری نہیں دی اور نہ ہی کسی عالی جاہ کو سلام پیش کرنے گئے۔ وہ ایک خوددار وضع دار اور باوقار شخصیت رکھتے تھے۔ وہ مالی اعتبار سے غریب و نادار تھے مگر غربت اور ناداری میں ان کا دل جتنا امیر تھا، ان کی مہمان نوازی جتنی وسیع تھی، ان کے اخلاق میں جتنا چاؤ تھا، وہ بڑے بڑے امیروں کے حصے میں بھی نہیں آتا ہے۔ انہوں نے ٹین کی ٹوٹی ہوئی کرسی اور لکڑی کی بینچ پر بٹھلا کر نہ جانے کتنے معروف و مشہور شعرا کی ضیافت کی ہے۔ فارغ البالی میں تو کوئی بھی غیرت مند بن سکتا ہے مگر مفلوک الحالی میں غیرت اور

Marfat.com

اپنی کج کلام ہی برقرار رکھنا صرف قیصر حیدری جیسے امیر دل رکھنے والے فقیروں کا ہی کام ہوسکتا ہے۔

اپنی علمی وادبی استعداد اور ذہانت کی نشوونما کی تعمیر کے لئے جن بزرگوں کی محبت سے آپ مستفیض ہوئے ان میں علم وحکمت میں حکیم ہاشم جان کیف (نبیرہ حکیم اجمل خاں شیدا دہلوی) اور حکیم شوکت علی گیلانی سے علم نجوم وفلکیات کے لئے فیروز نور محمد فیروز آبادی اور کشن چند جوش لاہوری سے فن صحافت وسیاست میں ڈاکٹر سید محمود علی قادری، اسعد گورکھپوری سے روحانی نسبت کے حصول کے لئے الحاج صوفی محمد یٰسین خاں صادقؔ مخموری دہلوی (قادری چشتی۔ ابوالعلائی، جہانگیری، حسنی) سے فن خطاطی کے لئے سید محبوب الٰہی دہلوی اور مولانا محمد یعقوب سہارنپوری سے اور فن موسیقی میں استاد چاند خاں اور استاد عثمان خان قابل ذکر ہیں۔ ہمارے عہد میں مختلف علوم سے یہ لگاؤ اور دلچسپی اب رفتہ رفتہ کم ہوتی جارہی ہے مگر قیصر صاحب نے نہ صرف ان علوم کو حاصل کیا تھا بلکہ مختلف رسائل اور جرائد کے لئے طبی مشورے اور قسمت کا حال لکھ کر انہوں نے ان علوم کے علمی نمونے پیش کیے تھے۔

شعری خدمات کے اعتراف میں دہلی اردو اکادمی کی طرف سے آپ کو دو سال کے لئے وظیفہ تفویض کیا گیا تھا۔ آپ نے ساری زندگی حالات کی موجوں کے تھپیڑوں سے ٹکرا کر گزاری ہے بقول آپ کے:

طوفاں سے کھیلنے میں مزا زندگی کا ہے
کشتی وہ کیا کہ جو لب ساحل چلی گئی

اپنے محدود وسائل کے باوجود اردو ادب کی خدمت کسی نہ کسی طور پر انجام دیتے رہے چاہے وہ میر تقی میر کلچرل سوسائٹی کی بنیاد پر ہو یا ادبی جنتری کا اجرا ہو یا آغوش، پامسٹ، جادہ نور اور شہر میر جیسے ادبی جریدے جاری رکھنا ہوں یا دوسری انجمنوں کی سرپرستی، نئی نسل کے ابھرتے ہوئے شعراء کی ایک بڑی تعداد آپ کی مداح اور پرستار تھی جب تک وہ استاد قیصر حیدری سے ملاقات نہ کر لیتے اور ان کی ہم نشینی میں چند لمحات نہ گزار لیتے تھے ان کو چین نہیں آتا تھا۔ قیصر صاحب بھی نوجوانوں کو اپنے مشفقانہ مشورے اور ان کی حوصلہ افزائی کے لئے ہمہ تن گوش رہتے تھے۔ ایک عرصہ تک آپ کی روزانہ نشست سلیمان ٹی اسٹال میں آدھی رات تک جمی رہتی تھی۔ چاہے گرمی ہو یا برسات، سردی ہو یا شہر کے حالات خراب ہوں آپ بلاناغہ وہاں آجاتے تھے۔ وہاں اور

Marfat.com

موضوعات کے علاوہ شعروادب کا سلسلہ جاری رہتا ان سے ملاقات کے لئے بے شمار بیرونِ دتی کے شعراء وادبا بھی نیو پبلک پریس سلیمان ٹی اسٹال میں تشریف لاتے اور قیصر صاحب سے ملاقات کرنا باعث فخر سمجھتے تھے۔

قیصر حیدری خواہش پرستی اور دنیوی حرص وطمع کے اس طوفانی عہد میں صبر وقناعت کی درویشانہ صفت کے مظہر تھے۔ وہ ایک بھرے پھرے خاندان کے انسان تھے مگر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ تنہا اس دنیا میں آئے ہیں اور تنہا اس دنیا سے چلے جائیں گے۔

آپ کے تین مجموعے خط غبار (غزلیات)، موجیں (معریٰ نظمیں)، تلافی (منتخب اشعار) منظر عام پر آکر قبولِ خاص وعام ہو چکے ہیں۔ فن خوش نویسی کا سلسلہ قائم نہ رہنے کی وجہ سے ساہتیہ کلا پریشد (حکومت ہند) نے ایک سو پچاس روپے ماہانہ وظیفہ تا زندگی جاری رکھا۔ آل انڈیا میر اکادمی لکھنؤ نے آپ کو "امتیازِ میر" ادبی ایوارڈ سے نوازا۔

آپ کے مجموعہ کلام "خط غبار" پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر ملک زادہ منظور احمد نے تحریر فرمایا تھا:

> "اس میں شک نہیں کہ اردو غزل صدیوں کا سفر طے کر کے نئی جہتوں اور نئے امکانات سے آشنا ہو چکی ہے مگر اس بات پر اختلاف رائے کی گنجائش کم ہے کہ روایت کے صنم کدوں کا نور آج بھی نگار خانہ غزل کو منور کرتا ہے۔ جناب قیصر حیدری کی غزلیں بھی اسی نور کے روشن اور تابناک موضوعات سے اپنا رشتہ جوڑ کر ہمارے لئے ایک قیمتی سرمایہ اور مقدس ترکہ بن جاتی ہیں۔ انہوں نے صرف حسن و عشق، ناز و نیاز، ہجر و وصال اور شوق وانتظار کے مضامین تک اپنے آپ کو محدود نہیں رکھا ہے بلکہ جگہ جگہ بصائر وتامّلات کے ایسے پہلو پیدا کئے ہیں جن کی جس قدر بھی داد دی جائے کم ہے "خط غبار" کا مطالعہ اس بات کا ثبوت فراہم کرتا ہے کہ قیصر حیدری نہ تو اپنی ذات میں اتنا گم ہیں کہ حیات وکائنات کے مسائل کی طرف توجہ نہ دے سکیں اور نہ حیات وکائنات کے مسائل کی طرف اتنا منہمک کہ اپنے دل کے داغوں کی بہار کو نہ دیکھ سکیں یہی متوازن اندازِ نظر اور فن کی یہی سلاست روی قیصر حیدری کو جدید اور قدیم کے اختلاف سے بلند کر کے ہر عہد کا ایک خوش فکر شاعر تسلیم کرنے پر مجبور کرتی ہے"۔

Marfat.com

۲۶ر جولائی ۱۹۵۳ء کو ان کی شادی حاجی حافظ سلیمان دہلوی کی صاحبزادی صابرہ خاتون رومان دہلوی سے ہونے کے بعد وہ خانگی الجھنوں کا شکار ہو گئے۔ ۱۰ر ستمبر ۱۹۶۷ء کو اہلیہ کا انتقال ہو گیا۔ چوں کہ خاندان کے سبھی افراد ۱۹۴۷ء میں تقسیم کی نذر ہو گئے تھے مگر انہوں نے حب الوطنی کے جذبے کی وجہ سے اپنے آپ کو اس تقسیم سے محفوظ رکھا اور آپ پاکستان منتقل نہیں ہوئے تھے، مگر اہلیہ کے انتقال کے بعد مسلسل خاندانی افراد کے مجبور کرنے کی وجہ سے ۴ر اگست ۱۹۶۸ء کو کراچی چلے گئے تھے مگر اپنے مزاج کی وجہ سے اپنے آپ کو اس ماحول میں ایڈجسٹ نہیں کر پائے اور وہاں سے جلد ہی واپس اپنے وطن لوٹ آئے۔ مگر واپسی کے بعد ان کا رشتہ اپنے تمام اعزا اور متعلقین سے کٹ سا گیا اور اس دنیا میں یکہ و تنہا رہ گئے۔ انہوں نے حاجی محمد صدیق کے نیو پبلک پریس، گلی قاسم جان کے ایک گوشے میں رہائش اختیار کر لی اور اسی گوشے میں زندگی کے بقیہ ایام گزارنے کے بعد اپنی جان ۹ر فروری ۱۹۹۲ء کو جاں آفریں کے سپرد کر دی۔

☆★☆

کمار پاشی

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ

مومنؔ کی موت پر غالبؔ نے نبی بخش حقیر کو ایک خط میں لکھا تھا کہ مرحوم سے میرے چالیس برس کے دوستانہ تعلقات تھے۔ چالیس سال پرانا دوست تو کیا دشمن بھی کسے نصیب ہوتا ہے۔

میرے اور کمار پاشی کے دوستانہ مراسم بھی اتنے ہی پرانے تھے۔ ہم دونوں اپنی نوجوانی کے دنوں میں ایک دوسرے سے ملے اور جب پاشی نے اس دنیا سے منہ موڑا تو ہم دونوں ہی زوال عمر کی سرحدوں میں داخل ہو چکے تھے۔ درمیان میں ایسے موقع بھی آئے کہ ہم آپس میں جھگڑ پڑے لیکن ایک کو دوسرے سے جو تعلق خاطر تھا اس میں کبھی کمی نہ آئی۔

میں نے فروری ۱۹۵۳ء میں اپنے آبائی شہر ٹونک کو خیر باد کہا اور دہلی آ گیا۔ دہلی میں شروع شروع جن لوگوں سے دوستیاں قائم ہوئیں ان میں کمار پاشی بھی تھا جس کی شاعری کی ابتداء ہوئی تھی۔ ہماری پہلی ملاقات دہلی پبلک لائبریری میں منعقدہ ایک شعری نشست میں ہوئی تھی۔ اس سے پہلے میں کمار پاشی کے نام سے بھی واقف نہیں تھا۔ جب یہ نام پکارا گیا تو گہرے سانولے رنگ تیکھے نقوش، دبلے پتلے جسم کا ایک دراز قد نوجوان جس کی آنکھوں میں ذہانت کی تیز چمک تھی، مائک پر آیا اور ''شام'' کے عنوان سے ایک نظم پڑھی۔ مجھے اس نظم نے چونکا دیا۔ نئی اپروچ، نئی لفظیات اور نئی تعبیرات، نشست کے بعد ہم دونوں میں علیک سلیک ہوئی اور یہاں سے ہمارے درمیان اس قربت کا آغاز ہوا جو آگے چل کر اولاً دہلی کے ادبی حلقوں میں اور پھر دور دور تک ضرب المثل کی طرح مشہور ہو گئی۔

کچھ وقفہ کے بعد میں ماہنامہ ''تحریک'' کے ادارۂ تحریر میں شامل ہو گیا۔ اس رسالے کے

Marfat.com

مالک اور مدیر اردو کے پختہ کار صحافی اور شاعر گوپال متل تھے۔ ان دنوں ادب میں ترقی پسندی کا بول بالا تھا۔ اردو کے اکثر ادیب اور شاعر یا تو ترقی پسندوں کے ساتھ تھے یا ان سے مرعوب اور خوفزدہ۔ ''تحریک'' ترقی پسندوں کے رد اور مخالفت میں نکالا گیا تھا اس لئے بہت سے پرانے قلمکاروں کو اس کی قلمی معاونت میں تامل تھا لیکن نئے لکھنے والے جنہیں ترقی پسندوں کی بالادستی قبول نہیں تھی انہوں نے بڑی خوش دلی سے ''تحریک'' کی طرف دست تعاون بڑھایا۔ ان میں پاشی بھی تھا۔ ''تحریک'' میں پاشی کی جو پہلی نظم شائع ہوئی وہ وہی تھی جو اس نے دہلی پبلک لائبریری کی نشست میں سنائی تھی۔

کمار پاشی کے آبا و اجداد دہلی کے باشندے تھے لیکن ۱۸۵۷ء کے ہنگامۂ دار و گیر میں وہ ترک وطن کر کے ملتان چلے گئے تھے۔ پورے نوے سال کے بعد ۱۹۴۷ء میں اسی طرح کے ہنگامی حالات میں ان کا خاندان ریاست بھاولپور کو خیر باد کہہ کر جو تقسیم ملک کے نتیجے میں پاکستان کا حصہ بن گیا تھا، ہندوستان آیا اور چند مہینے جے پور میں قیام کے بعد دلی میں آبسا۔ اس طرح پاشی کی پیدائش اگرچہ بھاولپور کی تھی جسے وہ بغداد الجدید کے نام سے یاد کرتے تھے، لیکن دہلی سے ان کی وطنی نسبت بہت قدیم تھی اور اگرچہ ان کی مادری زبان سرائکی تھی لیکن وہ پہچانے گئے اس زبان کے شاعر اور ادیب کی حیثیت سے جس نے دلی اور اس کے گردونواح میں کھڑی بولی کے بطن سے جنم لیا تھا۔

کمار پاشی کا پہلا شعری مجموعہ ''پرانے موسموں کی آواز'' ۱۹۶۶ء میں شائع ہوا۔ اس کی اشاعت کے ساتھ ہی ہمعصر اردو شاعری کے منظرنامے میں ایک ایسے رنگ کا اضافہ ہوا جو دوسرے رنگوں سے مختلف ہی نہیں منفرد بھی تھا۔ پاشی کی نظمیں اپنی لفظیات، اسلوب اور موضوع، ہر اعتبار سے توجہ طلب تھیں، تکنیک کی سطح پر وہ کسی حد تک میراجی سے متاثر نظر آتے تھے لیکن یہ اثر پذیری کوری تقلید یا نقالی سے کوئی علاقہ نہیں رکھتی تھی، میراجی کی شاعری کا بنیادی محرک جنسی ناآسودگی کا احساس اور ان کے فکر و خیال کا محور و مرکز مرد اور عورت کا جسمانی تعلق ہے جو انہیں اپنی طرف سے بہت کم باہر نکلنے دیتا ہے۔ کمار پاشی کو جنس کے موضوع سے بھی گہری دلچسپی تھی لیکن اس کا اصل ذہنی شغف انسان کے تاریخی اور تہذیبی کردار کے ساتھ تھا۔ تہذیب کے حوالے سے پاشی کی جذباتی وابستگی ہندوستان کے عہد قدیم اور اس کی پروردہ روایات یا اساطیر کے ساتھ تھی۔

کمار پاشی کا دوسرا شعری مجموعہ ''خواب تماشہ'' تھا جو ۱۹۶۸ء میں منظر عام پر آیا۔ یہ مجموعہ کمار

Marfat.com

پاشی کی فکر کا ایک اور پہلو سامنے لاتا ہے۔اس وسیع عریض کائنات میں جو ازل سے ابد تک کو محیط ہے۔ چند سانسوں کے مہمان انسان کی حیثیت کیا ہے۔انسان کے لئے جو چند سانسوں کا مہمان ہے، خود یہ کائنات کیا حیثیت رکھتی ہے۔غالب نے دنیا کو بازیچۂ اطفال کہا تھا لیکن پاشی اسے ایک ایسا تماشا قرار دیتا ہے جو خواب میں دیکھا جا رہا ہے۔غالب پھر یاد آئے۔یہ بھی تو انہی نے کہا ہے:

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ
جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سود تھا

''خواب تماشا'' کے بعد جس میں پاشی کی نظم ''گندے دنوں کا قصہ'' بھی شامل تھی اس کی ایک طویل نظم ''ولاس یاترا'' ۱۹۷۲ء میں کتابی صورت میں سامنے آئی۔اس کتاب کا پیش لفظ بلراج کومل نے لکھا تھا، اور انہوں نے اپنے پیش لفظ کو ایک ایسے قلعہ کو سر کرنے کی ناکام کوشش قرار دیا تھا جس کے دروازے ان پر پوری طرح وا نہ ہو سکے۔دراصل ''ولاس یاترا'' پاشی کی نظم گندے دنوں کا قصہ کی ہی توسیع تھی۔''گندے دنوں کا قصہ'' اور ''ولاس یاترا'' یہ دونوں نظمیں پاشی کے اس احساس کی ترجمان ہیں کہ جب ایک تہذیب دوسری تہذیب پر غالب آتی ہے تو وہ اس کی پاکیزگی کو مجروح کرتی ہے۔ہم ان نظموں کو دو حوالوں سے سمجھ سکتے ہیں: دراوڑ تہذیب پر آریاؤں کی یلغار یا پھر آریہ اقتدار پر ان مسلمانوں کا حملہ جن میں سامی اور آریائی اثرات گڈمڈ ہو گئے تھے۔

کمار پاشی لگ بھگ چالیس برس تک میری خلوت وجلوت کا ساتھی یا میں اس کی خلوت و جلوت کا شریک رہا ہوں۔بہت سے موقع ایسے آئے جب ہم ایک دوسرے کے سامنے اپنے معنوی وجود، اپنی داخلی شخصیت کے ساتھ ننگے ہو گئے۔اگر اس صورت حال کی گواہی قابل اعتبار ہو تو میری اس گزارش کو قبول کر لیجئے کہ پاشی کے لئے مذکورہ بالا دونوں تاریخی واقعہ ناخوشگوار تھے، اور وہ انہیں ایک ناپاک عمل سمجھتا تھا۔فراق کا بہت مشہور شعر ہے:

ذرا وصال کے بعد آئینہ تو دیکھ اے دوست
ترے جمال کی دوشیزگی نکھر آئی

ہمارے ناقدین کرام اس شعر کو جس چوکھٹے میں رکھ کر اس کی تعریف وتحسین کرتے رہے ہیں یہ شعر اس چوکھٹے میں اپنے پورے ابعاد کے ساتھ نہیں سماتا، اس کی چھوٹ ایک تہذیب کے

ساتھ دوسری تہذیب کی ہم بستری تک پہنچتی ہے۔ میرا دوست کمار پاشی اس ہم بستری کے جواز کا قائل نہیں تھا۔

۱۹۷۳ء میں کمار پاشی کا چوتھا مجموعہ ''انتظار کی رات'' کے نام سے شائع ہوا۔ پاشی کے ہر مجموعے کا نام معنی خیز ہے ''انتظار کی رات'' میں وہ نسل آدم کے اس نجات دہندے کا منتظر نظر آتا ہے جس کا انتظار ہر دور کے نیک دل انسانوں کو رہا ہے۔ یہ نجات دہندہ کون ہوگا، پاشی اس بارے میں وضاحت یا تفصیل سے کچھ نہیں بتاتا لیکن مجملاً ہمیں اس کے خط و خال سے اپنی مخصوص استعاراتی زبان میں متعارف ضرور کرا دیتا ہے اور یہ خط و خال آسمانی نہیں، ارضی ہیں۔

پاشی کو چیلنج قبول کرنا اچھا لگتا تھا۔ اس کی نظموں کا اتنا چرچا ہوا کہ لوگ اسے صرف نظم گو شاعر کی حیثیت سے قبول کرنے لگے حالانکہ اس نے غزلیں اور رباعیاں بھی کہی تھیں۔ ۱۹۷۶ء میں اس نے اپنا ایک مجموعہ ''روبرو'' شائع کیا جو صرف غزلوں پر مشتمل تھا، اس مجموعے کی اشاعت کے بعد شاعری کے سنجیدہ قارئین نے ایک غزل گو کی حیثیت سے بھی اس کی قدر اور قیمت پہچانی اور اس کا نام اچھے غزل گو شعرا کے ساتھ لیا جانے لگا۔

''روبرو'' کے بعد کمار پاشی کی زندگی میں اسکے دو اور مجموعے اردو رسم الخط میں شائع ہوئے ۱۹۷۹ء میں ''اک موسم مرے دل کے اندر اک موسم مرے باہر'' اور ۱۹۸۴ء میں ''زوال شب کا منظر'' یہ عنوان میں نے اسے بجھایا تھا اگرچہ یہ اسی کے ایک شعر سے ماخوذ ہے۔ شعر یہ ہے:

زوالِ شب کا ہر منظر ہے مجھ میں
میں سورج سے بھی پہلے جاگتا ہوں

کمار پاشی کی آخری شعری مجموعہ ''چاند چراغ'' تب شائع ہوا جب یہ سورج سے بھی پہلے جاگنے والا ہمیشہ کی نیند سو گیا تھا۔

کمار پاشی کا ایک مجموعہ ''اردھانگنی کے نام'' ۱۹۸۶ء میں دیوناگری لپی میں شائع ہوا تھا۔ یہ گھر آنگن کی شاعری تھی اور اس میں اس نے اپنی شریکِ حیات سے اپنی بے اعتدالیوں اور بے راہ رویوں کی معذرت کی تھی۔ اس کتاب کا اجرا ہندی کے مشہور ناقد نامور سنگھ نے کیا تھا۔ میں بھی جلسے میں شریک تھا۔ نامور سنگھ نے کہا تھا کہ اگرچہ یہ نظمیں دیوناگری لپی میں چھپی ہیں اور ان کی زبان ہندی سے قریب ہے لیکن یہ ہندی کی نظمیں نہیں اردو کی نظمیں ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے پاشی یہ سن کر خوش نہیں ہوا تھا کیونکہ اس نے یہ نظمیں اپنی دانست میں ہندی میں کہی تھیں۔

Marfat.com

کمار پاشی ایک ہم جہت تخلیقی شخصیت کا مالک تھا۔اس نے شعر گوئی کے علاوہ افسانے اور ڈرامے بھی لکھے اور یہاں بھی اپنی انفرادیت کا نقش قائم کیا۔اس کے افسانوں کا مجموعہ ''پہلے آسمان کا زوال''۱۹۷۲ء میں چھپا۔ ۱۹۷۳ء میں اس کے ڈراموں کا مجموعہ ''جملوں کی بنیاد'' اور ۱۹۸۰ء میں ''زوال کے قیدی'' شائع ہوا۔جن لوگوں نے یہ مجموعے پڑھے ہیں وہ میرے اس خیال کی تائید کریں گے کہ پاشی یہاں بھی سب سے الگ کھڑا نظر آتا ہے۔

کمار پاشی اعلیٰ تنقیدی شعور بھی رکھتا تھا۔اس نے کچھ دوستوں کے تعاون سے ایک سہ ماہی رسالہ ''سطور'' نکالا تھا۔اس رسالے میں اس نے عصری ادبی مسائل پر جو اظہارِ خیال کیا اس کا وزن و وقار اس وقت بھی محسوس کیا گیا تھا اور آج بھی اس کی تحریریں پڑھ کر یہ احساس تازہ ہو جاتا ہے کہ نبضِ عصر پر اس کی گرفت کیسی مضبوط تھی۔

کمار پاشی کی بہت سی تالیفات بھی ہیں، سالانہ شعری انتخابات کے علاوہ جو اس نے راج نرائن رازؔ کے ساتھ مل کر کیے تھے، کچھ اور کتابیں بھی اس نے مرتب کیں جن میں ہمعصر افسانوں کا انتخاب ''دھوپ اور سمندر''، ''محمد علوی: ایک مطالعہ''، ''میراجی: فن اور شخصیت''، ''گوپال متّل: فن اور شخصیت'' شامل ہیں۔

جن لوگوں نے کمار پاشی کی صرف گھر سے باہر کی زندگی دیکھی ہے، وہ اسے ایک غیر ذمہ دار اور لا اُبالی قسم کا انسان سمجھتے ہوں گے لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس نے بڑی ذمہ دارانہ زندگی گزاری اس کے کوئی اولادِ نرینہ نہیں تھی، پانچ بیٹیاں تھیں، اس نے ان سب کو اچھی تعلیم دلوائی، چار بیٹیوں کے لئے اپنی زندگی ہی میں اچھے رشتے تلاش کیے اور دھوم دھام سے ان کی شادیاں کیں۔

اس نے کئی دفتروں میں کام کیا، کام کے اوقات کے بعد اس کے دفتر کا وہ کمرہ جس میں بیٹھ کر وہ کام کرتا تھا، دوستوں کی نشست گاہ میں تبدیل ہو جاتا تھا۔اور سورج کے غروب ہوتے ہی شعر و شراب کا دور چل پڑتا تھا لیکن دن میں پاشی انتہائی مستعدی اور ہوشیاری سے اپنے فرائض منصبی ادا کرتا نظر آتا تھا اور شاید یہی وجہ تھی کہ اس کے افسران بالا اس کے شام کے مشاغل پر کبھی معترض نہ ہوئے اور وہ قدم بہ قدم ملازمت میں ترقی کے زینے بھی طے کرتا گیا۔

کمار پاشی انتہائی دوست دار تھا، دوستوں کی کسی خواہش کسی فرمائش کو رد کر دینا اس کے لئے ممکن نہیں تھا۔مان لیجئے کہ کسی دوست سے کسی بات پر شکر رنجی ہو گئی ہے اور پاشی نے دوسرے دوستوں سے اپنے مخصوص لہجے میں کہہ دیا ہے: '' جناب ! اب میں اس سے کبھی بات

Marfat.com

نہیں کروں گا'' لیکن اس دوست کو پاشی سے کوئی کام آپڑا، وہ گھر یا دفتر پہنچ گیا، پاشی نے اسے دیکھا اور پورا چہرا متبسم ہوگیا۔ آنے والے دوست نے کوئی تمہید باندھے بغیر کہا: '' یار پاشی صاحب یہ کام آپڑا رہے، آپ کچھ کر سکتے ہیں'' پاشی صاحب اٹھ کھڑے ہوئے: '' چلئے جناب چلتے ہیں، کچھ کرتے ہیں۔''

پاشی دوستوں ہی کے نہیں، شاید اجنبیوں کے بھی کام آجایا کرتا تھا اس لئے وہ جہاں بھی رہا ہردلعزیز رہا اور اسے پسند کرنے والوں، اس سے محبت کرنے والوں کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا۔

پاشی کی اپنی پسندیدگیاں اور ناپسندیدگیاں کسی سخت اصول کی تابع نہیں تھیں لیکن مسند اقتدار پر متمکن سیاسئین کی مکاریوں سے وہ ہمیشہ متنفر رہے۔ ملک میں جب ایمرجنسی نافذ ہوئی تو اس کی اس نفرت نے جس میں راقم الحروف بھی شریک تھا، انتہائی شدت اختیار کرلی تھی۔ دونوں روز کچھ ایسے منصوبے تیار کرتے جو بروے کار آجاتے تو ہماری خیر نہ ہوتی لیکن شام کی محفلوں میں جو تحریک کے دفتر میں ہوتیں ہم فخریہ لہجے میں اپنے ان منصوبوں کا اظہار کر دیتے۔ نتیجتاً گوپال متل، جو ان محفلوں کی بزرگ ترین اور محترم ترین شخصیت تھے، سمجھا بجھا کر ہمیں ان منصوبوں پر عمل کرنے سے روک دیتے۔ اس زمانے میں ہم روزانہ کچھ نہ کچھ شعر بھی کہا کرتے تھے اور چونکہ اندرونِ ملک ان کی نشر واشاعت کا امکان نہ تھا، اس لئے بی بی سی کو پوسٹ کر دیا کرتے تھے لیکن بی بی سی میں بھی شاید گوپال متل جیسا کوئی جہاندیدہ شخص بیٹھا ہوگا، ہمارے یہ شعر وہاں سے کبھی نشر نہیں ہوئے۔ انہی دنوں ایک عجیب واقعہ ہوا۔ کمار پاشی، امیر قزلباش اور راقم الحروف ''تحریک'' کے دفتر سے اٹھے اور پاشی کے گھر کی طرف چلے۔ ''تحریک'' کا دفتر انصاری مارکیٹ میں تھا اور پاشی کا گھر دلی گیٹ کے پاس کوچہ جلال بخاری میں۔ راستے میں دریا گنج کا پولیس اسٹیشن پڑتا تھا۔ ہم پولیس اسٹیشن کے پاس سے گزر رہے تھے کہ پولیس کی تین چار جیپیں عین ہمارے سامنے آکر رکیں۔ ہمیں نہ جانے کیا ہوا کہ ہم ایمرجنسی کے خلاف نعرے لگانے لگے۔ یہ عمل تین چار منٹ تک جاری رہا تبھی ایک پولیس افسر ہمارے پاس آیا اور بولا میرے ساتھ آیئے۔ ہم سمجھ گئے کہ اب ہماری منزل جیل ہے۔ پولیس افسر نے ہمیں ایک جیپ میں بیٹھایا۔ ہم سے ہمارے گھروں کا پتہ پوچھا اور ہر ایک کو بہ حفاظت گھر پہنچا گیا۔ میرا خیال ہی نہیں مجھے یقین ہے کہ اس مہربان پولیس افسر نے کمار پاشی کو پہچان لیا ہوگا، کمار پاشی جو کبھی نہ کبھی اس کے

Marfat.com

کام آیا ہوگا۔

کمار پاشی کی مستقل ناپسندیدگی کا دوسرا ہدف اردو کے اساتذہ تھے جو اس کے خیال میں ادب میں دخل در معقولات کے مرتکب تھے۔ یہ ناپسندیدگی بھی شدید تھی اور موصوف اس کا برملا اظہار بھی کر دیا کرتے تھے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں ایک مشاعرہ ہوا۔ مشاعرے کے داعی خلیل الرحمٰن اعظمی تھے جو ہماری نسل کے پیشتر شاعروں اور ادیبوں میں امتیازی شناخت رکھتے تھے لیکن بدقسمتی سے شعبۂ اردو میں استاد بھی تھے اور اپنی اسی حیثیت میں انہوں نے ہمیں اس مخصوص مشاعرے میں مدعو کر لیا تھا۔ پاشی نے جو وہاں غزل پڑھی اس کا مطلع یہ تھا:

جب ادب اپنے ختم پر آئے
ہر مدرس ادیب کہلائے

اعظمی صاحب باظرف انسان تھے زیادہ برا نہیں مانے لیکن پاشی نے یہ مطلع انہیں چڑانے کے لئے ہی پڑھا تھا۔

کمار پاشی عجیب وغریب شخص تھا۔ بہت سے واقعات ہیں جن کا ذکر کئے بغیر اس کی شخصیت کی بوقلمونی اور گوناگونی کو ظاہر نہیں کیا جا سکتا لیکن یہ مختصر مضمون ان واقعات کے بیان کا متحمل نہیں ہو سکتا اس لئے انہیں کسی اور وقت کے لئے اٹھا رکھتا ہوں۔

کمار پاشی کی تاریخ پیدائش ۲ر جولائی ۱۹۳۵ء تھی ۱۸ر ستمبر ۱۹۹۲ء کو اس نے زندگی کی آخری سانس لی، یعنی صرف ۵۷ سال کی عمر پائی۔ موت کے تصور سے موصوف بہت خائف رہتے تھے۔ اس پر بھی ایک واقعہ یاد آیا۔ ایک شام دوستوں کی شام کی محفل آراستہ تھی۔ محفل میں حسب معمول حیات لکھنوی بھی شریک تھے۔ انہوں نے کسی بات پر قہقہہ لگایا تو پاشی کو شاید پہلی بار نظر آیا کہ ان کے زیادہ تر دانت انہیں داغ مفارقت دے گئے ہیں۔ پاشی کا رنگ زرد پڑ گیا اور اس نے بڑی سنجیدگی سے حیات صاحب سے کہا، جناب! یہ کیا ہے، مجھے آپ کے چہرے پر اپنی موت نظر آ رہی ہے۔ اٹھیے آپ کے دانت بنواتے ہیں'' پاشی نے صرف یہ کہنے پر ہی اکتفا نہیں کی، حیات صاحب کو بازو سے پکڑ کر اٹھایا اور ایک نزدیکی دندان ساز کے پاس لے گیا۔

خدا نے اپنے اس نیک دل بندے کو موت کے بھیانک خوف سے نجات اس طرح دلائی

کہ وہ جب تک ہوش میں رہا پوری طرح تندرست وتوانا تھا۔ ۱۶ ستمبر کی شام کو جب پاشی حیدر آباد کے ایک مشاعرے میں شرکت کے لئے سفر کی تیاری میں تھا اور دفتر سے اٹھ کر گھر جا رہا تھا۔ راستے میں دماغی فالج کا حملہ ہوا وہ بے ہوش ہو کر گرا اور پھر ہوش نہیں آیا۔ فوراً ہی جے پرکاش نرائن اسپتال میں، جہاں وہ آفس سپرنٹنڈنٹ کے عہدے پر فائز تھا داخل کیا گیا رات بھر وہ بیہوش رہا اور ۱۷ ستمبر کو صبح ساڑھے سات بجے اسپتال کے ڈاکٹروں نے یہ اعلان کر دیا کہ مسٹر شنکر دت کمار اب ایک ڈیڈ باڈی ہیں۔ اس کا دفتری نام یہی تھا۔

پاشی کی موت پر میر کا مقطع بے ساختہ یاد آتا ہے:

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

☆☆☆

Marfat.com

پروفیسر ظفر احمد نظامی

کوثر چاندپوری

ایک کرایہ دار اور مالک مکان کے درمیان ہونے والے مکالمے کو نامور فنکار فکر تونسوی نے کچھ اس طرح قلم بند کیا تھا:-

''دیکھئے سابقہ طے شدہ کرایہ سے ڈیوڑھا کرایہ چارج کروں گا''

''میں بسر وچشم ادا کردوں گا.....''

''رسید صرف سنگل کرایہ کی دوں گا'' ڈیوڑھے کی نہیں''

''میں فراخدلی سے قبول کروں گا''

''کرایہ باقاعدہ ادا کرنے کے باوجود بے دخلی کا نوٹس دے دوں گا''

''میں نوٹس کے آگے اپنی پلکیں بچھادوں گا''

''میں لفاظی شفاظی نہیں مانگتا، میں آپ پر پالتو کتے تک چھوڑ دوں گا''

''میں سر تسلیم خم کر کے محترم کتّوں کا استقبال کروں گا''

''تو نکالئے چھ مہینے کا کرایہ پیشگی''

''لیجئے، کوئی میلا نوٹ ہو تو بدل لیجئے''

''زندہ باد! آپ پہلے کرایہ دار ہیں جو اتنے مہذب ہیں۔ کیا نام ہے آپ کا؟''

''کوثر چاندپوری''

کوثر صاحب کی شرافت کے سلسلے میں اس اقتباس سے بہتر کوئی اور ثبوت فراہم کرنا ممکن نہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ خوش صورتی اور خوش قامتی، خوش پوشی و خوش ذوقی،

Marfat.com

خوش فکری وخوش مزاجی، خوش گفتاری وخوش رفتاری اجزائے ترکیبی تھے اس خوش خصال شخصیت کے جو گھر میں ابا جی، طبّی حلقوں میں حکیم سید علی کوثرؔ ادبی دنیا میں کوثر چاندپوری اور عوام وخواص میں کوثرؔ صاحب کے نام سے جانے اور پہچانے جاتے تھے۔ جو اپنی ذات میں اردو تہذیب کا جیتا جاگتا پیکر اور مشرقی روایت کا چلتا پھرتا نمونہ تھے۔ جن کی شائستگی قصیدہ کا عنوان اور نفاست انشائیہ کا موضوع تھی۔ جنہوں نے کبھی ارض مالوہ پر عیسیٰ نفسی کی تو کبھی ہندوستان کے دل یعنی دلّی میں محبتوں کے جام تقسیم کئے۔ جو ادب کے نبض شناس بھی تھے اور اصناف سخن کے مزاج داں بھی۔ جنہوں نے چھ دہائیوں سے بھی زیادہ عرصہ تک نہ تو کبھی اپنی انگلیوں کو لرزنے کی اجازت دی اور نہ ہی اپنے قلم کے لیے تھکن کے کسی احساس سے روشناس ہونے کا موقع فراہم کیا۔

کوثر صاحب نے آٹھویں اگست ۱۹۰۴ء کو مغربی اتر پردیش میں واقع ضلع بجنور کے چاند پور نامی مردم خیز قصبہ میں آنکھ کھولی۔ وہ نامور طبیب حکیم سید علی مظفر کے تیسرے بیٹے تھے دستور کے مطابق انہوں نے مذہبی تعلیم کا حصول اپنے گھر کی چہار دیواری میں کیا اور پھر ابتدائی تعلیم مدرسہ میں حاصل کی جو اردو، فارسی اور عربی پر مشتمل تھی۔ مسلمان گھرانوں میں انگریزی کا چلن عام نہ ہونے کے سبب وہ بھی ابتدا میں اس سے محروم رہے تاہم بعد ازاں انہوں نے اپنے طور پر اس میں بھی خاصی استعداد بہم پہنچائی تھی۔ انجام کار پرنسٹر آصفیہ طبیہ اسکول بھوپال میں فن طب کی باقاعدہ تعلیم پانے کے بعد وہ اسی ریاست کے محکمہ صحت میں طبیب کی حیثیت سے وابستہ ہو گئے اور ۱۹۵۷ء میں افسر الاطباء کے اعلیٰ عہدے سے سبکدوش ہوئے۔ بعد ازاں انہوں نے کوثر صحت نامی اپنا نجی مطب قائم کر لیا مگر ۱۹۶۵ء میں ہمدرد نرسنگ ہوم کا قیام عمل میں آنے کے بعد وہ اپنے دیرینہ رفیق وشفیق حکیم عبدالحمید صاحب کی دعوت پر دلّی منتقل ہو گئے۔ ہمدرد نرسنگ ہوم سے وہ چیف میڈیکل آفیسر کی حیثیت سے تقریباً پندرہ برس تک وابستہ رہے۔ دراصل ادیب ہی کی طرح کوثر صاحب کی طبّی حیثیت بھی مسلم تھی کیوں کہ انہیں تشخیص اور تجویز دونوں ہی پر دسترس حاصل تھی ان کے پاس ملک کے دور دراز حصوں سے مریض آتے تھے اور شفایاب ہو کر جاتے تھے۔ ان پر لوگوں کے اعتماد اور اعتقاد کا یہ عالم تھا کہ ہمدرد نرسنگ ہوم کے بند ہو جانے کے بعد بھی ان کے گھر پر مریضوں کی آمد کا سلسلہ جاری رہا۔

اردو کے بیشتر اہل قلم کی طرح کوثر صاحب نے بھی اپنے ادبی سفر کا آغاز شعر گوئی سے کیا مگر وہ جلد ہی اس سے تائب ہو کر نثر نگاری کی جانب متوجہ ہو گئے۔ ۱۹۲۶ء میں ان کا پہلا افسانہ

Marfat.com

''گدازِ محبت'' کے عنوان سے امرتسر کے ماہنامہ'' پیامِ ہستی'' میں شائع ہو کر منظرِ عام پر آیا۔ پھر تو ان کے قلم نے جس تیز رفتاری کا مظاہرہ کیا وہ اپنی مثال آپ ہے۔

کوثر صاحب نے نثر کے میدان میں ادب کی تقریباً ہر صنف میں طبع آزمائی کی۔ انہوں نے افسانے لکھے، انشائیوں کو گدگدایا، طنز کے تیر چلائے، مزاج سے چھیڑ چھاڑ کی ناولوں کی دنیا آباد کی، رپورتاژ لکھے، تاریخ کے صفحات الٹے، تحقیق کی تہوں میں جھانکا، تنقید کے کوچے میں قدم رکھا اور سوانح کو موضوع بنایا۔ اگر چہ انہوں نے ہر صنف میں کمال حاصل کیا مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کا اصل میدان افسانہ نگاری تھا۔ انہوں نے بے شمار افسانہ لکھے جن کی تعداد کا علم غالباً خود انہیں بھی نہ تھا۔ ویسے ان کے افسانوں کی تعداد ڈیڑھ ہزار سے کم نہ ہوگی جو مختلف رسائل میں چھپے رہے۔

آزادی کے حصول سے بیس برس قبل اور حصول آزادی کے بعد ان کی وفات تک برصغیر ہند و پاک کا کوئی پرچہ ایسا نہ تھا جن میں ان کی تخلیقات شائع نہ ہوتی رہی ہوں۔ بعد ازاں ان کی کہانیوں کے کئی مجموعے شائع ہوئے جن میں سب سے پہلا مجموعہ'' دلگداز افسانے'' کے عنوان سے ۱۹۲۹ء میں منظر عام پر آیا۔ دوسرے مجموعوں میں'' عورتوں کے افسانے''، دلچسپ افسانے''،'' دنیا کی حور اور دوسرے افسانے''،'' آوازوں کی صلیب''، اور'' شعلہ سنگ'' کو بڑی مقبولیت ملی۔

ان کے افسانوں پر پہلے رومان کا غلبہ رہا پھر رومان کی جگہ حقیقت پسندی نے لے لی اور عوام ان کا موضوع بن گئے۔ ان کے کردار ہماری ہی بستیوں کے جیتے جاگتے انسان ہیں جو سماج کے مختلف طبقوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ جو شہری بھی ہیں اور دیہاتی بھی۔ ان کے سینوں میں انسانی دل دھڑکتے ہیں۔ ان کی آنکھوں سے آنسو بہتے ہیں، پیشانی سے پسینہ ابلتا ہے۔ وہ خوشیوں اور غموں کا امتزاج ہیں۔ وہ بامراد بھی ہیں اور نامراد بھی ..... غرضیکہ وہ ہمارے ہی ماحول کے پروردہ لوگ ہیں اور ہمارے ہی معاشرے کے مختلف طبقوں کی نمائندگی کرتے ہیں ..... مجاہد حسین نے ان کے پلاٹ کے اختصار میں ایٹم بم کی کیفیت محسوس کی، حامد حسین نے واقعات کی جزئیات اور ان کی مدد سے سیرت کی تعمیر کے فن کا احساس کیا حیات اللہ انصاری کو کوثر صاحب کے یہاں موپاساں کی گہرائی نظر آئی اور تاباں کو ان کی کردار نگاری میں جذبہ کی آنچ ملی۔

اگر چہ کوثر صاحب نے افسانہ نگاری کو اپنایا تاہم ناول نگاری تک متوجہ ہونے کے لئے

Marfat.com

انہیں سولہ برس کی طویل مدت درکار ہوئی۔ ۱۹۴۳ء میں ان کا پہلا ناول شائع ہوا اور پھر ایک دہائی اور گزر جانے کے بعد یکے بعد دیگرے کئی ناول آئے جن میں ''اغوا''، ''توڑ دو زنجیریں''، ''پیاسی جوانی''، ''شام غزل''، ''مرجھائی کلیاں''، ''عشق نہ دیکھے''، ''راکھ اور کلیاں''، ''محبت اور سلطنت'' اور ''پتھر کا گلاب'' بہت مقبول ہوئے۔ ان تمام ناولوں میں کوثر صاحب نے مختلف موضوعات کو پھیلا دیا جو وحدت سے بھرپور ہیں۔ ان کے حادثات، واقعات اور سانحات قاری کے ذہن پر اپنا تاثر قائم کرتے ہیں۔ اور ان کے فکر کے دریا میں غوطہ خوری پر مجبور کر دیتے ہیں۔ ان میں تسلسل اور روانی ہے جو قاری کی دلچسپی کو قائم رکھتی ہے۔ اسی طرح ''گونگا ہے بھگوان'' ان کا ناولٹ ہے جو فرقہ وارانہ فسادات کو اپنا موضوع بناتا ہے ''فریدہ موہنی'' ایک فینٹسی ہے جس میں ایک ایسے خیالی ملک کی داستان ہے جس پر خواتین کی حکمرانی ہے ''بیرم خاں ترکمان'' اور ''حکیم اجمل خاں'' سوانحی ادب کے شہ پارے ہیں۔ ''دیدہ بینا'' اور ''جہان غالب'' ان کے تنقیدی مطالعہ کا نتیجہ ہیں ''اطبائے عہدہ مغلیہ'' تاریخ طب پر محیط ہے۔ موجز قانون'' طب کی بنیادی کتاب ہے اور نصاب میں داخل ہے۔ ''کارواں ہمارا'' رپورتاژ ہے۔ ''دانش و بینش'' مختلف شخصیتوں کے خاکوں میں رنگ آمیزی کرتی ہے اور ان کے فن کا مطالعہ کرتی ہے۔ ان تمام فن پاروں سے کوثر صاحب کے وسیع مشاہدے، بلند تخلیل اور عمیق مطالعہ کا ثبوت فراہم ہوتا ہے ان کی باریک بینی اور نکتہ رسی کی نشاندہی ہوتی ہے۔ جدت اور روایت میں امتزاج کا احساس ہوتا ہے سیاسی اور سماجی حالات کا اندازہ ہوتا ہے۔ منظر نگاری اور فطری حسن کی مصوری کا انکشاف ہوتا ہے اور علمی ذوق اور شعور کی پختگی کے ساتھ ہی انسانی نفسیات اور انسانیت کی بلندی کا وقوف ہوتا ہے اگر چہ وہ کسی مخصوص مکتب فکر یا ''ازم'' سے وابستہ نہیں رہے تاہم وہ مقصدی ادب کے قائل تھے۔

کوثر صاحب کی شادی ۱۹۳۰ء میں چاند پور کے ایک مذہبی خانوادے کے عالم مولوی مقبول حسین صاحب کی بیٹی فاطمہ بیگم کے ساتھ ہوئی تھی۔ ان کی ازدواجی زندگی بہت کامیاب رہی وہ چار بیٹوں کے باپ تھے۔ آٹھ پوتوں، دس پوتیوں کے دادا، آٹھ نواسوں اور تین نواسیوں کے نانا تھے۔ انہیں چاکلیٹیں اور ٹافیاں کھلاتے تھے اور خود بھی کھایا کرتے تھے .... وہ بڑے احباب نواز تھے اور ہر شخص کے ساتھ اخلاق سے پیش آتے تھے اور ملنے والے کے مراتب کا ہمیشہ ملحوظ رکھتے تھے۔ اس سلسلے میں وہ روایتی وضع داری کا نمونہ تھے جس نے ماضی سے ان کے

Marfat.com

رشتوں کو استوار رکھا تھا۔ وہ کسی تخلیق کار کے فن پارے کو سننے کے بعد داد دینے کے معاملے میں کبھی بخل سے کام نہیں لیتے تھے لیکن ناپسندیدہ چیزوں پر اعتراض بھی کیا کرتے تھے مگر اس انداز سے کہ تخلیق کار کی دل شکنی نہ ہو..... ایک بار فکر تونسوی نے ان سے کہا تھا کہ ''میں جب آپ کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کرتا تو شرمندہ نہیں ہوتا۔ کیوں کہ آپ کا تو صرف احترام کیا جا سکتا ہے اور کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ مریض آپ کا احترام کرتے ہیں ادیب آپ کا احترام کرتے ہیں، حتی کہ میں نے کئی بوڑھوں کو بھی آپ کے سامنے ادب سے پیش آتے دیکھا ہے۔ کیوں کہ آپ کی ٹریجڈی یہ ہے کہ آپ اگلے وقتوں کے ان لوگوں میں سے ہیں۔ جو موجودہ مشینی عہد کی بدقسمتی سے زندہ رہ گئے ہیں۔ وہی قدما کا سا لہجہ، برتاؤ، رکھ رکھاؤ نجابت، مروت، خلوص، محبت، انکساری، قربانی۔ میں نے کہا نا سارا قصور آپ کا ہے یا آپ کی تربیت و پرورش کا کہ جس کی بدولت بہتر اور لطیف قدریں آپ کے ساتھ چمٹی ہوئی ہیں.....''

کوثر صاحب کا لہجہ دھیما تھا۔ وہ اونچی آواز میں بولنے کے عادی نہیں تھے۔ وہ ہمیشہ مسکراتے رہتے تھے اور گھر پر تو انتہائی غصہ کے عالم میں بھی ان کی خفگی کا اظہار ''مردود'' ''خبیث'' یا ''بے ایمان کے بچے'' جیسے الفاظ کی حدوں سے تجاوز نہیں کرتا تھا۔ اور جب ان کی ناراضگی کا شکار خاموش ہو کر خود سپردگی کر دیتا یا ہو جاتا تو وہ ہنس پڑتے تھے اور اس سے اس قدر خوش ہوتے تھے کہ خفگی کے دوران ہونے والی پریشانی کی تلافی کے طور پر یا تو اسے کچھ نقدی پیش کر دیتے یا مٹھائی سے اس کو تواضع کرتے تھے۔

کوثر صاحب اچھے اور ذائقہ دار کھانوں کے بہت شوقین تھے وہ خود بھی کھاتے تھے اور دوسروں کو بھی کھلاتے تھے۔ مرغ و ماہی انہیں زندگی بھر مرغوب رہے۔ گوشت کی ہر ڈش انہیں پسند تھی۔ کباب بڑے شوق سے کھاتے تھے۔ چاولوں میں پلاؤ اور بریانی ان کے لیے کشش رکھتے تھے۔ سلاد انہیں عزیز تھا۔ کھانے کے بعد پھلوں کا استعمال ان کا معمول تھا۔ سنترہ، آم، سیب اور انگور انہیں بے حد پسند تھے۔ مے نوشی، سگریٹ نوشی یا تمباکو نوشی سے کبھی انہیں شغف نہیں رہا علاوہ چائے نوشی کے، جس کے لیے وہ بڑا اہتمام کرتے تھے..... لباس اگرچہ وہ سادہ پہنتے تھے مگر ان کا ستھرا ہونا شرط تھا۔ شیروانی، تنگ پائینچوں کا پاجامہ، انہیں ہمیشہ پسند رہا۔ سردیوں میں گرم شیروانی گرم پتلون اور بالوں والی ٹوپی استعمال کرتے تھے۔ گھر پر لکھنوی کرتا پہنتے تھے اور ٹوپی کی جگہ ٹوپا لے لیا کرتے تھے۔ سفر میں وہ بش شرٹ اور پینٹ زیب تن

Marfat.com

کرتے تھے۔

کوثر صاحب وقت کے بے پناہ پابند تھے اور اپنے معمولات پر مذہب کی طرح کاربند رہتے تھے۔ مشہور ہے کہ بھوپال میں جب وہ شام میں گھر سے نکلتے اور ہوا خوری کے بعد واپس ہوتے تو لوگ گھڑیاں ملایا کرتے تھے۔ ہوا خوری کو وہ صحت کے لئے ضروری سمجھتے تھے اور بابائے اردو کے اس قول میں یقین رکھتے تھے کہ ''جو چلتے رہتے ہیں وہ چلتے رہتے ہیں''.....جوانی میں وہ ٹینس کھیلا کرتے تھے اور شکار ان کا بہترین مشغلہ تھا مگر دق میں وہ اس قدر محتاط ہو گئے تھے کہ بچوں کو کھلونے کی پستول تک سے کھیلنے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ ہر موسم میں ان کی صبح طلوع آفتاب سے ڈیڑھ گھنٹہ قبل نمودار ہو جاتی تھی فجر کی نماز کے بعد وہ ہوا خوری کے لئے نکل جاتے تھے اور ٹھیک پینتالیس منٹ ٹہلنے کے بعد گھر پہنچ کر اخبار بینی کرتے اور خطوں کے جواب لکھتے تھے خطوط وہ پابندی سے لکھا کرتے تھے اور خط کا جواب نہ دینے کو وہ بداخلاقی سے تعبیر کرتے تھے۔ ان کی ڈاک بڑی صحت مند ہوتی تھی جس کا انہیں بڑا انتظار رہتا تھا۔ پھر وہ ناشتہ کرتے تھے جو دو انڈوں اور دو پیالی چائے پر مشتمل ہوتا تھا۔ انڈے انہیں بہت مرغوب تھے۔ کہا جاتا ہے کہ نرسنگ ہوم میں مریضوں کا معائنہ کرنے کے بعد غذا کے معاملے میں ہدایت دیتے ہوئے وہ بھول کر بھی انڈے تجویز نہیں کرتے تھے کہ مبادا مریضوں کی کثرت استعمال سے وہ مہنگے نہ ہو جائیں۔ وہ ٹھیک نو بجے ہمدرد نرسنگ ہوم پہنچ جاتے تھے اور ایک بجے دوپہر اپنے کمرے میں پہنچ کر لنچ لیتے تھے۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد وہ لکھتے اور مطالعہ کرتے تھے یا پھر قیلولہ کرتے تھے سہ پہر کی چائے نوشی کے بعد وہ پھر مطب میں جا بیٹھتے تھے اور شام میں سات بجے تک گھر پہنچ کر آٹھ بجے تک کھانا کھا کر نو بجے تک سو جاتے تھے۔ وہ بڑی بااصول زندگی گزارنے کے عادی تھے اور حقیقت یہی ہے کہ معمولات کی پابندی ہی نے انہیں چھیاسی برس کی عمر میں بھی چاق و چوبند رکھا۔

کوثر صاحب بہت سی ادبی، سماجی اور طبی انجمنوں اور اداروں سے وابستہ رہے۔ حصول آزادی سے قبل وہ بھوپال کی مختلف یونینوں حتی کہ تانگہ یونین تک کے صدر رہے۔ وہ حلقہ دانشوران ادب کے بانیوں میں تھے۔ وہ برسوں ریاستی انجمن ترقی اردو مدھیہ پردیش اور طبی کانفرنس کے صدر رہے۔ بھوپال میں خصوصاً اور مدھیہ پردیش میں عموماً کوئی جلسہ ایسا نہ ہوتا تھا جس میں کوثر صاحب موجود ہوں اور اس کی صدارت کے فرائض کوئی اور انجام دے۔ وہاں مشہور

Marfat.com

تھا کہ ہر جلسہ کی صدارت بحق کوثر چاند پوری محفوظ ہے۔ بھوپال کوثر صاحب کی کمزوری تھا۔ بھوپال کا ذکر کرتے ہوئے ان کے چہرے پر تازگی اور شگفتگی دوڑ جاتی تھی۔ انہیں اردو سے عشق تھا۔ دراصل اردو شراب کی طرح ان کی رگ و پے میں سرایت کر گئی تھی۔ وہ اردو رسم الخط میں تبدیلی کے سخت مخالف تھے اور اسے زبان کے قتل سے تعبیر کرتے تھے ..... ادب کے ساتھ ساتھ کوثر صاحب صحافت کے دامن سے بھی وابستہ رہے۔ وہ لاہور کے ''الحکیم'' کے ادارہ تحریر میں شامل رہے۔ وہ صہبا لکھنوی کے ساتھ ماہنامہ ''افکار'' کے مدیر تھے۔ انہوں نے بھوپال سے ایک ادبی رسالہ ''جادہ'' بھی جاری کیا تھا۔

کوثر صاحب کم و بیش ایک سو پینتیس تصنیفات کے مصنف تھے۔ انہیں اپنی تخلیقات کا معقول معاوضہ بھی ملا اور مختلف حکومتوں، اکادمیوں، انجمنوں اور اداروں کی جانب سے ایوارڈ بھی ملے۔ ان کی حیات ہی میں ان کے اعزاز میں جلسے ہوتے رہے۔ دسمبر ۱۹۸۶ء میں اردو اکادمی دلی نے بھی ایک شام کوثر چاند پوری کے نام منسوب کر کے ان کی خدمات کا اعتراف کیا مگر انہوں نے ادب کو کبھی پیشہ نہیں بنایا۔ دراصل وہ بہت قناعت پسند تھے۔ ان میں ہوس نام کو نہ تھی۔ وہ طمع سے دور بھاگتے تھے۔ یہی سبب ہے کہ انہوں نے نہ کہیں مکان بنایا اور نہ ہی کبھی صاحب جائداد بننے کی خواہش کی۔ ادب کے میدان میں بھی کبھی کسی مقام یا منصب کے حصول کی آرزو نہیں کی ..... خود ان کا قول ہے کہ ''میں بہت قناعت پسند ہوں۔ ہر کام میں پوری جدوجہد کرتا ہوں'' مگر بے چینی سے نتائج کا منتظر نہیں رہتا۔ میرا عقیدہ ہے کہ ادب کا راستہ بہت طویل ہے۔ کسی مسافر کو یہ حق نہیں کہ وہ کسی سے ستائش نہ کرنے کا شکوہ کرے۔ مجھے ناقدین سے کوئی گلہ نہیں۔ جب وہ توجہ کریں گے تو خود اس فرق کو محسوس کر لیں گے''۔

کوثر صاحب کی زندگی کے آخری تین سال بڑی آزمائشوں میں گزرے۔ جولائی ۱۹۸۷ء میں ان کے نواسے ارشد الیاس نے بڑی کم عمری میں انتقال کیا۔ اسی سال دسمبر میں ان بیٹی صالحہ ظفر کی بے وقت وفات نے انہیں دل شکستہ کر دیا۔ جنوری ۱۹۹۰ء میں ان کی شریک حیات فاطمہ بیگم اس جہان فانی سے رحلت کر گئیں۔ کوثر صاحب کے لئے یہ صدمہ ناقابل برداشت تھا۔ ان کی یادداشت متاثر ہو گئی وہ خاموش رہنے لگے اور انجام کار مختصر سی علالت کے بعد اپنے چھوٹے بیٹے ڈاکٹر سید حلیم کوثر کے پاس جن کے ساتھ وہ ہمیشہ رہتے آئے تھے انہوں نے تیرہویں جون ۱۹۹۰ء کو مغرب کی اذان کا آغاز ہوتے ہی اس دار فانی سے کوچ کر کے عدم آباد کا سفر اختیار

Marfat.com

کیا اور اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ دوسرے روز جامعہ ملّیہ اسلامیہ کے قبرستان میں ان کی تدفین عمل میں آئی جہاں وہ اپنی بیوی اور بیٹی کی آخری آرام گاہ کے پہلو میں پیوند خاک ہو گئے اور اس طرح شائستہ اور شگفتہ شخصیت دنیا سے اٹھ گئی جس نے تین نسلوں کی ادبی اور ذہنی تربیت میں حصہ لیا تھا اور جس سے خود انسانیت اور شرافت عبارت تھی۔ میرؔ نے ٹھیک ہی کہا تھا:

مت سہل ہمیں جانو، پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

☆☆☆

Marfat.com

گوپال مِتّل

گوپال مِتّل ۷ جون ۱۹۰۶ء کو مالیر کوٹلہ کی نوابی ریاست کے ایک خوشحال گھرانے میں پیدا ہوئے اور ایک کامیاب اور آسودہ زندگی گزار کر ۱۵ اپریل ۱۹۹۳ء کو اپنے مکان نیو راجندر نگر میں جنت نشین ہو گئے۔ ان کے خاندان کی کوئی روایت اس زندگی کی چغلی نہیں کھاتی جو گوپال متل نے بسر کی۔ ان کے والد ولایتی رام حکیم تھے۔ گوپال متل بھی حکیمانہ دل و دماغ رکھتے تھے لیکن ان کا تعلق انسان کے جسمانی امراض کے بجائے اس کے فکری اور فنی رویوں اور ذہنی پراگندگی سے رہا۔ یہی وجہ تھی کہ مالیر کوٹلہ میں ایف اے کرنے کے بعد انہوں نے لاہور میں بی اے کیا اور فکر و فن کے زاویوں کو سمجھنے، جاننے اور سمجھانے کے شوق میں پہلے لدھیانہ، پھر لاہور میں بی اے کیا اور فکر و فن کے زاویوں کو سمجھنے جاننے اور سمجھانے کے شوق میں پہلے لدھیانہ، لاہور اور بالآخر دلّی کو اپنا مسکن بنایا اور دلّی والے بن گئے۔

قدرے مربع چہرے، موٹی سی ناک، چوڑی پیشانی، کھلتے ہوئے سینے، متوازن کسرتی بدن اور اٹھتے ہوئے قد والے گوپال متل فزوں تر ہوتے نظر آنے والے سیاہ فام وجود کے مالک تھے۔ بلغمی مزاج کے دین ان کے ذرا پھولے ہوئے کھردرے سے گالوں پر گاڑھی ہوتی ہوئی سیاہی ان کے ماتھے کی طرف بڑھتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ اگر ان کے گھنے اور پیچھے کو سمیٹے بالوں میں چاندی نہ لہرا رہی ہوتی تو ماتھے اور سر میں فرق کرنا مشکل ہو جاتا۔ اسی سیاہ فام چہرے پر گھنی بھوؤں کے پیچھے زرد سرخی میں ڈوبی آنکھیں تھیں جن میں سوچتے ہوئے تجسس کی لہریں اٹھتی رہتیں اور متل صاحب ان لہروں میں لپٹے ہوئے گلے میں گرتے بلغم کے لوتھڑے کو سنبھالتے چلے جاتے۔ اس وقت بھی وہ فکری رویوں پر سوچتے ہوئے انگوٹھے کے ساتھ والی دو انگلیوں میں

Marfat.com

سگریٹ کو دبائے اور مٹھی بند کئے دیہاتی انداز میں لمبے لمبے کش کھینچتے رہتے۔

گوپال متّل کو میں نے آج سے تیس بتیس برس پہلے قبل منور لکھنوی کے گھر ایک شعری نشست میں دیکھا لیکن برسوں بعد ان سے ملاقات تحریک کے دفتر میں ہی ہوئی۔ اسی دفتر سے وہ مخمور سعیدی اور اپنے بیٹے پریم گوپال متّل کے ساتھ اپنا اشاعتی ادارہ چلاتے تھے جس کا نام نیشنل اکادمی تھا۔

متّل صاحب کم آمیز تھے لیکن جن سے انکی ملاقات تھی ان پر پوری طرح نثار تھے۔ میں بھی ان میں سے ایک تھا اور وہ مجھے صرف دفتر میں ہی نہیں اپنے گھر پر بھی عزیز رکھتے تھے اس لئے میں ان کی زندگی کے اکثر شعبوں میں جھانک سکا اور ان کے کردار کا خاکہ میرے ذہن پر ثبت ہو گیا۔

متّل صاحب معاملہ فہم، مردم شناس اور زمانہ نباض تھے۔ بانی کی شاعری کے قائل تھے اور اس کی خوشامدانہ اور چاپلوسانہ فطرت سے تائب۔ پھر بھی انہوں نے تحریک میں شائع ہوئی بانی کی ایک نظم پر مجھے تعریفی اور توصیفی خط لکھنے کے لئے کہا تھا اور ایک نظر میری طرف دیکھ کر سمجھا دیا تھا کہ انہیں بانی کے دن بدن شدت اختیار کرتے ہوئے گٹھیا اور اس بیماری سے ہونے والے ہولناک انجام کا علم ہے اسی طرح وہ دیویندر ستیارتھی کی بے حد قدر کرتے تھے اور ان کا افسانہ بنا پڑھے کاتب کو دے دیتے تھے اس کے علاوہ بھی ستیارتھی کی تعریف و توصیف کا موقع ڈھونڈتے رہتے۔ اسی ضمن میں انہوں نے میرے کہنے پر اپنے اصول کے خلاف تحریک کے سرورق پر ستیارتھی کا فوٹو پھیلا دیا تھا اور میری نادان شرکت میں ستیارتھی پر ایک عقیدت مندانہ مضمون بعنوان ''ٹالی ٹپ گیا چنگیاڑا'' لکھا تھا۔ میرے ساتھ محبت کے اظہار میں ہی انہوں نے اپنے ایک اداریہ میں لکھا تھا۔ کنور سین کو افسانہ کہنے پر مکمل عبور حاصل ہے اور وہ میری تحریر کو چاہے وہ افسانہ ہو، تبصرہ ہو یا مضمون حتیٰ کہ کسی محفل یا جلسے میں بولتے ہوئے کلمات کو تحریک میں نمایاں جگہ دیتے تھے۔ ان کی دوست نوازی کا بیّن ثبوت کرشن موہن تھے جن کی ہر تخلیق تحریک میں نمایاں ترین طور پر پیش کی جاتی رہی۔

متّل صاحب کی مردم شناسی کا سب سے بڑا ثبوت ان کا مخمور سعیدی کو اپنا دست راست اور رفیق کار بنانا تھا۔ مخمور کے خلوص و فاکشی اور ایمانداری کی شناخت پل بھر میں کر لینا اور اسے اپنا سب کچھ سونپ کر ایک خاص تحفظ اور عافیت محسوس کرنا متّل صاحب کے لیے ہی ممکن تھا سب جانتے ہیں کہ متّل صاحب کی زندگی میں نہ ان کے آنجہانی ہو جانے کے بعد مخمور نے کبھی اس

Marfat.com

اسرار پر سے پردہ اٹھایا جس کو جاننے کے لیے ایک دنیا دیوانہ رہی اس سے بھی بڑھ کر بات یہ تھی کہ مخمور بھی نہیں جانتا تھا کہ مثل صاحب کے ساتھ کام کرنا بالآخر ایک منفعت کا سودا نکلے گا اور اس منفعت کے طول وعرض کا سوائے گوپال مثل کے کسی کو علم نہیں ہوگا ادھر نہ صرف یہ کہ وہ مخمور کے ذاتی اوصاف کے قائل تھے بلکہ اس کی شاعری کے بھی قائل تھے بلکہ اسی طرح کمار پاشی سے بھی ان کی خوب نبھتی تھی لیکن اس کے کردار کی ایک خاص رکاکت کو چھپائے رکھتے تھے جس کے بارے میں بہت بعد میں انہوں نے مجھے انتہائی رازدارانہ لہجے میں بڑی کڑواہٹ کے ساتھ بتایا تھا اور ایک بوجھ سے نجات پا کر نئی سگریٹ سلگائی تھی۔

گوپال مثل واقعی اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ وہ صحافی تھے اور مضمون نگار بھی۔ وہ شاعر تھے اور نثر نگار بھی۔ تبصرہ نگاری بھی ان کی دسترس میں تھی اور سیاسی، سماجی، اور ادبی اداریے لکھنا بھی ان کے لئے آسان بات تھی۔ ان کی سیاسی، ثقافتی، تنقیدی اور صحافتی سوجھ بوجھ غیر معمولی تھی اور اس کی روشنی میں انہوں نے ایک مخصوص طرز حیات کو اپنایا تھا اور اس طرز حیات کو درست ثابت کرنے میں خاصی خوشی محسوس کرتے تھے۔

مثل صاحب اپنی شخصیت کی کثیر الجہتی سے خوب واقف تھے اور یہی کثیر الجہتی ان کو بے قرار کئے رکھتی تھی۔ ان کے لیے ایک جگہ جم کر بیٹھنا محال تھا اس لئے وہ اکثر اپنی کرسی چھوڑ کر دفتر کے چھوٹے سے آنگن میں ٹہلنے لگتے تھے اور کسی نہ کسی معاملے پر غور وخوض کرتے ہوئے بدبداتے رہتے تھے انہیں خود کلامی میں مبتلا دیکھ کر لگتا تھا وہ اپنے آپ سے بحث کرتے ہوئے خود کو ہی سر کرنے میں مصروف ہیں۔ اس کی وجہ ان کی زندگی اور اس کے مسائل کے متعلق بے حد منطقی اور استدلالی رویہ تھا۔ وہ مرد منطق اور جلادی استدلال کی سفاکی میں یقین رکھتے تھے اور اسے ہی تلوار اور ڈھال مان کر اپنی بات کہتے تھے۔ ایسے ہی وقت میں وہ اپنی گدی کے گھنے بالوں کو ٹکورتے ہوئے اپنی قدرے لکنت زدہ زبان میں اپنے تعصبات کا انکشاف کرتے تھے اور اپنے نکتہ رس ہونے کا ثبوت دے کر خوش ہوتے تھے۔ کیوں کہ میں نے بطور شاعر، اپنا تخلص حسرت رکھا تھا اس لئے وہ مجھے اکثر حسرت یار کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ بے شک ترنگ میں ہوں تو کنور سین حسرت بھی کہہ دیتے تھے۔ ان کو سنتے ہوئے میں بلا ارادہ اور غیر محسوس طور پر ان کے اندر اترتا چلا گیا تھا اور ان کی باتیں میرے اندر رچ بس گئی تھیں۔

حسرت یار شاعر بننے یا کہلانے کے لیے ضروری نہیں کہ آدمی ڈاڑھی رکھے یا سر کے بال

Marfat.com

بڑھا کے، ڈھیلا ڈھالا کرتا پاجامہ پہنے اور اپنے کو نحیف ونزار ثابت کرنے کا ناٹک کرتے ہوئے اپنی بے سروسامانی کی علامت اپنے کندھے سے لٹکتے لمبی ڈوری والے تھیلے کو بنائے۔ مثل صاحب اپنے سیاہی مائل وجود پر زیب سوٹ بوٹ اور ٹائی پر نظر ڈالتے اور اطمینان سے بھر جاتے لیکن دوسرے ہی لمحہ وہ کسی اور موضوع پر بولنے لگتے۔

حسرت یار اگر بانی اور مخمور تمہیں بطور شاعر مارنے پر تلے ہوئے ہیں تو غم نہ کرو خودکشی کرلو تاکہ مرے ہوؤں کے ہاتھوں مرنے کی ذلّت سے بچ سکو۔ اسی طرح وہ اس وقت کا ذکر کرتے جب انہوں نے جوگندر پال سے کہا تھا۔ جوگندر پال تم میرے دوست ہو۔ اگر تم یہ کہو کہ تم تختِ برطانیہ کے ہونے والے وارث ہو تو میں مان لونگا مگر تم یہ کہو کہ تم افسانہ نگار ہو تو نہیں مانوں گا۔ وہ رکتے اور اس واقعہ کا بھی ذکر کرتے جب جگن ناتھ آزاد نے ان سے کہا تھا۔ مثل صاحب والد مرحوم قبلہ تلوک چند محروم کے کلام کو ترتیب دے چکا ہوں لیکن مجموعے کا عنوان نہیں سوجھا۔ یہ سنتے ہی مثل صاحب کے چہرے پر عجیب مسکراہٹ ناچ اٹھی تھی۔ ارے جگن ناتھ عنوان تو سامنے دھرا ہے گائے کی فریاد۔ مثل صاحب کی مسکراہٹ کو دیکھ جگن ناتھ آزاد اس وقت کو کوسنے لگا جب محروم صاحب نے نظم گائے کی فریاد تخلیق کی ہوگی۔ لیکن مثل صاحب اس واقعہ کو بھول کر کہیں اور جا نکلے اور وہاں سے آواز دیتے۔ کنور سین حسرت کیا تم نہیں محسوس کرتے کہ منٹو کا کردار بابو گوپی ناتھ ایک گھڑا ہوا یعنی کہ Contrived کردار ہے اور وہ کسی طرح بھی تخلیقی اور فطری یعنی کہ Creative & Natural نہیں ہے۔ مجھے تذبذب میں پڑا دیکھ کر وہ لمبا کش کھینچتے۔ حسرت یار تم نقادوں کا سوچ رہے ہو۔ ان کا کیا ہے وہ اگر منگو کوچوان کے گھوڑے کے سر پر شہادت کا تاج رکھ دیں تو کوئی کیا کرسکتا ہے۔ آج مثل صاحب کی ایسے لمحات میں اجاگر ہوئی شبیہہ میرے سامنے ابھرتی ہے تو میں کہہ اٹھتا ہوں۔ مثل صاحب، یاران نقد ونظر نے تو 'بو' کی گھاٹن کو بھی پرکرتی مان کر اُسے آفرینشِ کائنات اور افزائش نسل کی علامت کا درجہ دے ڈالا۔

یہ سب سنتے ہوئے اور مثل صاحب کو اپنی بذلہ سنجی پر خود ہی فریفتہ ہوتے ہوئے دیکھتا اور پھر انہیں کسی نئے پہلو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سننے لگتا۔

حسرت، یہ تو تم بھی مانو گے کہ میں نے تنِ تنہا ترقی پسند تحریک کا مقابلہ کیا ہے.....وہ زمانے کی نبض پر انگلی رکھ دیتے..... سب کچھ بکھرنے ہی والا ہے، ختم ہونے ہی والا ہے..... مثل صاحب بپھر سے جاتے جب تک آدمی کی ریڑھ کی ہڈی غائب نہ ہو جائے وہ کمیونزم کو تسلیم نہیں

Marfat.com

کرتا.....وہ اپنے مضامین کی عطر آویزی بکھیرتے چلے جاتے.....غزل کا صحیح مقام ہوس اور تصوف کے درمیان ہے۔آپ بیتی میں جوقدرتی کشش ہوتی ہے اسے بسا اوقات یہ بات زائل کر دیتی ہے کہ مصنف اپنی برتری ثابت کرنے کے لئے مصنوعی اور مثالی شخص کی زندگی بیان کرنے بیٹھ جاتا ہے۔کرشن چندر اور اپیندر ناتھ اشک کی آمد اس بات کا اعلان تھی کہ ادب کے میدان میں قلندری کا دور ختم ہوا۔غالب ہندو مسلم اتحاد کا شعوری علم بردار نہیں تھا۔اس کی اپنے ہندو، دوستوں کے لیے محبت ذاتی سطح پر تھی۔اس کی پشت پر کوئی نظریاتی شعور نہیں تھا۔میں مثل صاحب کی گوہر افشانی میں گم ہو کر بھی کارل مارکس کو نہ بھولتا تو وہ بھانپ جاتے۔حسرت، تم نہیں جانتے کہ کارل مارکس کو کاربنکل تھا۔میں کہنے کو ہی ہوتا کہ آپ کو بھی تو بلغم ہے کہ مثل صاحب اپنی گدی کو ٹکورتے ہوئے قدم بھرتے اور سامنے دیوار پر لگے واش بیسن میں بلغم کا بڑا سا لوتھڑا تھوک دیتے۔ان کی برہمی کے مشتعل ہونے سے پہلے ہی میں انکی تصنع، تکلف سے پاک شگفتہ اور سادہ پُرکار، غیر مبہم اور تخلیقی شان سے مملونثر کا ذکر چھیڑ دیتا اور ان کی نادر نوشت ''لاہور کا جو ذکر کیا'' کو موضوع گفتگو بنا دیتا۔اُس حکایت لذیذ کے جادوئی اسلوب اور سحر انگیز انداز کا بیان کرتا اور کہتا کہ کس طرح انہوں نے اس بے مثال اور دلآویز تحریر میں اپنے لاہور کے زمانے کے دوستوں اور رفیقوں کی قلندری اور ملنگی کو ایک انوکھا فکری، فنی اور جذباتی مصور نامہ بنا دیا اور عرب ہوٹل اور نگینہ بیکری کی محفلوں کے واسطے سے مولانا تاجور، مولانا صلاح الدین احمد، ڈاکٹر تاثیر، علیگ باری، حفیظ جالندھری، چراغ حسن حسرت اور دوسرے ہم سفروں کو بقائے دوام بخش دی۔ ایک ایسی کتاب جس کا کوئی باب نہیں اور جس کا ہر کردار اس کا باب ہے اور اس کی تحریر اپنی دلکشی کے طفیل ایک ڈرامائی کیفیت پیدا کر کے وقفہ وقفہ تبدیل ہوتی ہوئی صورت حال میں ان کرداروں کو اپنا اپنا پارٹ ادا کرتے ہوئے دکھاتی ہوئی قاری کو اپنی سلاست اور روانی سے محفوظ کرتی چلی جاتی ہے اور آج بھی پروفیسر گوپی چند نارنگ اور شمس الرحمٰن فاروقی جیسے نقادوں سے خراج تحسین حاصل کر رہی ہے۔''لاہور کا جو ذکر کیا'' اس پر اتراتے مثل صاحب ذرا دور نکل جاتے۔حسرت بابائے اردو مولوی عبدالحق نے بھی کہا ہے۔گوپال مثل کو اردو آتی ہے۔اس سے پہلے کہ میں ان کی خوشی میں پوری طرح شامل ہو جاؤں دفتر کی ڈاک آ جاتی اور مثل صاحب مجھے سگریٹ پینے کو کہہ کر کمرے میں جا کر اپنے جان نثار بیٹے پریم گوپال سے پوچھتے۔ڈاک میں کتابوں کے لئے کوئی آرڈر آیا؟۔اس وقت مثل صاحب کا وہ استفسار ان کی معاشی اور ارضی سوجھ بوجھ کا ہیولا بن

Marfat.com

کر میرے سامنے ابھرنے لگتا اور ان کے لوٹنے پر میں ان کی طرف دیکھتا تو وہ کہہ اٹھتے۔ حسرتؔ یار، تم سمجھ دار ہو۔ جو لوگ میرے مالی مرتبے کی وجہ جاننے کے لئے پاگل ہوئے رہتے ہیں وہ اپنے گریباں میں تو جھانک لیں۔

متّل صاحب کو تبصرہ نگاری کے اوصاف کا بھی علم تھا۔ انہوں نے کسی بھی تبصرے میں کسی ادیب یا شاعر کو بانس پر نہیں چڑھایا۔ حسرتؔ میں نے محمد علوی کے سر پر عظمت کا تاج نہ رکھ کر تبصرہ نگاری کے فن کے ساتھ زیادتی کرنے سے بچ گیا۔ متّل صاحب قہقہہ لگاتے اور سگریٹ کا کش کھینچ کر پتہ نہیں کہاں سے آواز دیتے۔ حسرتؔ، تم اخبار کون سا لیتے ہو۔ میں سمجھ جاتا اور انہیں یاد دلاتا کہ ہندوستان ٹائمز کے اپنے مخصوص کالم میں خوشونت سنگھ نے بادلیر کی شاعری کی تعریف میں جو پیرا لکھا ہے اس کی عنایت اور بلاغت کا کوئی جواب نہیں۔

متّل صاحب انگریزی ادب کی تعریف میں رطب اللّسان ہو اٹھتے۔ میں کسمساتا تو حیران رہ جاتے اور پینٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر مجھے تکنے لگتے۔ تم نے انگلینڈ کا گدھا دیکھا ہے۔ اونچا، توانا، چمکدار کھال والا۔ ادھر ہندوستانی گدھا۔ مریل، پچکے ہوئے وجود کو مریل ٹانگوں پر سنبھالے کٹی پھٹی بدرنگ کھال والا۔ جب گدھوں میں اتنا فرق ہے تو۔ میں بول اٹھتا تو پھر کالی داس، بھوبھوتی میر غالب۔ متّل صاحب خاموش ہو جاتے اور واش بیسن کی طرف چل پڑتے جیسے میری مزید دل آزاری کرنا مناسب نہ سمجھتے ہوں۔

شام پڑنے لگتی۔ متّل صاحب چائے کی چسکی لیتے ہوئے اپنے سیاسی، ادبی اور لسانی معرکوں کا ذکر لے بیٹھتے۔ اس وقت ان کے شکار فراق گورکھپوری، جوش ملیح آبادی اور مالک رام ہوتے۔ فراق کے ذکر کے ساتھ ہی تخلیق اور تنقید کا قصہ شروع ہو جاتا۔ تنقید کو تخلیق کا منہ چڑھانے کی سعی کرتے اور اُس کا رہبر بنتے دیکھ کر پریشانی کا اظہار کرتے اور کلیم الدین احمد کا وظیفہ پڑھنے لگتے۔ میں ان سے شمس الرحمن فاروقی اور پروفیسر گوپی چند نارنگ کی تحریروں میں مغربی افکار نقد و نظر کے برملا در آنے کا ذکر کرتا تو وہ بات کا رخ بدل دیتے اور فاروقی صاحب کو یاد کر کے کہتے۔ دلّی بڑی ہرجائی معشوقہ ہے۔ کسی کو خاطر میں نہیں لاتی۔ باہر سے آنے والا جید شاعر ادیب یا نقاد بھی اس کی بے لحاظی کا شکار ہو کر رہ جاتا ہے۔

اندھیرا ہوتے ہی بانی، کمار پاشی، امیر قزلباش، پروانہ ردولوی وغیرہ آ جاتے اور ناؤ نوش کی تیاری شروع ہو جاتی۔ متّل صاحب شراب کے ساتھ کبھی کچھ نہ کھاتے لیکن دوسرے لوگ نمکین

Marfat.com

پھانکنا ضروری سمجھتے۔ مثل صاحب مہذب، بردبار، متحمل مزاج اور شریف النفس انسان تھے یہی شرافت اور اعلیٰ کرداری انہوں نے اپنی اولاد کو ودیعت کی تھی وہ آداب محفل سے بھی خوب آشنا تھے حالانکہ محفل میں وہ اپنی برتری کا مظاہرہ کرتے اور ان کا پندار بھی بیزار ہو جاتا لیکن دوسروں کو بھی بات کرنے اور کلام سنانے کا موقع دیتے۔ اچھے شعر پر داد بھی دیتے۔ خود اپنی شاعری کے متعلق ان کا دعویٰ تھا کہ ان کے کئی اشعار غالب کے اشعار کی ٹکر کے ہیں۔ اکثر وہ اپنی مشہور غزل سناتے جس کا مطلع ہے۔

مصرف کے بغیر جل رہا ہوں
میں سونے مکان کا دیا ہوں

اس غزل میں وہ زندگی کی بے معنویت اور لغویت کو آشکار کرنے کے ساتھ ساتھ انسان کے بلاوجہ اذیت بھوگتے چلے جانے کا ماتم کرتے۔ پوری غزل اپنے آہنگ اور رنگ کا تاثر جمادیتی تو وہ زندگی کی خباثتوں کے ساتھ ساتھ اس کی لطافتوں کی طرف بھی متوجہ ہو جاتے اور انسانی کردار کے دولخت ہوئے دینے کو موضوع شعر بناتے۔

شعر میں تذکرۂ دشت بیاباں ہو مگر
اک بڑے شہر میں گھر اپنا بسایا جائے

اسی بیچ وہ اپنے دوسرے شعری مجموعے ''صحرا میں اذان'' پر گفتگو کرنا اور سننا پسند کرتے لیکن اپنے پہلے مجموعے ''دوراہا'' کا ذکر تک گوارہ نہ کرتے شاید اس کی وجہ اس مجموعے کے اشتراکیت زدہ اشعار تھے جن کی تخلیق پر مثل صاحب متاسف رہتے۔ شعر و شاعری کی محفل کی تان بھی یوں ان کی روس کے تئیں مخالفت پر ہی ٹوٹتی اور اٹھتے اٹھتے وہ روس کی افغانستان میں فوجی مداخلت کے انجام کی پیش گوئی کرتے۔ افغانستان روس کا واٹرلو بنے گا۔ وقت نے ان کی پیشن گوئی کو سچ ثابت کر دیا اور سوویت یونین نہ صرف افغانستان بلکہ دوسرے ملکوں سے دست بردار ہونے کے ساتھ ساتھ اپنا اتحاد بھی کھو بیٹھی۔ کمیونزم کا شیرازہ بکھر گیا اور دنیا یک طاقتی سیارہ بن گئی۔

اسی وقت ''تحریک'' بند ہونے کی نوبت آ گئی۔ شاید رسالہ اپنا کام ختم کر چکا تھا اور اس کو چلانے کے پیچھے جو قوت تھی اس کا مقصد پورا ہو گیا تھا۔ پریم گوپال گولہ مارکیٹ میں اپنے نئے ادارے ماڈرن پبلشنگ ہاؤس کی ترتیب و ترویج میں جٹ گیا۔ تحریک کا دفتر بند ہو گیا لیکن مثل صاحب کی تحریک کے لیے محبت ختم نہیں ہوئی ایک دن انہوں نے مجھے بلایا تو میں نے دیکھا ان

Marfat.com

کے دفتری کمرے میں میز کرسی کے بجائے صوفہ سیٹ پڑا تھا۔ میرے وہاں پہنچتے ہی انہوں نے بوتل نکال لی اور قدرے نڈھال آواز میں کہنے لگے۔ تم تو میرے ساتھ ہو۔ میں چاہتا ہوں تحریک دوبارہ جاری کروں۔ لیکن تحریک کہاں دوبارہ جنم لے سکتا تھا۔ آخر متل صاحب نے دفتر بیچ دیا اور راجندر نگر میں ٹک گئے۔ وہاں ان کے اندر کا قلندر اپنے اندر کی مستی کا برملا سا اظہار کرنے لگا۔ سوٹ بوٹ اور رکھ رکھاؤ سے بے نیاز گھر پر وہ صرف لنگی اور بنیان اور کبھی کبھی بنیان سے بھی بے نیاز ننگی چارپائی پر جس کے پائنتی ان بچھا بستر اپڑا رہتا لیٹے پڑھتے رہتے یا اکا دکا ملنے والوں سے باتیں کرتے ہوئے چارپائی کے نیچے سے اگالدان سرکا کر اس میں بلغم تھوکتے رہتے۔ ان کی ملنگی اور شان بے نیازی دیکھ کر میں اندر ہی اندر ان کا شعر گنگنانے لگتا:

سر میں ہوائے شوق جنوں ہے بھری ہوئی
شہر خرد کی خاک مگر چھانتا ہوں میں

ایسے ہی دیگر اشعار مجھے متل صاحب کی شاعری اور انسانی کردار کی اس کی نفسیات کے آئینے میں اپنے آپ میں بٹی ہوئی شبیہ دکھانے لگتے اور میں سننے لگتا۔

آؤ کچھ جشن شہادت ہی شرکت ہو جائے
اپنی کھڑکی ہی سے مقتل کا نظارہ دیکھیں

آخری عمر میں متل صاحب بہت اکیلے پڑ گئے تھے۔ نہ مخمور، نہ پاشی نہ کوئی اور ان کے لئے صحبت مہیا کرتا۔ لیکن انسان ایک سماجی جانور ہے تو متل صاحب باوجود تمام تر تفکر اور پراگندہ ذہنی کے ایسے لوگوں سے بھی دل بہلانے لگے جنھیں میں انہوں نے پہلے کبھی گھاس تک نہیں ڈالی تھی۔ جب میں نے منہ بنایا تو گدی کے بالوں کو کچھ زیادہ ہی زور سے تھپتھپاتے ہوئے فرمایا۔ حسرت، میں نے زندگی بھر رسالہ نکالا ہے۔ مجھے پتہ ہے کہ فکر کی کیا اہمیت ہوتی ہے۔ مجھے تو صرف ایک ہی قلق ہے کہ میں نے شعر و ادب میں وہ نہیں کیا جس کا میں اہل تھا۔ اس دکھ سے چھٹکارا پانے کے لیے وہ اپنی دوسرے ملکوں کی سیاحت کا ذکر کرنے لگتے لیکن میں متل صاحب کو تولتا ہوا ان کے کردار کی سچائی سے مرعوب ہو کر ان کا وہ شعر بولنے لگتا جس کا دوسرا مصرع ہے:

نہیں ہے منصب منصور ہر کسی کے لیے

شاید ان سے فکر کی اہمیت جان کر ہی میں نے پچھلے برس اپنی کہانی میں فکر کو مرکزی کردار بنایا

اوراس افسانے کواندوہناک اختتام تک پہنچایااورمتّل صاحب کی شام زندگی کی دھندلی افسردگی کو فنی شکل دی۔

آخروہ نابغۂ روزگارجس کا نام گوپال متّل تھااور جوکئی لحاظ سے پورے دور سے وابستہ رہا اپنی قلندری اورملنگی کی مستی کوشعرمیں ڈھالتے ہوئے:

پاؤں میں کانٹے سر پر دھول
دیکھ مآل شوق فضول

اس دنیائے فانی سے ۱۵/اپریل ۱۹۹۳ کوکوچ کرگیااوراپنے پیچھے چھوڑ گیا اپنا خاکہ جس میں اس کے چاہنے والے اپنی بساط بھر رنگ بھرتے رہیں گے اور ان کے تیسرے شعری مجموعے ''شرارِنغمہ'' کویادکرتے ہوئے اپنی اُس خواہش کوبھی نہیں بھولیں گے کہ کاش متّل صاحب نے ''لاہورکا جوذکرکیا'' جیسی ایک اورتخلیق ''دلّی کا جوذکرکرکیا'' بھی اردوادب کودی ہوتی اوروہ تخلیق اُن کے دلّی والے ہونے پرایک اورمہرتصدیق لگاتی۔

☆☆☆

Marfat.com

ایم حبیب خاں

مالک رام

اردو میں خاکہ نگاری کے نقوش فارسی اور اردو کے تذکروں میں ملتے ہیں لیکن اس کی باقاعدہ ابتدا مرزا فرحت اللہ بیگ سے ہوتی ہے۔ انہوں نے پہلی بار مکمل خاکہ "نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ اپنی زبانی" تحریر کیا جس میں نذیر احمد کی شخصیت اور سیرت کے بارے میں بھرپور مرقع کشی ملتی ہے۔ فرحت اللہ بیگ کے خاکے کو نمونہ بنا کر مولوی عبدالحق، خواجہ حسن نظامی، رشید احمد صدیقی، شاہد احمد دہلوی، مالک رام، محمد طفیل، یوسف ناظم اور مجتبیٰ حسین وغیرہ نے بہترین خاکے لکھے۔ خاکہ نگار کے لیے یہ بات انتہائی لازمی ہوتی ہے کہ وہ جس شخص کا خاکہ لکھنا چاہتا ہے اسے وہ قریب سے جانتا ہو اور اس کی سیرت اور عادت و اطوار پر گہری نظر رکھتا ہو۔ بہترین خاکہ نگاری کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ خاکہ لکھتے وقت اس شخص کے چھپے ہوئے پہلوؤں کو اس طرح باہر لائے کہ اس میں سیرت نگاری کے تمام پہلوؤں کا حق ادا ہو جائے۔

آج آپ کے سامنے ایک ایسی شخصیت جس کا نام مالک رام ہے میں نے کچھ لکھنے کی جسارت کی ہے۔ مالک رام صاحب ٹھیٹھ دہلی والے تو نہیں تھے لیکن انہوں نے دلّی میں چالیس سال سے زائد زندگی گزاری۔ سرکاری ملازمت کے پہلے وہ اکثر ہندوستان سے باہر رہتے لیکن دلّی میں آنا جانا برابر لگا رہتا۔ وہ ہماری قدیم تہذیب، شرافت، وضع داری اور ملی جلی گنگا جمنا تہذیب کا ایک دلکش نمونہ تھے اب ان خوبیوں کے لوگ ڈھونڈنے سے نہیں ملیں گے۔

مالک رام صاحب بڑے خوش مزاج اور خوش گفتار تھے رنگ گورا، قد درمیانی، کشادہ پیشانی سر پر کہیں کہیں سفید بال، ناک بڑی، داڑھی مونچھ صاف، جوانی میں سوٹ اور آخر عمر میں زیادہ تر

Marfat.com

شیروانی پہنتے، چوڑی دار اور علی گڑھ کٹ پائجامہ دونوں طرح کے پہنتے تھے۔ سر پر ٹوپی ضرور پہنتے تھے۔ چشمہ لگا لیتے تھے۔

میری جان پہچان مالک رام صاحب سے ۱۹۵۴ء کے آس پاس ہوئی جب وہ پہلی بار قاضی عبدالغفار مرحوم کے زمانے میں انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ کے ممبر منتخب ہوئے اس کے بعد انجمن کا دفتر ۱۹۷۴ میں دلّی منتقل ہو گیا تب سے ملاقاتیں اکثر ہوتی رہیں۔ وہ انجمن کے خاص ممبر، نائب صدر اور آخر میں انجمن کے صدر منتخب ہوئے۔ آخر ۱۵, ۲۰ سالوں میں ان کو قریب سے دیکھنے کے بہترین مواقع ملے۔ ان کی قیمتی لائبریری کی فہرستیں میں نے ہی بنائیں۔ ان کا پیش بہا کتب خانہ جن میں قلمی اور نادر کتابوں کا خاصا ذخیرہ تھا ان کی وصیت کے مطابق جامعہ ہمدرد کی لائبریری کو ان کے انتقال کے ایک سال بعد بھجوا دیا گیا۔

مالک رام صاحب کا خاندانی نام مالک رام بویجا ہے۔ ذات اروڑہ کھتری، سرکاری کاغذات اور تمام ریکارڈ میں بھی یہی نام ملتا ہے۔ لیکن اردو دنیا میں مالک رام کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ ولادت ۲۲ر دسمبر ۱۹۰۶ء کو ضلع گجرات (پاکستان) قصبہ پھالیہ میں ہوئی۔ والد کا نام لالہ نہال چند تھا جو لالہ سوداگر مل کے بیٹے تھے۔ لالہ نہال چند اپنے چھ بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے اور غالباً سب سے زیادہ تعلیم یافتہ بھی تھے۔ انگریزی عہد میں فوج کے محکمہ سپلائی میں ملازم تھے اور اسی سلسلے میں سات سال چین میں مقیم رہے ان کا عین جوانی میں یعنی ۲ر جنوری ۱۹۰۷ء کو قصبہ پھالیہ میں طاعون کی بیماری میں انتقال ہو گیا۔ اس وقت ان کی عمر ۳۵ سال سے زیادہ نہ تھی اور مالک رام صاحب کل ۱۲ دن کے تھے جب وہ سایہ پدری سے محروم ہو گئے۔ ان کے بڑے بھائی ایشور داس کی عمر گیارہ برس تھی۔ والدہ کی پرورش اور بھائی کی محبت نے مالک رام صاحب کو بڑا آدمی بنایا۔ مالک رام صاحب چار برس کے تھے کہ ان کی والدہ نے ان کو سکھوں کے مقامی گرودوارہ میں پڑھنے کے لیے بٹھا دیا۔ اس زمانے میں اسے دھرم شالہ کہتے تھے۔ حافظہ بچپن سے بہت تیز تھا اس لیے بہت جلد سبق یاد ہو جاتا۔ یہاں ابتدائی تعلیم پنجابی زبان اور گورمکھی رسم الخط کے ذریعہ حاصل کی۔ اس زمانے میں اردو فارسی کی تعلیم کا عام رواج تھا۔ اسکولوں اور کالجوں میں ان زبانوں میں تعلیم لازمی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں اردو اور فارسی میں خاص طور پر دست گاہ حاصل کی۔ اپریل ۱۹۱۲ء میں مڈل پاس کیا۔ مارچ ۱۹۲۴ء میں پنجاب یونیورسٹی سے دسویں کا امتحان پاس کیا اور لاہور گورمنٹ انٹر کالج سے

Marfat.com

۱۹۲۶ء میں انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۲۸ء میں ڈی اے وی کالج لاہور سے بی اے کیا اور ۱۹۳۰ء میں لاہور سے ہی تاریخ میں ایم اے پاس کیا اور دو سال بعد ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی۔

۱۸ رمئی ۱۹۳۱ء کو لالہ دھنپت رائے کی بڑی صاحبزادی ودیاوتی سے شادی ہوئی۔ وہ ساہیوال ضلع سیالکوٹ کی رہنے والی تھیں۔ ان سے پانچ اولادیں ہوئیں۔ بڑی بیٹی کا نام اوشا، دوسری کا ارونا اور چھوٹی کا بشریٰ ہے۔ بیٹوں میں آفتاب سب سے بڑے ہیں اور سلمان ان سے چھوٹے ہیں اردو زبان تینوں بیٹیاں پڑھی ہیں۔ اسکندریہ (مصر) میں بشری آفتاب اور سلمان پیدا ہوئے اس لئے عربی زبان اچھی جانتے ہیں ملازمت کا آغاز صحافت سے ہوا۔ مضمون نگاری کا شوق بچپن سے تھا۔ باقاعدہ ۱۹۲۴ء سے لکھنا شروع کیا۔ ان کا پہلا مضمون نیرنگ خیال لاہور میں ٹیگور کی شہرہ آفاق تصنیف ''گیتا نجلی'' کے بعض ٹکڑوں کا اردو میں ترجمہ شائع ہوا۔ اس کے بعد ساٹھ روپے ماہوار پر نیرنگ خیال کی مجلس ادارت . سے منسلک ہو گئے ۱۹۳۲ء میں روزنامہ ''بھارت ماتا'' سے وابستہ ہوئے۔ اس کے بند ہونے کے بعد دلی کا رخ کیا۔ سر ظفر الدین خاں کی کوشش سے یکم اپریل کو حکومت ہند کے محکمہ تجارت میں مالک رام صاحب کا تقرر ہو گیا۔ ۱۹۶۵ء تک مالک رام صاحب کا ملازمت کے سلسلہ میں بیرونی ممالک اسکندریہ (مصر) بغداد (عراق)، بلجیم، اٹلی، جاپان اور آسٹریلیا وغیرہ میں قیام رہا۔ جہاں اردو کا نام لینے والا دور دور نظر نہیں آتا تھا۔ یہاں رہ کر انہوں نے اردو ادب کی خدمت کی۔ ایسی جگہوں پر اردو کتاب کا دستیاب ہونا کسی طرح ممکن نہ تھا لیکن انہوں نے اپنے مطالعے کو جاری رکھا۔ اس سلسلے میں دوستوں اور اپنے ملنے والوں سے خط و کتابت کر کے کتابیں منگواتے اور اپنے مطالعے کی تشنگی کو دور کرتے۔ اردو سے بے پناہ شغف کی مثال اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے۔ ''ذکر غالب''، ''عورت اور اسلامی تعلیم''، ''تلامذۂ غالب''، ''دیوانِ غالب'' اور ''خطوطِ غالب'' (مولوی مہیش پرشاد بہ نظر ثانی مالک رام) جیسی اہم کتابیں انہوں نے باہر رہ کر ہی مرتب کیں۔ ۱۹۶۵ء میں ریٹائر ہونے کے بعد ڈاکٹر ذاکر حسین نے جو اس وقت ساہتیہ اکیڈمی کے صدر تھے۔ مالک رام صاحب کو اردو کا ایڈیٹر مقرر کیا۔ یہاں تین سال یعنی ۱۹۶۷ء تک اردو ایڈیٹر رہے۔ اس مختصر سے عرصے میں انہوں نے مولانا ابوالکلام آزاد کے ترجمان القرآن ''غبار خاطر''، ''تذکرہ اور خطبات آزاد'' کو از سر نو مرتب کیا اور ان پر مقدمے اور حواشی لکھے۔

Marfat.com

مالک رام صاحب کا کتاب یا مضمون لکھنے کا طریقہ یہ تھا کہ وہ پہلے موضوع سے متعلق مواد جمع کرتے اور جب تک اصل موضوع کی تہ تک رسائی نہ ہو جاتی اس پر لکھنے کے لیے قلم نہ اٹھاتے اس کام میں کبھی کبھار میں بھی ان کا معاون رہتا۔ میں ۱۹۸۹ء میں اپنے عزیزوں سے ملنے کراچی گیا تو انہوں نے آگاہ کے قلمی دیوان کا فوٹو اسٹیٹ مجھ سے منگوایا۔ یہ نسخہ آگاہ کے پرپوتے کرار نوری صاحب کے پاس تھا جو انہوں نے غالب لائبریری کراچی میں محفوظ کرا دیا تھا۔ آگاہ غالب کے شاگرد تھے۔ سرسید کی آثار الصنادید، نظامی بدایونی کی قاموس المشاہیر اور مالک رام کی تلامذہ غالب میں ان کے حالات تفصیل سے ملتے ہیں۔

۱۹۶۷ء میں مالک رام صاحب کو ساہتیہ اکیڈمی سے فراغت ملی تو انہوں نے اپنی ابتدائی صحافتی زندگی کو پھر سے زندہ کیا اور ''تحریر'' کے نام سے تحقیق سہ ماہی رسالہ دلّی سے جنوری ۱۹۶۷ء میں نکالا۔ یہ رسالہ بارہ سال تک بڑی محنت، توجہ اور دلچسپی سے جاری رکھا۔ عام شماروں کے علاوہ جوش ملسیانی، مسعود حسن رضوی ادیب جگر بریلوی، ل۔احمد اکبرآبادی، رشید احمد صدیقی، خواجہ غلام السیدین، ضیا فتح آبادی اور غالب نمبر شائع کیے۔ بعد میں ان نمبروں کو کتابی شکل میں بھی شائع کیا۔ اسی طرح انہوں نے کئی قیمتی دستاویزوں کو اس میں محفوظ کر دیا۔ کئی عام شماروں میں مختلف ادیبوں اور شاعروں کے خطوط بھی اپنے حواشی کے ساتھ شائع کیے۔ تحریر کے اڈیٹر کے حیثیت سے بھی اعلا پائے کے تحقیقی مضامین کی اشاعت کی وجہ سے ہمیشہ مالک رام صاحب کا نام زندہ رہے گا۔

مالک رام صاحب جب بیرون ممالک سے دہلی آتے تو پہلے جنگ پورہ ایکسٹینشن کے ایک مکان میں مقیم رہے۔ اس کے بعد کناٹ پلیس میں اسٹیٹس مین کی بلڈنگ سے ملی ہوئی عمارت کے ایک حصے میں قیام کیا۔ ریٹائر ہونے کے بعد مستقل طور دہلی میں قرول باغ میں کرائے پر مکان لے کر رہنے لگے۔ اس کے بعد ڈیفنس کالونی میں چلے گئے۔ آخر وقت تک اسی مکان کے نچلے حصے میں رہے اپنی زندگی میں کوئی مکان نہیں بنوایا۔ حالانکہ خدا کا دیا ہوا ان کے پاس سب کچھ تھا۔ مالی حالت بھی بہت اچھی تھی۔ ان کا چھوٹا بیٹا سلمان ٹورنٹو میں رہتا ہے دوسرا بڑا بیٹا آفتاب انگلستان میں ملازم ہے۔ ان دونوں بیٹوں سے کبھی روپے پیسے کا مطالبہ نہیں کیا یہ دونوں بیٹے جب والد کے پاس آتے اور برابر اصرار کرتے مگر انہوں نے کبھی بیٹوں کی یہ بات نہیں مانی بلکہ بیٹوں کی آمد کی جب اطلاع ہو جاتی تو ان کو ڈالر کی شکل میں روپے دیتے اور ان کے لیے ڈالر

خریدتے۔

وہ بڑے فراخ دل اور ضرورت مندوں کے کام آنے والے انسان تھے۔ دوستوں اور عزیزوں کے مسائل توجہ سے سنتے اور ان کو حل کرنے میں ہر طرح سے ان کی مدد کرتے۔ ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ مارچ ۱۹۸۹ء میں جدہ سے جمیل الدین عالی سیمنار کا دعوت نامہ مجھے ملا، میں شام کو خوش خبری سنانے کے لیے ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور سیمنار میں شرکت کا ذکر کیا تو بہت خوش ہوئے اور یہ مشورہ دیا کہ ''میں اپنے ساتھ اپنی بیوی کو بھی لے جاؤں اور دونوں عمرہ کرتے آئیں۔ یہ اچھا موقع ہے اور ایسے موقعے بار بار نہیں آتے'' میں نے کہا آپ بجا فرماتے ہیں میرا ٹکٹ تو وہاں سے آجائے گا لیکن اہلیہ کے لیے معقول رقم درکار ہوگی جو میرے پاس نہیں ہے۔ کہنے لگے اس کے لیے فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے آپ کو جتنے روپوں کی ضرورت ہو میں دوں گا لیکن اہلیہ کو اپنے ساتھ ضرور لے جائیں'' چنانچہ دوسرے دن مجھے معقول رقم دی جو میں نے وہاں سے آنے کے بعد پانچ قسطوں میں ادا کر دی۔ مالک رام صاحب کی شخصیت میں ایسی خوبیاں بہت تھیں۔ جدہ سیمنار میں روانہ ہونے سے پہلے مدینہ منورہ مکہ شریف کی زیارت کے لیے خاص خاص ہدایتیں ایسی کیں جیسے سب کچھ پہلے دیکھ چکے ہوں۔ اردو کے علمی اور ادبی اداروں نے ان کی ادبی خدمات اور ان کی کتابوں پر انعامات دیئے لیکن اس رقم کو کبھی اپنی ذات پر خرچ نہیں کیا۔ بلکہ بیواؤں اور ضرورت مند ادیبوں کی مدد کرتے۔ میرے علم میں اس طرح کے بہت سے واقعات ہیں۔

''وہ صورتیں الٰہی'' میں مالک رام صاحب کے لکھے ہوئے دس خاکے شامل ہیں۔ اس میں غالب، سائل دہلوی، نواب صدر یار جنگ، حبیب الرحمٰن خاں شیروانی، مولانا سید سلیمان ندوی اور یاس یگانہ چنگیزی کے خاکے بڑے دلچسپ، اقتصادی اور سماجی مسائل کے بیان کرنے کا انداز اور ان کا روزمرہ کا معمول نہایت عمدہ پیرائے میں بیان کئے گئے ہیں اور ہر خاکے کی بہترین عکاسی اس میں ملتی ہے۔ انتقال سے چند مہینے پہلے ''بگا بیگم'' پر خاکہ لکھا۔ بگا بیگم نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر رخشاں کی بیٹی تھیں۔ نواب مرحوم غالب کے شاگرد تھے۔ نواب الٰہی بخش خاں والیٔ لوہارو کی دو بیٹیاں تھیں۔ بڑی بنیادی بیگم اور چھوٹی امراؤ بیگم۔ امراؤ بیگم غالب کی بیگم تھیں۔ مالک رام صاحب نے غالب پر سب سے زیادہ لکھا اور جب تک زندہ رہے غالب کے رشتے داروں، شاگردوں اور ملنے والوں کی ٹوہ میں لگے رہے اور انہیں جب کوئی سراغ پتا نشان

Marfat.com

مل جاتا تو وہاں خود پہنچ جاتے یا خط کے ذریعے تعلق پیدا کر کے غالب کے سلسلے میں معلومات فراہم کرتے۔ اس کی بہترین مثالیں ہمیں ذکر غالب اور تلامذہ غالب میں ملتی ہیں۔ بگا بیگم سائل دہلوی کی پھوپھی اماں تھیں ان کا انتقال ۹۴ برس کی عمر میں ۱۰ رمئی ۱۹۴۵ء کو دلی میں ہوا۔ اب ذرا مالک رام صاحب کی زبانی بگا بیگم کی گفتگو کی ایک جھلک ملاحظہ ہو۔

''میں شادی کے بعد گھر میں آئی تو ایک عجیب بات دیکھی کہ ہر ایک سالن میں گوشت ہو یا ترکاری چنے کی دال پڑتی ہے۔ مجھے چنے کی دال ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔ میں نے اپنے گھر میں بھی چنے کی دال کبھی نہیں کھائی تھی چنانچہ میں رخصتی کے بعد آئی تو جب پھوپھی اماں نے مجھ سے کہا کہ سالن میں تھوڑی سی چنے کی دال ڈال دو۔ تو میں نے کہا کہ مجھے تو چنے کی دال پسند نہیں ہے۔ اس پر انہوں نے کہہ دیا۔ اچھا اگر پسند نہیں ہے تو نہ ڈالو۔ چنانچہ اس دن سالن بغیر دال کے پک گیا۔ جب مرزا صاحب دوپہر کھانے پر بیٹھے تو دیکھا کہ سالن میں دال نہیں ہے۔ انہوں نے خیال کیا کہ گھر میں دال ختم ہو چکی تھی اس لیے نہیں ڈالی گئی۔ کہا بھئی اگر دال ختم ہو گئی تھی تو بازار سے منگوالی ہوتی یا مجھ سے کہا ہوتا میں مرُاری کو بھیج کر منگوا دیتا''۔

''وہ صورتیں الٰہی'' کے علاوہ ''تذکرہ معاصرین'' ان کا قابل قدر کام ہے۔ یہ چار جلدوں میں ہے ہر شاعر اور ادیب کے انتقال کے بعد اس کے تاثرات اور اس کی زندگی کے حالات تفصیل سے ان جلدوں میں محفوظ کر دیئے گئے ہیں۔ نئے مواد کی تلاش میں ہمیشہ سرگرداں رہے اس کی فراہمی کے لیے دوستوں سے بلا تکلف فرمائش کرتے۔

جناب ضیاء الدین اصلاحی اپنے ایک مضمون میں مالک رام انسان دوستی کے بارے میں لکھتے ہیں۔

''مالک رام صاحب کی انسان دوستی کی راہ میں ہندو مسلمان کی تفریق حائل نہیں ہوتی تھی۔ جناب محمد باقر سابق پرنسپل یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور ان کے بچپن کے بے تکلف دوست تھے دونوں ایک دوسرے کے گھر پر برابر آیا جایا کرتے تھے۔ مالک رام صاحب کے ڈی اے وی کالج لاہور میں داخلہ لینے کے بعد باقر صاحب لاہور جاتے تو وہ انہیں زبردستی اپنے ساتھ ہاسٹل میں لے آتے حالانکہ ان دنوں کالج کے ہوسٹل میں کسی مسلمان کو ٹھہرانا سنگین جرم تھا۔ مگر مالک رام صاحب خطرہ مول لے کر انہیں اپنے ساتھ ٹھہراتے۔ اتفاق سے ایک دفعہ وہ ہوسٹل میں بیمار ہو گئے تو مالک رام صاحب نے ہندو ڈاکٹر سے ان کا غلط نام بتا کر دوا لی اگر کہیں یہ راز فاش ہو جاتا

Marfat.com

تو مالک رام صاحب کو ہوسٹل خالی کرنا پڑتا''۔

مالک رام صاحب کے گھر کا ماحول اسلامی تھا خاص کر ان کا ڈرائنگ روم جہاں آیت الکرسی اور قرآنی آیات کے قطعات آویزاں تھے۔ جو مسلمان ان سے ملنے آتے اور نماز کا وقت ہو جاتا تو ان کے لیے جائے نماز رکھی ہوئی ملتی۔ پروفیسر اسلم جو سعید احمد اکبر آبادی مرحوم کے داماد ہیں وہ اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں۔

''مالک رام صاحب کی یہ بڑی خواہش تھی کہ ان کی نعش ہندوؤں کے طریقے کے مطابق جلانے کے بجائے مسلمانوں کے شعار کے مطابق بستی حضرت نظام الدین اولیاء میں دفن کی جائے اور اگر وہاں کسی وجہ سے قبر کے لیے جگہ نہ مل سکے تو پھر جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے قبرستان میں سپرد خاک کی جائے۔ انہوں نے اپنی وفات سے دو تین روز قبل اپنے اہل خانہ سے کہا کہ وہ دہلی کے فلاں فلاں مسلمان کو بلائیں۔ شاید وہ ان کے سامنے اپنی وصیت کا اظہار کرنا چاہتے تھے لیکن اہل خانہ نے ان کی خواہش پوری نہ ہونے دی''۔

یہ بات صحیح ہے کہ مجھے اور ڈاکٹر خلیق انجم کو گھر والوں نے ملنے نہیں دیا۔ البتہ انتقال سے تقریباً ایک ہفتہ پہلے میں ان کو دیکھنے اسپتال گیا تھا لیکن اس وقت ان کی حالت زیادہ خراب نہ تھی مجھے سے کہا تمہیں کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہیں اس لیے سیدھے ادھر چلے آؤ۔ اس کے بعد ملنے پر سخت پابندی لگا دی گئی لیکن میں فون سے برابر خیریت لیتا رہا ایک دن اچانک صبح ۵ بجے فون آیا کہ مالک رام صاحب کا انتقال ہو گیا اور ان کی ارتھی ۱۲ بجے شمشان گھاٹ لے جائی جائے گی۔ میں نے ریڈیو، ٹیلی ویژن اور ان کے دوستوں اور ملنے والوں کو فون سے اطلاع دے دی۔ بڑا دکھ ہوا اس بات سے کہ سوچنے سمجھنے کا موقع تک ان کے گھر والوں نے نہیں دیا او سان خطا تھے۔ بعد میں یہ عقدہ کھلا کہ جلدی کیوں کی گئی تھی۔ میرے بار بار اصرار پر وصیت نامہ گھر والوں نے نہیں دکھایا سب ایک دوسرے پر ٹالتے رہے۔

انتقال ۱۶/اپریل ۱۹۹۳ء صبح ۵ بجے ہوا دن جمعہ تھا۔ عمر ۸۶ سال تین ماہ سولہ دن تھی۔ آخر عمر میں چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے تھے۔ ٹانگوں میں سب زیادہ تکلیف رہتی تھی۔ ٹانگیں چلنے سے لڑکھڑانے لگتیں بغیر سہارے کے چار قدم چلنا مشکل ہو جاتا ڈاکٹر کی ہدایت پر لکڑی کے سہارے چلتے تھے۔ چنانچہ جب کبھی باہر جانا ہوتا تو اپنے نواسے وکرم سالوجا کو ساتھ لے جاتے۔ بغیر ساتھی کے باہر جانے پر قدغن لگی رہتی۔ نواسہ دوپہر میں اسکول سے واپس آتا اور کہیں باہر

Marfat.com

جانے کا پروگرام ہوتو وہ اس کے منتظر رہتے۔ بعض وقت ایسا بھی ہوتا کہ ہفتوں گھر سے باہر نہیں نکلتے۔ صبح کے وقت ہواخوری کی عادت بھی ڈاکٹروں کی ہدایت پر ختم کردی تھی ورنہ انتقال سے دو سال پہلے تک دوکلومیٹر چل لیتے تھے اب مالک رام صاحب جیسا علم کا شیدائی، غالب کا پرستار اورآزادشناس ڈھونڈنے سے نہیں ملے گا۔

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

☆☆☆

پروفیسر مونس رضا

مونس بھائی جو تعلیم وتدریس کی دنیا میں پروفیسر مونس رضا کے نام سے مشہور تھے ہمارے لئے راہی معصوم کے رشتے سے صرف مونس بھائی تھے۔ راہی میرے دوست تھے اس لئے مونس بھائی مجھ سے بھی اسی محبت کا برتاؤ کرتے تھے۔ ان میں ایک بڑی خوبی تھی جو شاذ و نادر ہی لوگوں میں ہوتی ہے وہ کبھی کسی میں چھوٹے ہونے کا احساس نہیں پیدا ہونے دیتے تھے وہ خواہ عام بات چیت ہو یا کوئی علمی و ادبی مسئلہ اپنی بات کہنے میں بھی وہ اس کا خیال رکھتے تھے کہ دوسرے کو کوئی بات بری نہ لگے ان کی گفتگو کا انداز ہی ایسا تھا کہ اختلاف کی صورت میں بھی کبھی یہ نہیں ہوا کہ کوئی ان کے پاس سے دل برداشتہ اٹھا ہو۔

بہت دنوں کی بات ہے اب تو اس کی یاد سے بھی بڑا عجیب سا محسوس ہوتا ہے۔ میری پہلی کتاب شائع ہوئی تھی میں بہت خوش تھا جیسے میں نے کوئی بہت بڑا معرکہ سر کر لیا ہو۔ راہی نے ''عوامی دور'' میں اس پر تبصرہ کیا اور میری خوب خوب خبر لی۔ مجھے بہت غصہ آیا، یہ اچھی دوستی رہی، میں نے بنے بھائی (سجاد ظہیر) سے شکایت کی انہوں نے بڑے آرام سے کہہ دیا، تم جواب دو یہ تو علمی بحث ہے۔ میں نے بھی جواب دیا جو اتنا ہی سخت تھا۔ وہ بھی ''عوامی دور'' میں چھپ گیا۔ راہی سے ملاقات ہوئی تو مونس بھائی بھی تھے ہم لوگوں نے ایک دوسرے کی شکایت کی، ہنسنے لگے، کہا تم لوگوں کی بحث میر انیس پر ہے لیکن ایسا لگتا ہے کہ میر انیس کو اچھی طرح پڑھا نہیں ورنہ ان کے اس شعر کو کبھی نہ بھولتے:

خیال خاطرِ احباب چاہیے ہر دم
انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

Marfat.com

ایسا بے ساختہ شعر سن کر ہم دونوں ہنسنے لگے اور پھر بات زبان کی تہذیبی قدروں پر ہونے لگی۔

مونس بھائی کا تعلق مشرقی یوپی کے ایک مشہور علمی وتہذیبی گھرانے سے تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ علم، تحقیق، جستجو، تہذیب، شرافت غرض زندگی کی تمام اعلیٰ اقدار کے سوتے ان کے گھر سے نکلتے ہیں۔ وہ سید بشیر حسن عابدی کے بیٹے، فارسی کے مشہور محقق اور ہر دل عزیز استاد پروفیسر امیر حسن عابدی کے چچازاد بھائی اردو کے مشہور نقاد پروفیسر ممتاز حسین اور اپنے عہد کے ممتاز ومنفرد خطیب، عالم، دین اور مجتہد مولانا ابن حسن نونہروی کے قریب ترین عزیزوں میں تھے۔ خود مونس بھائی ہندوستان کے صف اول کے ماہرین تعلیم میں تھے جس نے ساری زندگی تعلیم کو فروغ دینے اور ہندوستان میں جدید تعلیم کی سطح اور معیار کو بلند کرنے کے ذرائع اور ان پر تجربے کرنے میں گزاری۔ وہ ۲۰ رفروری ۱۹۲۵ء کو غازی پور میں پیدا ہوئے۔ علیگڑھ سے اپنی زندگی کا آغاز کیا۔ ایک عرصہ تک وہ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ میں لکچرر اور ریڈر رہے، یوں تو جغرافیہ ان کا موضوع تھا لیکن انکے علم کا میدان بہت وسیع تھا اور دراصل ان کا بنیادی موضوع تعلیم وتہذیب تھا اور اس کے ساتھ ہی ادب سے انہیں کمزوری کی حد تک لگاؤ تھا، وہ بہت دنوں تک ریجنل انجنیرنگ کالج سری نگر کے پروفیسر اور پرنسپل رہے۔ سری نگر میں ان کا مکان ایک تہذیبی مرکز تھا اور اس کی اس مرکزی حیثیت کو بنائے رکھنے میں شہلا آپا (بیگم مونس رضا) کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ مہمانوں سے بھرے ہوئے اس گھر میں ہر ایک کو اس کی ضرورت کی چیزیں فراہم کرنا، ہر ایک کا خیال رکھنا اور پھر مونس بھائی کی نگہداشت یہ واقعی انہی کا حصہ تھا۔ انہیں ہنگاموں میں ایک بار اچانک شام کو میں اور شمیم بھی ان کے یہاں پہنچ گئے۔ مونس بھائی لمبا کشمیری فرن پہنے بیٹھے تھے۔ وہی بڑی بڑی آنکھیں، چوڑی پیشانی، دراز قد، دہرا بدن، شگفتہ چہرہ، کشادہ دل آنکھوں میں ایسی ذہانت کہ دل کی بات پڑھ لیں، بڑی خندہ پیشانی سے بٹھایا۔ شہلا آپا بھی آگئیں، باتوں میں بات نکلنے لگی، شعر وادب کا ذکر ہونے لگا، حکایت لذیذ دراز تر ہوتی گئی اور پھر ہم لوگ کھانا کھا کر ہی اٹھے اور جتنے دن ہم لوگوں کا قیام سری نگر میں رہا ان سے ملے بغیر اچھا نہ معلوم ہوتا۔ اس زمانے میں کمال احمد صدیقی صاحب ریزیڈنسی روڈ پر رہا کرتے تھے۔ کبھی وہ بھی آجاتے تو لگتا نسیم باغ نہیں لکھنو ہے۔ کشمیر کے بعد کچھ عرصہ وہ امریکہ میں کورنل یونیورسٹی میں وزیٹنگ پروفیسر رہے لیکن تعلیم کے میدان میں ان کا سب سے بڑا کارنامہ دہلی میں سینٹر فار اسٹڈیز آف ریجنل ڈیولپمنٹ کا قیام ہے

Marfat.com

وہ اس کے بانی چیرمین اور پروفیسر تھے۔ یہ سنٹر ان کی اسی فکر کا نتیجہ تھا کہ آزاد ہندوستان میں تعلیم کا طریقہ ڈگری حاصل کرنے کے بجائے علم حاصل کرنے کی بنیاد پر ہونا چاہیئے اس کے بعد اسی فکر پر جواہر لال نہرو یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے قیام میں بھی مونس بھائی کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ وہ اس کے پہلے رئیکٹر تھے JNU میں ایک مخصوص کلچر کو ڈیولپ کرنے تعلیم کے نئے معیار متعین کرنے اور ایک نیا نصاب تعلیم بنانے میں ان کا بڑا حصہ تھا، نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن پلاننگ اینڈ ڈیولپمنٹ یعنی (نی پا) کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے بھی انہوں نے اہم تعلیمی خدمات انجام دیں اور آخر میں وہ دہلی یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ ان کے علمی کارناموں کی فہرست اتنی طویل ہے کہ اس کا احاطہ کرنے کے لئے بڑا وقت چاہئے۔ اپنی ان ذمہ داریوں کے ساتھ تصنیف وتالیف کا کام بھی آخر وقت تک جاری رہا۔ انہوں نے تقریباً بیس کتابیں لکھی ہیں۔ ان میں تعلیم ترقی اور سماج، تعلیم اور دیہی تبدیلیاں، ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم۔ ماضی حال مستقبل، اسکولی تعلیم کا علاقائی پس منظر، قبائلی ایٹلس وغیرہ ایسی کتابیں ہیں جو ہندوستان میں تعلیم کا نیا تصور پیش کرتی ہیں۔

یہ بات کم لوگوں کو معلوم ہوگی کہ وہ ایک صاحب طرز نثر نگار تھے۔ انہوں نے ادب پر کوئی کتاب نہیں لکھی نہ باقاعدہ ادبی مضامین لکھے اس کے باوجود انہوں نے اردو میں جو کچھ لکھا اس میں ان کا اسلوب ایک خاص رنگ رکھتا ہے۔ مونس بھائی کے علاوہ تین ماہرین تعلیم بہت اچھے نثر نگار گزرے ہیں۔ ذاکر صاحب، سیدین صاحب اور عابد صاحب ان کا اپنا ایک اسلوب تھا لیکن یہ باقاعدہ اردو میں لکھتے تھے اور اردو کے نام آور ادیب تھے، مونس بھائی عام طور پر اردو میں نہیں لکھتے تھے اس کے باوجود جو کچھ انہوں نے لکھا اس کی اپنی ایک اہمیت ہے۔ ان کی آخری کتاب آدمی نامہ، عجیب وغریب کتاب ہے۔ یہ کتاب ایک بہت دقیق اور سائنسی موضوع پر ہے یعنی انسان کا وجود اور اس کا ارتقاء اس خالص سائنسی، بے حد پیچیدہ اور تحقیقی موضوع کو جس اسلوب میں انہوں نے بیان کیا ہے۔ وہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے، انسان کیا ہے؟ اس کا وجود کیوں کر ہوا؟ یہ دنیا کیسے بنی؟ اس کی کیا عمر ہے؟ آج کے انسان کو اپنی موجودہ شکل تک پہنچنے میں کتنا عرصہ لگا؟ یہ بڑے متنازع مسائل ہیں لیکن انہوں نے اسے لکھنے میں ایسا دلکش اسلوب اختیار کیا کہ باوجود اس کے کہ وہ ہمارے آپ کے اجداد کا رشتہ نہ جانے کہاں کہاں جوڑتے چلے جاتے ہیں، TRIBULITE گھوڑے، گدھے، بن مانس سے اپنی رشتہ داری سے آپ اتفاق کریں یا نہ

Marfat.com

کریں یا ان کی بات کا برا مانیں، کتاب کو ختم کیے بغیر ہاتھ سے نہیں رکھ سکتے یہ ان کے اسلوب کا کمال ہے۔ دیکھئے انسان کی کہانی جو دس لاکھ سال سے بھی زیادہ پرانی ہے اور زندگی کے ارتقا کا ایک جزو ہے چار ارب ستر کروڑ سال کی اس زمین کے ساتھ ساتھ چل رہی ہے، اس کہانی کو وہ کس دلچسپ انداز میں پیش کرتے ہیں، آدمی نامہ، کا پہلا صفحہ یوں شروع ہوتا ہے:

''شادی بیاہ کے موقعوں پر حسب نسب کی بحثیں تو آپ نے ضرور سنی ہوں گی، کیا کیا گڑے مردے اکھاڑے جاتے ہیں۔ بوڑھی دادیاں سرجن بن کر زبان کی چھریوں سے پوسٹ مارٹم کے فرائض انجام دیتی ہیں۔ لڑکی کے پردادا کی چھوٹی ممانی کھری پٹھانی نہیں تھیں اس لیے یہ رشتہ نہیں ہوسکتا۔ ہمارے خاندان میں ایسا داغی پیوند نہیں لگ سکتا۔ اپنی بے داغ شرافت کے ثبوت میں کسی پرانے صندوق میں سے ایک لمبا کیڑوں کا کھایا ہوا کاغذ نکالا جاتا جس پر ایک درخت سا بنا ہوتا، غور سے دیکھئے جڑ میں خاندان کے مورث اعلیٰ کا نام لکھا ہے جڑ سے کئی شاخیں پھوٹی ہیں جن پر مورث اعلیٰ کی اولاد اور اولاد کی اولاد کے نام لکھے ہیں... اس طرح خاندان کے ارتقا کا نقشہ بنا ہے جسے شجرۂ نسب کہتے ہیں''۔

(آدمی نامہ صفحہ ۱)

لیکن سوال یہ ہے کہ یہ شجرۂ نسب کہاں سے آیا۔ مورث اعلیٰ کے مورث اعلیٰ اور ان کے مورث اعلیٰ کون تھے یہی سوال انہیں بھی پریشان کرتا ہے اور وہ لکھتے ہیں:

''آدمی جس کے تخیل نے شعر و ادب کی دنیا بسائی۔ جس کے ہاتھوں نے اجنتا کے نقش و نگار بنائے جس کی فکر و کاوش نے ذرّے کا جگر چیرا۔ جس کے انس و محبت نے دلوں کو سماج کی لڑی میں برو دیا یہ گوشت پوست کا ڈھانچہ کیا ہے؟

مذہب پکارا : زمین پر خدا کا خلیفہ ہے۔

یونان سے آواز آئی : ایک سماجی جانور ہے۔

سائنس نے کہا : کائنات کا ایک ذرہ ہے۔

آخر کیسے معلوم ہوا کہ آدمی یہ ہے یا وہ ہے یا کبھی کچھ ہے''۔

(صفحہ ۲۹)

یہ بات اسی طرح چلتے چلتے ہوموسیپین HOMO SAPIEN تک پہنچ جاتی ہے۔

Marfat.com

انسان حرکات کی زبان سے آواز کی زبان کی منزل میں داخل ہوتا ہے دیکھئے زندگی کے اس کا نقلاب کی تصویر وہ کس طرح کھینچتے ہیں:

''دھیرے دھیرے وہ شکنجے ڈھیلے پڑنے لگے جنہوں نے زبان کو جکڑ رکھا تھا گلے کی ساخت بھی بدلنے لگی اور انسان'' حیوان ناطق'' بن گیا۔ گلے سے نکلنے والی آوازوں کی یکسانی ختم ہوگئی۔طرح طرح کی آوازیں نکلنے لگیں، کسی میں شہد کی سی مٹھاس تھی۔ کسی میں پتھر کی سی سختی، لہجے میں وہ لوچ وہ جھنکار وہ رس پیدا ہوا جسے سن کر لوگ سر دھنتے ہیں۔ اسی سے دھرپد کا طلسم جاگا اور خیال کی عظیم وسعتیں پیدا ہوئیں اسی کے بل پر لوری کے مدبھرے بول اٹھے جن میں ممتا کی روح سمٹ کر آ گئی''۔

(صفحہ:۳۸)

اس کتاب کا اختتام انہوں نے نظیر اکبر آبادی کی نظم آدمی نامہ پر کیا ہے، ایسے مشکل اور خشک موضوع پر ایسی دلکش زبان میں لکھنا انہیں کا حصہ ہے اور اس خوبصورت اختتام نے اس کی دلکشی کو دوبالا کر دیا ہے۔

مونس بھائی اچھے خطیب اور مقرر بھی تھے یہاں بیٹھے ہوئے بیشتر حضرات نے مختلف موقعوں پر ان کی تقریریں سنی ہوں گی۔ جلسہ تعلیم تاریخ، تہذیب پر ہو یا ادب کے کسی موضوع پر جب وہ بولنے کھڑے ہو جاتے ہیں تو بس وہ کہیں اور سنا کرے کوئی، بات بات میں ایسے برمحل اور برجستہ اشعار پڑھتے کہ محسوس ہوتا یہ اشعار اسی موقع کے لئے لکھے گئے ہیں، ایک بار سہ پہر کو ان سے ملنے گیا۔ دہلی یونیورسٹی کی وائس چانسلری کا زمانہ ختم ہونے والا ہے۔ باہر چائنیز گراس کے لان پر کرسیاں پڑی ہوئی تھیں وہ چائے پی رہے تھے۔ طبعیت زیادہ خراب رہنے لگی تھی۔ وہ ایسے کشادہ صدر تھے کہ جس میں دنیا سما جائے لیکن اس میں خود اپنی سانس کی گنجائش کم ہوتی جا رہی تھی۔ پھر بھی انہیں اس کی فکر تھی نہ پریشانی، اسی طرح میٹنگ کرتے، طلبہ اور اساتذہ کے مسائل حل کرنے کے لئے سارا سارا دن بحث ومباحثے میں لگے رہتے، کانفرنس اور سیمینار کے سلسلہ میں دہلی اور ملک سے باہر کا سفر کرتے، انہوں نے اپنی اس تکلیف کے ساتھ جینا سیکھ لیا تھا۔ گفتگو کا بھی ایسا انداز پیدا کر لیا تھا کہ نہ خود کو تکلف ہو اور نہ مخاطب کو بے چینی، وہی دلچسپ جملے، وہی بات بات میں شعر، مسائل پر وہی گرفت، قوت ارادی میں وہی توانائی۔ فیصلہ پر وہی قدرت

Marfat.com

اور کچھ کر جانے کچھ کرتے رہنے کی خواہش۔ میں قریب جا کر بیٹھ گیا پوچھنے لگے کیا کر رہے ہو میں نے کہا ایک کتاب پلان کر رہا ہوں۔ کہنے لگے کچھ کر کے دکھاؤ تم اردو والے صرف پلان کرتے رہتے ہو۔ ادھر ادھر کی باتوں میں وائس چانسلر کی مدت کے ختم ہونے کی بات نکل آئی سب نے دریافت کیا اس کے بعد کیا ارادہ ہے۔ کہنے لگے کئی Proposals ہیں۔ دیکھو کیا بنتا ہے۔ میں نے کہا آپ نے دہلی میں نہ زمین خریدی نہ مکان بنوایا۔ ہنستے ہوئے بولے۔ کیا کرنا ہے۔

ہوا ہوں عشق کی غارتگری سے شرمندہ
سوائے حسرت تعمیر گھر میں خاک نہیں

دہلی یونیورسٹی سے رٹائرمنٹ کے بعد دہلی کی عظیم شخصیت تحریک ہمدرد کے بانی حکیم عبدالحمید صاحب نے انہیں ہمدرد میں بلالیا اور ایک تحقیقی شعبہ کا سربراہ مقرر کر دیا اور انہیں وہ تمام سہولتیں مہیا کر دیں جو بحیثیت وائس چانسلر انہیں دہلی یونیورسٹی میں حاصل تھیں کچھ دنوں کے بعد وہ انڈین کاؤنسل فار سوشل ریسرچ کے چیئرمین ہو گئے اور آخر تک وہ ان اداروں سے وابستہ رہے۔ ۱۹۹۴ میں ان کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی۔ شروع میں دہلی ہی میں علاج ہوتا رہا جب کوئی فائدہ نہیں ہوا تو اپنے بیٹے اور بیٹی کے پاس امریکہ چلے گئے جہاں ان کی ایک بیٹی ڈاکٹر ہے۔ وہاں کے علاج سے انہیں بہت فائدہ ہوا ایک دن شہلا آپا نے بتایا کہ اب بہت اچھے ہیں اور دوستوں کے خطوط اور کتابوں کا انتظار کرتے رہتے ہیں کسی کا خط یا کوئی کتاب آجائے تو بہت خوش ہوتے ہیں۔ تم ان کو خط لکھو۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی لیکن یہ خوشی زیادہ دنوں باقی نہیں رہی ۱۸ر جولائی ۱۹۹۴ء کو امریکہ میں ہی ان کا انتقال ہو گیا۔

آج مونس بھائی نہیں ہیں لیکن ان کی باتیں جب یاد آتی ہیں تو میرؔ کا مصرعہ ذہن میں گونجنے لگتا ہے۔

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ

☆☆☆

Marfat.com

محمد مسلم

محمد مسلم صاحب کے اجداد ریواڑی کے رہنے والے تھے۔ان کا سلسلۂ نسب سالار مسعود غازی سے ملتا تھا۔ ۱۸۵۷ کی جنگ آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کی پاداش میں اس خاندان کے انیس افراد کو پھانسی دے دی گئی تھی۔قمر الدین نام کا ایک نوعمر لڑکا اس دار و گیر سے محفوظ رہ گیا تھا جو کسی طرح چھپ چھپا کر بھوپال پہنچ گیا اور وہیں کا ہو کر رہ گیا۔قمر الدین صاحب مسلم صاحب کے دادا تھے۔اس پس منظر میں یہ کہنا یقیناً غلط نہ ہوگا کہ ایثار و قربانی اور حق کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دینے کی روایت محمد مسلم صاحب کو وراثت میں ملی تھی اور انہوں نے اپنے عمل سے یہ ثابت کر دکھایا کہ وہ اس روایت کے نہ صرف حقیقی وارث تھے بلکہ اس کے بہترین امین و محافظ بھی تھے۔

قمر الدین صاحب کے صاحبزادے مستقیم الدین صاحب نے محکمہ اکاؤنٹس میں ملازمت اختیار کی اور ساتھ ہی ساتھ اصلاحی اور رفاہی کاموں کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔انہوں نے کئی انجمنیں قائم کیں جن میں انجمنِ امداد بیوگان و یتیمی اور بلا سودی قرضہ دینے والی ایک انجمن کی کارکردگی خاص طور پر نمایاں رہی ہے۔مستقیم صاحب کے دو صاحبزادے غیور حسن اور محمد مسلم تھے۔کمزور و بے سہارا لوگوں کا سہارا بننے۔لوگوں کے دکھ درد میں شریک ہونے اور محبتوں کے کبھی نہ ختم ہونے والے خزانے کو دونوں ہاتھوں سے مسلسل لٹاتے رہنے کی جو تابندہ مثال مستقیم الدین صاحب نے ایک محدود حلقے میں قائم کی تھی مسلم صاحب نے اس کا دائرہ پورے ملک تک وسیع کر دیا۔انہوں نے ایک ایک سانس اسلام کی سربلندی، مظلوموں کو انصاف دلانے، کمزوروں کا سہارا بننے اور حق و انصاف کی جدوجہد کے لئے وقف کر دی، اور یہی ان کی سب سے اہم شناخت

Marfat.com

قرار پائی۔

محمد مسلم صاحب ۲۰ ستمبر ۱۹۲۰ کو بھوپال میں پیدا ہوئے۔ڈیڑھ سال کی عمر میں والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا جب کہ والدہ کا انتقال پہلے ہی ہو چکا تھا۔اس وقت بڑے بھائی غیور حسن صاحب کی عمر صرف پانچ سال تھی۔ان دونوں بھائیوں کی پرورش ان کے نانا عبدالمتین صاحب نے کی جو عربی، فارسی، انگریزی، ترکی اور سنسکرت کے ماہر اور سائنس و فلسفہ پر کئی کتابوں کے مصنف تھے۔مسلم صاحب نے ہائی اسکول تک تعلیم حاصل کی اس کے بعد باضابطہ تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا لیکن گھر پر عربی، فارسی، اور انگریزی کی درس و تدریس کا سلسلہ بدستور جاری رہا اور انہوں نے ان تینوں زبانوں پر دسترس حاصل کر لی۔

۱۹۳۸ میں اخبار ندیم میں اعزازی سب ایڈیٹر کی حیثیت سے صحافتی زندگی کا آغاز کیا اور کچھ ہی دنوں بعد خاکسار تحریک سے وابستہ ہو گئے اور آگے چل کر اس کی مغربی کمان کے کمانڈر مقرر ہوئے۔۱۹۴۶ میں پہلی بار دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی کے الزام میں گرفتار کئے گئے۔مہینوں تک مقدمہ چلا جس کی پیروی انہوں نے خود کی اور سرکاری وکیل کا ناطقہ بند کر دیا۔ عدالت نے انہیں باعزت بری کر دیا۔۱۹۴۷ میں ''ندیم'' اخبار کے ایڈیٹر بنا دئے گئے۔۱۹۴۸ میں دوبارہ گرفتاری ہوئے اور چند مہینوں کے بعد رہا کر دئے گئے۔۱۹۵۰ میں تین مہینے کے لئے ایک بار پھر نظر بند کئے گئے۔۱۹۵۲ میں دہلی آئے۔اکتوبر ۱۹۵۳ میں ''دعوت'' کے اسسٹنٹ ایڈیٹر کی ذمہ داری سنبھالی۔۱۹۵۶ میں اس کے باضابطہ ایڈیٹر مقرر ہوئے۔''دعوت'' کے ایڈیٹر کی حیثیت سے ان پر پانچ مقدمات حکومت نے دائر کئے۔تین میں جرمانہ ہوا اور دو میں بری ہوئے (۱۹۶۴ میں ۳۱ دن تک تہاڑ جیل میں نظر بند کئے گئے) ۱۹۷۵ میں ایمرجنسی کے نفاذ کے بعد دہلی اور انبالہ کی جیلوں میں ۲۱ مہینے تک نظر بند رہے۔دل شکستگی۔مایوسی اور محرومی کے تیر و تار اندھیروں میں امید و رجا کے ننھے ننھے دیپ روشن کرنے اور انہیں اپنے جگر کے لہو اور نسوں کی چربی سے زندہ رکھنے والا یہ مرد حق آگاہ و حق شناس ۳ جولائی ۱۹۸۶ کو اپنے خالق حقیقی سے جا ملا۔انہیں دہلی میں مہندیان کے قبرستان میں دفن کیا گیا۔مسلم صاحب کثیر العیال تھے۔انتہائی تنگی اور ترشی کے حالات میں ان کی اہلیہ محترمہ نے جس صبر و ثبات کا مظاہرہ کیا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ یہ مسلم صاحب اور ان کی اہلیہ کی تربیت ہی کا نتیجہ ہے کہ ان کی اولاد بھی اسی راہ پر ہی گامزن دکھائی دیتی ہے جسے مسلم صاحب نے کبھی اپنے لئے منتخب کیا تھا۔

Marfat.com

مسلم صاحب سے میری پہلی ملاقات ۱۹۵۷ میں ان دنوں ہوئی جب میں الہ آباد یونیورسٹی سے سیاسیات میں ایم اے کر رہا تھا۔ مجھے اپنے ایک پروفیسر کے ساتھ جو کہ گلاسگو جا رہے تھے دہلی آنے کا اتفاق ہوا۔ میں ''سہ روزہ دعوت'' میں مسلم صاحب کے تبصرے ''خبر و نظر'' اور اداریے پڑھتا رہا تھا اور ان کے سحر کار قلم کا بے حد معترف تھا۔ چنانچہ مسلم صاحب سے ملاقات کی خواہش کو دبا نہ سکا اور ان سے ملاقات کرنے کا فیصلہ کیا۔ چشم تصور سے میں نے دیکھا کہ ایک بہت بڑا اور سجا سجایا دفتر ہے جس میں شیشے کی ٹاپ والی ایک لمبی سی میز کے پیچھے ایک اونچی کرسی پر مسلم صاحب براجمان ہیں۔ دروازے پر ایک چپراسی ہے جس کے ذریعے ملاقات کی درخواست میں اندر بھجوا رہا ہوں اور کمرۂ استقبالیہ میں اذن باریابی کا منتظر ہوں۔ کچھ اسی طرح کے تصور کے ساتھ میں سوئیوالان میں واقع ''دعوت'' کے دفتر پہنچا اور جب ایک صاحب سے مسلم صاحب سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی تو انہوں نے ایک کمرے کی طرف اشارہ کر دیا اور کہا کہ چلے جایئے، ملاقات ہو جائے گی۔ یہ بات میرے لئے بالکل غیر متوقع تھی۔ اور اس وقت تو حیرتوں کا پہاڑ ہی ٹوٹ پڑا جب میں ایک چھوٹے سے اور نسبتاً اندھیرے کمرے میں داخل ہوا۔ اس کمرے میں ایک چھوٹی سی میز تھی مسلم صاحب کی کرسی کے علاوہ دو کرسیاں اور تھیں اور جو خالی جگہ تھی اس میں ایک چٹائی بچھی تھی۔ مسلم صاحب غالباً اداریہ یا تبصرہ لکھ رہے تھے۔ میں نے سلام کیا۔ اپنا تعارف کرایا اور جب یہ کہا کہ انہیں دیکھنے اور ان سے ملنے کی غرض سے ہی حاضر ہوا ہوں تو ان کے ہونٹوں پر ایک شفیق لیکن جراحتوں کی غماز مسکراہٹ ابھری اور فرمایا'' دیکھنے والی چیز انسان نہیں بلکہ اس کا کام ہوتا ہے۔ دیکھنا یہ چاہئے کہ اس کی سوچ کیا ہے۔ اس کا عمل کیا ہے اور وہ اپنے قول و عمل میں کس حد تک مخلص ہے؟ مسلم صاحب اس کے بعد نہ جانے کیا کچھ کہتے رہے لیکن میں نہ کچھ سن سکا اور نہ سمجھ سکا۔ میں تکلف و تصنع اور ریا کاری سے پاک ان کے گندمی چہرے کی طرف دیکھتا رہا جسے زہد و تقویٰ اور مہر و مروت کی ایک کھلی کتاب کہنا یقیناً غلط نہ ہوگا۔ میری نگاہیں ان کی کشادہ پیشانی پر جمی رہیں جس پر غور و فکر کی لکیریں غیر معمولی حد تک نمایاں تھیں۔ میں ان کی شفیق اور روشن آنکھوں میں جھانکتا رہا جن میں اسلامیانِ ہند کے مسائل و مصائب ان کے عزائم اور حوصلوں کی جھلک صاف طور پر دیکھی جا سکتی تھی۔ مسلم صاحب مجھ سے بات بھی کرتے رہے اور ان کا قلم رکے بغیر چلتا بھی رہا۔ یہ کمال میں نے پہلی بار دیکھا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ اٹھے اور اپنے ساتھ گھر چلنے کے لئے کہا۔ میں نے ایک معمول کی طرح ان کے حکم

Marfat.com

کی تعمیل کی ۔سر پر ایک معمولی سی جناح کیپ، عام سے کپڑے کی شیروانی جس کے بٹن کھلے ہوئے تھے۔ چوڑی مہری کا پائجامہ اور پاؤں میں پالش سے بے نیاز بوسیدہ سے جوتے ۔اس ڈھب کے ساتھ مسلم صاحب دفتر سے نکلے اور چوڑی والان میں واقع اپنے چھوٹے سے مکان کی طرف چل پڑے جسے مشکل ہی سے مکان کا نام دیا جا سکتا تھا۔تنگ سے ڈیوڑھی میں ایک چٹائی بچھی تھی جو اس مکان کے مکین کی سادگی اور قناعت پسندی کی مظہر ہی نہیں تھی بلکہ عسرت کی چغلی بھی کھا رہی تھی۔اس چٹائی پر بیٹھ کر ہم نے دال روٹی اور چٹنی پر مشتمل دوپہر کا کھانا کھایا۔پھر میں نے اپنے معزز میزبان سے رخصت چاہی اور واپس ہوٹل چلا آیا۔اس پہلی ملاقات کے نقوش آج بھی میرے ذہن پر مرتسم ہیں۔مسلم صاحب نہ فرشتہ تھے نہ فوق البشر لیکن ان میں وہ خوبیاں بدرجہ اتم موجود تھیں جو کسی شخص کو نہ صرف یہ کہ عام سطح سے اوپر اٹھا دیتی ہیں بلکہ دوسروں کو اس کا گرویدہ بھی بنا دیتی ہیں۔

مسلم صاحب کی شخصیت ریشم و فولاد کا آمیزہ تھی ۔اقبال نے اپنے کلام میں مردمومن کی جو صفات بیان کی ہیں وہ بڑی حد تک ان کی عکاسی کرتے تھے۔وہ نڈر، بے باک، صاف گو اور سچے دیندار تھے۔کذب و ریا اور مصلحت کوشی دور دور تک انہیں چھو کر بھی نہیں گئی تھی۔ مایوسی، تھکن، بیزاری، بدگمانی، عیب جوئی اور خودنمائی کے الفاظ ان کی لغت میں ملتے ہی نہیں تھے۔ کامیابی اور ناکامی کا ان کا اپنا ایک الگ معیار تھا۔لوگ کامیابی یا ناکامی کا اندازہ عام طور پر دولت، شہرت اور عزت کے پیمانوں سے لگاتے ہیں لیکن مسلم صاحب کا پیمانہ ان سے بالکل الگ تھا۔ان کے نزدیک کامیاب زندگی وہی ہے جس کا ایک ایک لمحہ کسی بلند مقصد کے لئے وقف ہو۔ وہ کہا کرتے تھے کہ کوئی شخص کسی اعلیٰ و ارفع مقصد کے حصول کے لئے اپنی تمام تر ذہنی و جسمانی صلاحیتیں وقف کر دیتا ہے تو یہ مقصد حاصل نہ ہونے کی صورت میں بھی اسے ایک کامیاب انسان ہی کہا جائے گا۔ مسلم صاحب نے دولت اور شہرت کی نہ کبھی خواہش کی نہ انہیں اس لائق سمجھا کہ انہیں ادنیٰ درجے میں بھی زندگی کا حاصل قرار دے لیا جائے۔انہیں عزت ضرور ملی لیکن اس لئے نہیں کہ وہ اس کے خواہاں تھے بلکہ اس لئے کہ ان کی ایثار پیشہ شخصیت لوگوں کو اس بات کے لئے مجبور کر دیتی تھی کہ وہ انہیں وہ عزت دیں جس کے وہ بجا طور پر مستحق تھے۔

مسلم صاحب کی پوری زندگی جہد مسلسل سے عبارت رہی ہے وہ ظلم و جبر اور ناانصافی کے خلاف ہمیشہ صف آرا رہے اور اس کے لئے بڑے سے بڑا خطرہ مول لینے میں کبھی کوئی ہچک

Marfat.com

محسوس نہیں کی ۔انہوں نے زندگی کو ہر روپ میں برتا اور دیکھا۔ ۱۹۴۲ میں کیرلا میں خاکسار تحریک کا تعارف کرانے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ایک مختصری رقم کے ساتھ وہ کیرلا جا پہنچے۔ مالا بار کے علاقہ سے انہوں نے اپنا کام اس طرح شروع کیا کہ دن میں نفلی روزہ رکھتے اور شام میں کیلا یا اسی طرح کی کوئی چیز لیکر روزہ افطار کر لیتے تھے، انتہائی احتیاط کے ساتھ خرچ کرنے کے باوجود جب جیب خالی ہوگئی تو انہوں نے محنت مزدوری شروع کردی۔ دن میں اینٹیں ڈھوتے اور جو کچھ ملتا اسے جسم و جان کا رشتہ برقرار رکھنے کے لئے خرچ کرتے۔ کیرلا مسلم لیگ کے اس وقت کے لیڈر جناب عبدالرحمٰن بافقیہ کے علم میں جب یہ بات آئی تو انہوں نے اور کچھ دوسرے لوگوں نے بھی مسلم صاحب کو اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کی کہ وہ ان کی میزبانی قبول کرلیں لیکن وہ اس پر تیار نہیں ہوئے۔اس واقعہ کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''محنت مزدوری کرنے اور پھر کاز کی خدمت کرنے میں جو لذت مجھے حاصل ہوئی اس کے لئے جی ترستا ہے''۔ظاہر ہے محنت مزدوری کر کے کسی کاز کی خدمت کا فریضہ وہی شخص انجام دے سکتا ہے جسے اپنے کاز سے والہانہ عشق بھی ہو اور اپنے دست و بازو پر پورا پورا بھروسہ بھی ہو۔ مسلم صاحب ایسے ہی جواں عزم، مخلص اور ایثار پیشہ شخص تھے، ان کی زندگی میں ایسی ایک دو نہیں بلکہ درجنوں مثالیں ملتی ہیں جب انہوں نے دوسروں پر بار بننے کے بجائے خود تکلیف اٹھائی اور خود بھوکے رہ کر دوسروں کا پیٹ بھرنے کی کوشش کی۔

یہ غالباً ۱۹۴۶ کی بات ہے ان دنوں گوالیار کی فضا خاصی خراب ہو چلی تھی اور مسلمانوں کے قافلے وقفہ وقفہ کے ساتھ پناہ کی تلاش میں بھوپال پہنچنے لگے تھے۔ مسلم صاحب اپنی جان جوکھم میں ڈال کر اپنے تین ساتھیوں کے ساتھ صورتحال کا جائزہ لینے کے لئے گوالیار پہنچ گئے۔ گوالیار میں ان پر کیا گزری اس کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں: '' ایک شام ہم چاروں افراد کا وفد وہاں کے ایک بڑے چوک سے گزر رہا تھا کہ پولیس کے ایک دستے نے ہمیں روک لیا اور کہا کہ ہم اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش کردیں۔ہم نے ان کے جواب میں بہت نرمی سے کہا کہ ہم گرفتاری دینے کے لئے تیار نہیں البتہ آپ اگر گرفتار کرنا چاہیں تو جبر کے ذریعہ کوشش کر لیجئے۔ چنانچہ آناً فاناً پورے چوک میں چار لاریوں میں پولیس کے دستے آگئے اور ہمیں گھیر لیا۔ کرفیو نافذ کر دیا گیا۔ادھر ہم نے بھی ایک دیوار کی آڑ پکڑ لی اور پولیس کو یہ سمجھ کر چیلنج کیا کہ اب کچھ ہی دیر میں ہم بندوقوں کا نشانہ بننے والے ہیں۔ خیر عین موقعہ پر ایک سمجھدار پولیس آفیسر آگیا اور اس

Marfat.com

نے معاملہ کو رفع دفع کرانے کی کوشش کی۔ ہم نے کہا کہ پہلے پولیس کے دستے یہاں سے ہٹ جائیں اس کے بعد آپ سے بات چیت کی جاسکتی ہے۔"

اس واقعہ کا شہر کے مسلمانوں پر یہ اثر پڑا کہ جانے والے لوگوں کی تعداد اچانک کم ہوگئی اور جو ہزاروں آدمی اسٹیشن پر پڑے ہوئے تھے ہمت پا کر اپنے اپنے گھروں کو لوٹ آئے۔ جو مسجدیں بند پڑی تھیں وہ کھل گئیں اور یہ سلسلہ رک گیا"۔

مسلم صاحب جب کوئی فیصلہ کر لیتے تھے اور انہیں یہ یقین ہو جاتا تھا کہ وہ حق پر ہیں تو وہ اس پر بہر صورت قائم رہتے تھے۔ دنیا کی کوئی طاقت انہیں پیچھے ہٹنے کے لئے مجبور نہیں کر سکتی تھی۔ غالباً ۱۹۴۸ کی بات ہے کہ وہ گوالیار جیل میں نظر بند تھے ایک دن چیف کمشنر نے ان سے ملاقات کر کے کہا کہ اگر وہ یہ لکھ کر دے دیں کہ پاکستان جانا چاہتے ہیں تو انہیں فی الفور رہا کر دیا جائے گا۔ مسلم صاحب نے بہت ہی نرمی کے ساتھ لیکن بہت ہی سخت اور فیصلہ کن لہجے میں ان سے کہا کہ انہیں تو بہر صورت اور بہر قیمت اپنے ملک میں ہی رہنا ہے۔ چیف کمشنر صاحب غصے سے بپھر گئے اور کہنے لگے کہ ہم آپ کو جیل سے باہر نہیں نکلنے دیں گے سڑتے رہئے اسی جیل میں"۔ مسلم صاحب نے بڑے رسان کے ساتھ کہا" یہ آپ کے اختیار کی بات نہیں ہے فیصلے زمین پر ہی نہیں آسمان پر بھی ہوتے ہیں۔ جب تک اللہ تعالیٰ ہمیں یہاں رکھنا چاہے گا ہم سمجھیں گے کہ ہمارے لئے کام کا میدان جیل ہی میں ہے"۔ بیچارے کمشنر صاحب اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ اس طرح کی آزمائش کے مراحل مسلم صاحب کی زندگی میں بار بار آئے اور وہ ہمیشہ ثابت قدم ثابت ہوئے۔ ان کے پائے استقلال میں کبھی بھی ذرا سی بھی لرزش نہیں آئی۔

بنگلہ دیش تحریک کے دوران جب ملک کی فضا انتہائی گرم ہو چلی تھی اور سرکاری مشینری بنگلہ دیش کی تحریک کو حق بجانب ٹھہرانے میں ایڑی چوٹی کا زور لگائے ہوئی تھی، قومی اور علاقائی اخبارات نے اپنے آپ کو بنگلہ دیش تحریک کی حمایت کے لئے پورے طور پر وقف کر رکھا تھا تو مسلم صاحب اس طوفان سے بے پروا اس بات پر سختی کے ساتھ قائم رہے کہ پاکستان کی ٹوٹ پھوٹ کے نتیجے میں برصغیر میں داخلی انتشار، بے چینی اور ٹوٹ پھوٹ کے ایک ایسے دور کا آغاز ہوگا جو کہ نہ تو ہندوستان کے لئے بہتر ہوگا اور نہ پاکستان کے لئے۔ مسلم صاحب پر مختلف حلقوں سے زبردست دباؤ ڈالے گئے لیکن وہ اپنے اس موقف پر سختی کے ساتھ قائم رہے یہاں تک کہ انہیں اور جماعت کے دوسرے لیڈروں کو گرفتار کر کے حوالۂ زنداں کر دیا گیا۔

Marfat.com

انہیں دنوں ایک اور واقعہ بھی ہوا جو اس اعتبار سے قابل ذکر ہے کہ مسلم صاحب ان لوگوں کے لئے بھی مخاصمت، معاندت یا ناگواری کے کسی احساس کو اپنے پاس پھٹکنے تک نہیں دیتے تھے جو ان کی کردار کشی اور ان کی مخالفت کے معاملے میں کسی بھی حد تک گر جانے سے بھی گریز نہیں کیا کرتے تھے۔ ہوا یہ کہ وزارت اطلاعات ونشریات کی طرف سے اردو اخبارات کے مدیروں کی ایک کانفرنس بلائی گئی جس میں مسلم صاحب کے ساتھ راقم الحروف بھی شریک ہوا تھا اس کانفرنس میں انگریزی اخبارات کے کچھ نامور ایڈیٹر حضرات کو بھی مدعو کیا گیا جنہوں نے اردو اخبارات کے مدیران کرام کو یہ بتانے کی کوشش کی کہ انہیں بنگلہ قوم پرستی کے اس غیر معمولی ابھار کو کس نظر سے دیکھنا اور پیش کرنا چاہئے۔ بعد میں اردو اخبارات کے کچھ ایڈیٹروں نے بھی اپنی استعداد کی حد تک شرکاء کو متاثر کرنے کی کوشش کی۔ آخر میں ایک بزرگ صحافی جن سے مسلم صاحب کے تعلقات بہت ہی گہرے تھے اور مسلم صاحب ہر آڑے وقت میں جن کے کام آیا کرتے تھے انہوں نے اجلاس کو مخاطب کیا اور سارا زور یہ ثابت کرنے پر صرف کر دیا کہ مسلم صاحب ہی وہ واحد ایڈیٹر ہیں جو بنگالیوں پر توڑے جانے والے اس ظلم بے پناہ کے حامی ہیں۔ انہوں نے جماعت اور دعوت پر ڈھکے چھپے الفاظ میں وطن دشمنی اور پاکستان نوازی کے الزامات بھی عائد کئے۔ مسلم صاحب یہ سب کچھ سنتے اور مسکراتے رہے۔ میں نے واپس لوٹتے ہوئے جب ان کا ردعمل جاننے کی کوشش کی تو انہوں نے بڑے ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں فرمایا کہ "اگر میرے خلاف یا دعوت کے خلاف الزام تراشی سے کسی کا قد کچھ اونچا ہو سکتا ہے تو اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے ہم جو کچھ کر رہے ہیں وہ ہمیں کرتے رہنا چاہئے۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ اس کے صلے میں ہمیں پھول ملتے ہیں یا کانٹے"۔ آں محترم کی اس ہرزہ سرائی کے باوجود ان سے مسلم صاحب کے تعلقات میں کوئی فرق نہیں آیا۔ وہ ہمیشہ کی طرح ان کے کام آتے رہے، ان کے مسائل حل کرتے رہے اور ہمہ قسم کا تعاون انہیں دیتے رہے۔ یہ وہ چیز ہے جو گوشت پوست کے بنے انسانوں میں مشکل ہی سے پائی جاتی ہے۔

مسلم صاحب کو اللہ تعالیٰ نے انتہائی بالیدہ اور زرخیز ذہن عطا کیا تھا ان کے سحر کار قلم میں بے پناہ طاقت تھی۔ وہ اگر چاہتے تو اس کے سہارے اپنی دنیا بھی سنوار سکتے تھے اور ان بلندیوں تک بھی پہنچ سکتے تھے۔ جو کسی بھی دنیا دار انسان کی معراج قرار پا سکتی ہے۔ لیکن انہوں نے ایسا کچھ نہیں کیا، انہوں نے حق گوئی اور بے باکی کو اپنا شعار بنایا اور نتیجے کے طور پر کانٹوں کا بستر ان کا

Marfat.com

مقدر بن گیا۔ وہ اس صورتحال پر مطمئن بھی تھے اور مسرور بھی۔ یہی ان کی انفرادیت تھی اور اسی کو ان کی سب سے نمایاں شناخت بھی کہہ سکتے ہیں۔ انہوں نے صحافت کو نام اور نمود اور مخالفین پر کیچڑ اچھالنے یا بیجا تنقید و تنقیص کا ذریعہ کبھی نہیں بنایا۔ انہوں نے بیجا تنقید یا الزام تراشی کا جواب اسی سکے میں دینے کی کبھی کوئی کوشش نہیں کی۔ دعوت کے صفحات اس بات کے گواہ ہیں کہ ان کے دور ادارت میں کبھی کسی شخصیت یا مسلم تنظیم کے بارے میں کوئی ایسی بات شائع نہیں ہوئی جو تنقیص کے ذیل میں آتی ہو۔ اور ان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اسی روایت کو راقم الحروف نے بھی اپنے دور ادارت میں برقرار رکھا۔

مسلم صاحب سراپا خلوص و محبت تھے اور سچی بات تو یہ ہے کہ ان کے پاس اخلاص و محبت کی دولت فراواں کے سوا دوسروں کو دینے کے لئے اور کچھ تھا بھی نہیں۔ انہوں نے دوسروں سے ٹوٹ ٹوٹ کر محبت کی اور ان سے محبت کرنے والے بھی بے شمار تھے اور اب بھی ہیں جن میں ہر عمر اور ہر مکتب فکر کے لوگ شامل تھے۔ مسلم صاحب ایک عرصہ تک جماعت اسلامی ہند کی مجلس شوریٰ کے رکن رہے۔ تحریک اسلامی کے حلقوں کی انہیں بے پناہ محبت حاصل رہی لیکن ان سے محبت کرنے والے جماعت کے دائرے کے ہی لوگ نہیں تھے اور اس کا سبب دوسری چیزوں کے علاوہ یہ بھی تھا کہ مسلم صاحب نے اپنے آپ کو ہمیشہ پوری ملت کے دکھ درد کے ساتھ جوڑے رکھا۔ مثال کے طور پر قومی یک جہتی کونسل کی تشکیل کے بعد جب بیوروکریسی نے دفعہ ۱۵۳ الف کا اندھا دھند استعمال شروع کیا اور مسلم اخبارات کے خلاف ۹۶ مقدمات دائر کر دئے گئے تو مسلم صاحب نے نہ صرف یہ کہ اس کے خلاف پوری قوت کے ساتھ قلمی جہاد شروع کر دیا بلکہ اردو ایڈیٹرز کانفرنس کے پلیٹ فارم پر اردو اخبارات کے مدیروں اور مالکوں کو جمع کر کے حکومت کو یہ انتباہ بھی دیا کہ اردو صحافتی برادری اس ظلم کو ٹھنڈے پیٹوں برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہو گی۔ لکھنؤ میں اردو ایڈیٹرز کانفرنس کا دو روزہ اجلاس منعقد ہوا۔ کلدیپ نیر صاحب کو اس کا صدر مقرر کیا گیا اور حکومت سے مذاکرات کا سلسلہ شروع ہوا جس کے نتیجے میں تمام مقدمات اٹھائے گئے۔ اردو ایڈیٹرز کانفرنس مسلم صاحب کی اپنی کوششوں کا نتیجہ تھی۔ وہ اس کے بانی بھی تھے۔ اور روح رواں بھی لیکن انہوں نے کوئی منصب قبول کرنا پسند نہیں کیا۔ یہی ان کا مزاج تھا اور یہی ان کی فطرت بھی تھی۔

اسی طرح جمشید پور اور رانچی کے ہولناک فسادات کے بعد جب پوری ملت مایوسی اور محرومی

Marfat.com

کے اتھاہ اندھیروں میں ڈوبتی دکھائی دے رہی تھی تو مسلم صاحب نے ملّت کے تمام دردمند اور مخلص لوگوں کو جماعتی مسلکی اور گروہی وفاداریوں سے بلند تر ہو کر ایک مشترک پلیٹ فارم پر جمع ہونے کی دعوت دی۔ انہوں نے اتحادِ عمل کا نعرہ دیا اور ان کی یہ کوشش مسلم مجلس مشاورت کے قالب میں ڈھل کر ہندوستانی مسلمانوں کو جینے کی ایک نئی ادا سے روشناس کرا گئی۔ مشاورت کی تشکیل میں اگرچہ ہمارے بہت سے دوسرے زعماء نے کلیدی کردار ادا کیا لیکن ان سب کے پیچھے جو قدآور فعال، دردمند اور ایثار پیشہ شخصیت کھڑی تھی وہ محمد مسلم کی ہی تھی۔

مسلم صاحب نے عملی سیاست کے میدان سے ہمیشہ دور رہے اس کے باوجود سیاسی مسلم جماعتوں کے قائدین سے ان کے تعلقات نہ صرف یہ کہ بہت قریبی رہے بلکہ ان حلقوں میں بھی ان کی بصیرت، اصابت رائے، دوراندیشی کا زبردست اعتراف پایا جاتا تھا۔ وہ ان کے نہ ہوتے ہوئے بھی ان کے اپنے تھے۔ مسلم مجلس کے بانی صدر ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی (نوراللہ مرقدہ) کو راقم الحروف نے متعدد بار بڑی حسرت کے ساتھ یہ کہتے سنا کہ کاش ہمارے پاس محمد مسلم جیسا ایک بھی شخص ہوتا۔ وہ مسلم صاحب سے بے حد متاثر تھے۔ کوئی اہم فیصلہ کرنے یا کوئی اہم قدم اٹھانے سے پہلے ان سے مشورہ ضرور کرتے تھے۔

مسلم صاحب کی زندگی کے مختلف گوشوں کا احاطہ کرنے کے لئے ایک دفتر چاہئے۔ مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ اعلیٰ اخلاق، تدبر، حکمت، فہم و دانش، دور بینی و دوراندیشی، تحمل و بردباری اور حق گوئی و بے باکی کی صفات کے انتہائی حسین اور متوازن امتزاج کا نام ہی محمد مسلم تھا۔ ان کے جیسے دیدہ ور کم ہی پیدا ہوتے ہیں۔ مسلم صاحب ہندوستانی سماج کا سب سے بیش قیمت اثاثہ اور مسلم سماج کے کیسۂ زر کا سب سے آبدار موتی تھے۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

☆☆☆

Marfat.com

پروفیسر نثار احمد فاروقی

محمد عتیق صدیقی

میر تقی میر لکھنؤ پہنچے تو کسی نے ان کی ''بودوباش'' پوچھ لی تھی، انہوں نے کہا تھا:

کیا بودوباش پوچھو ہو پورب کے ساکنو
ہم کو غریب جان کے، ہنس ہنس پکار کے
دلّی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اس کو فلک نے لوٹ کے ویراں کر دیا
ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے

دلّی اصل میں ''منتخبانِ روزگار'' کے مجموعے کا ہی نام تھا۔ آج بھی یہ ہندوستان کے ہر خطے کی نمائندگی کرنے والوں کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے، یہی اس شہر کا خصوصی امتیاز ہے۔

ہم جس شخصیت کے بارے میں آج گفتگو کر رہے ہیں وہ پورب کا ہی ساکن تھا، مگر دلّی نے اس کی ''بودوباش''، ''ہنس ہنس پکار کے'' کبھی نہیں پوچھی، اسے اپنے منتخبانِ روزگار کی صف میں جگہ دی، اور دلّی کی سوہنی مٹّی نے اسے ہمیشہ کے لیے اپنے آغوش میں لے لیا۔

محمد عتیق صدیقی مرحوم کا تعلق ردولی ضلع بارہ بنکی کے ایک ممتاز خاندان سے تھا جس میں برسوں سے تعلقہ داری چلی آ رہی تھی، مگر ان کے ہوش سنبھالنے تک وہ پرانا کروفر تو افسانہ بن چکا تھا، ایک متوسط درجے کی حالت باقی رہ گئی تھی۔ شیوخ صدیقی کے اس خاندان کی رشتہ داریاں ردولی میں خاندان حضرت شیخ احمد عبدالحق ردولوی (ف ۔ ۱۵ر جمادی الثانیہ ۸۳۷ ھ) اور قدوائی خاندانوں میں ہوتی رہیں۔

Marfat.com

محمد عتیق صدیقی کا آبائی مکان ردولی کے محلہ سالار میں سنہری مسجد کے قریب واقع تھا اس میں اب مدرسہ تبلیغ القرآن قائم ہے۔

عتیق صاحب کے والد اعجاز رسول صاحب تھے، ان کے صرف دو بیٹے ہوئے۔ محمد عتیق اور محمد خلیق، عتیق صاحب کی ولادت ۱۰ رمضان ۱۳۳۲ھ یکم اگست ۱۹۱۴ء کو ہوئی محمد خلیق مرحوم ان سے نو برس چھوٹے تھے وہ ۲۹ رمضان ۱۳۴۱ھ ۱۵ مئی کو پیدا ہوئے تھے۔

محمد عتیق صدیقی مرحوم کی ابتدائی تعلیم اس زمانے کے رواج کے مطابق گھر پر ہی ہوئی جس میں فاروقی نصاب کی ابتدائی کتابیں اور ناظرہ قرآن شریف پڑھا۔ پھر چوتھے پانچویں درجے تک ردولی کے مدرسہ میں پڑھا۔ انہیں ان کے والد کے خالہ زاد بھائی شاہ مصطفےٰ احمد نے گود لے لیا تھا، وہ گیا (بہار) میں رہتے تھے محمد عتیق کو اپنے ساتھ گیا لے گئے۔ یہاں انہوں نے ہائی اسکول تک تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد کسی سبب سے تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی استعداد پختہ ہو چکی تھی جس کی گواہی ان کی تصانیف دے رہی ہیں۔ تعلیم آگے جاری نہ رکھ سکنے کا سبب وہ خود یہ بتاتے تھے کہ اس دور کی سیاست میں سرگرم حصہ لینے لگے تھے۔

عتیق صاحب نے آزادانہ اور قلندرانہ مزاج پایا تھا۔ لکھنے پڑھنے کا ذوق شروع ہی سے تھا گیا سے وہ کسی زمانے میں لکھنو آئے۔ یہاں ان کی ملاقات ''نگار'' کے ایڈیٹر نیاز فتح پوری سے ہو گئی۔ انھوں نے نگار کے لیے کئی درجن مضامین لکھے یا دوسری زبانوں سے ترجمہ کئے۔ نیاز فتح پوری انھیں ایک مضمون کا معاوضہ پندرہ روپے دیا کرتے تھے جو زمانے کے لحاظ سے مناسب ہی تھا۔ لیکن سب مضامین عتیق صاحب کے نام سے نہیں چھپتے تھے۔ کسی پر نام ہوتا تھا، کسی پر صرف ادارہ، یا نیاز صاحب کا نام بھی آجاتا تھا۔ ایسے کئی مضامین کے بارے میں عتیق صاحب نے مجھے بتایا تھا جو ''نگار'' میں نیاز صاحب کے نام سے یا بے نام چھپے مگر وہ دراصل عتیق صدیقی مرحوم کے نوشتہ تھے۔ ''نگار'' سے ان کی یہ وابستگی برسوں تک رہی اس سے ان کے علمی و ادبی ذوق کو پروان چڑھنے کا موقع بھی ملا اور تنقید و تحقیق کا مذاق بھی پیدا ہوا۔

ملکی سیاست میں ان کی دلچسپی شروع سے تھی، یہ صرف آرام کرسی والی سیاست نہ تھی وہ عملی طور پر بھی حصہ لیتے تھے۔ تحریک آزادی میں اپنی بساط بھر شریک رہے اور چار یا پانچ بار جیل کی ہوا بھی کھائی۔ مگر آزادی کے بعد انھوں نے ''سوتنتر سینانیوں'' کی صف میں اپنا نام لکھوانا بھی گوارا نہ کیا۔

Marfat.com

جب پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۴ء) شروع ہوئی تھی تو عتیق صاحب نے عالم وجود میں قدم رکھا تھا عین شباب کا زمانہ آیا تو دوسری جنگ عظیم شروع ہوگئی۔ یہ کسی فوجی اخبار کے رپورٹر کی حیثیت سے فوج کے غیر محارب عملے NON-COMBATANT STAFF میں شامل ہوکر عراق، شام اور مصر پہنچ گئے۔ فوج میں ان کا RANK میجر کا تھا۔ مصر میں ان کا زیادہ وقت گذرا۔ وہاں کچھ فرانسیسی خواتین بھی تھیں جن کے نام ماریہ، جولی اور جویریہ تھے ان سے دوستی ہو گئی تھی خصوصاً ماریہ (مریم) سے روابط خوب ہوگئے تھے۔ اس زمانے کی رنگین حکایات انہوں نے اپنی کتاب ''یادوں کے سائے میں'' لکھی ہیں۔

مگر عتیق صاحب کے مزاج میں جو قلندرانہ شان تھی اس کو انہوں زندگی بھر اور ہر جگہ برقرار رکھا۔ کسی بات پر فوج کے افسروں سے اختلاف ہوا تو اس ملازمت پر بھی تین حرف پڑھ کر چلے آئے۔ اس کے بعد ایک مختصر وقفے کے سوا کبھی کوئی نوکری نہیں کی۔

اگست ۱۹۵۰ء میں جب ان کی عمر ۳۶ سال تھی اسماء بیگم سے ان کی شادی حیدرآباد میں ہوئی۔ اسما صاحبہ کا تعلق امروہہ کے عباسی خاندان سے ہے وہ ڈاکٹر احسن عباسی کی پوتی ہیں۔ ان کے والد محمد احمد عباسی مرحوم سابق ریاست حیدرآباد کے ضلع ورنگل میں ڈپٹی انسپکٹر آف اسکولز تھے۔ ادھر تقسیم ہند کے نتیجے میں شمالی ہندوستان کے بیشتر خاندان بٹ چکے تھے، اور ریاست حیدرآباد بھی ۱۹۴۸ء کے ''پولیس ایکشن'' کے بعد قصۂ پارینہ بن چکی تھی۔ مسلمان خاندانوں میں مناسب رشتہ ملنا ایک مسئلہ بن گیا تھا ان حالات میں لکھنؤ میں یہ رشتہ طے ہوا۔ اسماء بیگم صاحبہ اس وقت ۱۷ برس کی تھیں اور عتیق صاحب عمر کے ۳۶ ویں برس میں داخل ہو چکے تھے۔ لیکن یہ رشتہ ہوا اور کامیاب بھی رہا اگرچہ عتیق صاحب کی سیلانی طبیعت کی وجہ سے دونوں کو آٹھ۔ نو برس سے زیادہ ساتھ رہنے کا موقع نہیں ملا۔

اسماء صاحبہ محمود احمد عباسی کی بھتیجی ہیں۔ محمود احمد عباسی نے اگرچہ امروہہ کی مفصل تاریخ تین جلدوں میں لکھی ہے جس میں پہلی جلد امروہہ کے سیاسی اور تاریخی کوائف پر مشتمل ہے دوسری جلد جس کا نام تحقیق الانساب ہے اس میں امروہہ کے خانوادوں کے شجرے درج کئے ہیں، تیسری جلد ''تذکرۃ الکرام'' میں اس مردم خیز بستی کے علماء اور اولیاء اللہ کے حالات ہیں، مگر ان کی شہرت کتاب ''خلافت معاویہ و یزید'' اور ''تحقیق مزید'' سے ہوئی جس پر ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں میں خاصہ ہنگامہ بھی ہوا۔ ان کی تاریخ امروہہ پر بھی خوب لے دے ہوئی

Marfat.com

تھی۔

محمود احمد عباسی کے والد نے دو نکاح کئے۔ پہلی بیوی سے ایوب عباسی، یحییٰ عباسی، حکیم فرید احمد عباسی، داؤد عباسی اور ڈاکٹر احسن عباسی ہوئے۔ دوسری بیوی کے بطن سے چار بھائی اور چار بہنیں تھیں۔ محمود احمد، مقصود احمد سعید احمد اور مسعود احمد۔

داؤد عباسی کا جوانی میں انتقال ہو گیا تھا۔ یہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پہلے گریجوئٹ گروپ سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا واقعہ مولانا آزاد نے بھی یادگار حالی کے پیش لفظ میں لکھا ہے۔ بہت اچھے شاعر تھے۔ انہوں نے حالی کی ایک غزل کی تضمین بھی پیروڈی میں کی تھی۔ حالی کا شعر ہے:

ان کو حالی بھی بلاتے ہیں گھر اپنے مہماں
دیکھنا آپ کی اور آپ کے گھر کی صورت

داؤد عباسی نے یوں پیروڈی کی:

جب کسی کام کا کرتا ہے ارادہ انساں
دیکھ لیتا ہے اس کام کے ہے بھی شایاں
سن کے لوگوں سے، وہ کل آئے تھے داؤد کے ہاں
ان کو حالی بھی بلاتے ہیں گھر اپنے مہماں
دیکھنا آپ کی اور آپ کے گھر کی صورت

یہ تضمین انہوں نے علی گڑھ کے ایک مشاعرے میں پڑھی جس میں مولانا حالی بھی موجود تھے وہ اسے سن کر بہت محظوظ ہوئے اسی زمانے میں ان کا دیوان چھپا تھا اس کا ایک نسخہ اپنے دستخط ثبت کر کے داؤد عباسی کو عطا کیا۔

ایک اور طرحی مشاعرہ غالباً علی گڑھ ہی میں ہوا۔ مصرعہ اس طرح تھا:

سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا

اس میں کاندھلہ سے بھی شعراء آئے تھے اور اتفاق سے وہ سب گنجے تھے۔ داؤد نے اسی مناسبت سے اپنی غزل میں ایک شعر کا اضافہ کر لیا کہ:

آتا ہے جو وہاں سے وہ لاتا ہے سر پہ گنج
قارون نے کاندھلے میں لٹایا خزانہ کیا

داؤد عباسی کے دیوان کا مقدمہ مولانا محمد علی جوہر نے لکھا تھا جب وہ پانی کے جہاز سے

Marfat.com

لندن کے سفر پر جارہے تھے اور یہ ان کا آخری سفر تھا وہ انہوں نے غالباً قبرص سے پوسٹ کیا تھا۔
داؤد کا دیوان تو شاید کبھی نہیں چھپا مگر یہ مقدمہ مجھے ایسا یاد آتا ہے کہ محمود احمد عباسی نے رسالہ ''ساقی'' (کراچی) میں داؤد عباسی مرحوم کے تعارف کے ساتھ چھپوا دیا تھا۔

داؤد مرحوم کے ہی ایک بھائی مسعود احمد عباسی بھی تھے یہ انجینئر تھے۔ نارتھ بلاک اور ساؤتھ بلاک نئی دہلی کی تعمیر میں جن سول انجینئروں نے حصہ لیا تھا ان کے نام ایک پتھر پر کندہ کئے ہوئے ابھی تک نارتھ بلاک کے باب داخلہ پر موجود ہیں ان میں مسعود احمد عباسی کا نام بھی ملتا ہے۔

ان کے ایک بھائی ڈاکٹر احسن عباسی امروہہ کے نامور ڈاکٹروں میں شمار ہوتے تھے، یہی محمد عتیق صدیقی مرحوم کی بیگم اسماء صاحبہ کے دادا ہیں۔ محمد عتیق صدیقی کی شادی اگست ۱۹۵۰ء میں ہوئی تھی اس وقت تک اس عباسی خاندان کے بہت سے افراد یا تو اللہ کو پیارے ہو چکے تھے یا پاکستان سدھار گئے تھے۔ محمود احمد عباسی صاحب نے بھی غالباً ۱۹۵۰ء ہی میں امروہہ میں یہ مشہور کیا کہ وہ حج کرنے جارہے ہیں، اپنے روانہ ہونے سے قبل ایک دو دن قبل محلّہ کی ایک مسجد میں تقریر بھی کی اور مسلمانوں کو نصیحت دی کہ وہ ترک وطن نہ کریں، دو دن بعد خود چپکے سے روانہ ہو گئے اور سیدھے کراچی پہنچے۔ میں نے ان کے بارے میں ایک خاکہ رسالہ الحمراء لاہور میں چھپوایا تھا جو مولانا ظفر علی خاں کے چھوٹے بھائی حامد علی خاں صاحب کی ادارت میں شائع ہوتا تھا، اس وجہ سے محمود احمد عباسی صاحب مجھ سے بہت ناراض تھے اور ان کا خیال تھا کہ یہ تو بچہ ہے مضمون کیا لکھے گا، کسی بڑے آدمی نے لکھ کر اس کے نام سے چھپوا دیا ہے۔

پاکستان میں محمود عباسی کو شہرت ان کی کتاب ''خلافت معاویہ ویزید'' سے ملی۔ اس پر احتجاج بھی ہوا، مقدمہ بھی چلا۔ پھر معاملہ رفت وگزشت ہو گیا۔ اس کے بعد انہوں نے ایک کتاب ''تحقیق مزید'' کے نام سے لکھی اور جو کسر رہ گئی تھی وہ اس میں پوری کر دی۔

اس مضمون کو لکھنے کے زمانے میں مجھے اسما صاحبہ سے یہ بات معلوم ہوئی کہ اس ہنگامی دور میں مختلف اوقات میں محمود احمد عباسی صاحب تین بار دہلی آئے اور پھاٹک حبش خاں میں شمیم جعفری صاحب کے گھر پر رہے مگر ان کی آمد کی اطلاع نہ امروہہ میں کسی کو ہوئی نہ دہلی میں۔ حالانکہ میں اس زمانے میں دہلی ہی میں تھا۔ اور شمیم جعفری صاحب سے خوب اچھی طرح ملاقات تھی۔

عتیق صدیقی صاحب کی کوئی کتاب بلیماران کے پریس میں چھپ رہی تھی اس زمانے میں

Marfat.com

وہ دن میں بیشتر وقت پریس میں گزارتے تھے۔ بسکٹ اور پاپوں کے شوقین تھے۔ ہلیماران کی کسی دکان پر خریدنے کے انتظار میں کھڑے تھے کہ ایک بزرگ سے آدمی آکر کچھ پوچھنے لگے۔ یہ ان سے الجھ گئے کہ میں آپ سے پہلے سے یہاں موجود ہوں۔ خلاصہ یہ کہ شمیم جعفری صاحب انہیں اپنے گھر پھاٹک حبش خاں تک لے گئے وہاں دورانِ گفتگو ان بزرگ نے بتایا کہ ان کی ایک بھتیجی کی ردولی میں منسوب ہوئی ہے اس وقت انہیں یہ بتایا گیا کہ یہ اُن کی بھتیجی کے شوہر ہی ہیں۔ عباسی صاحب نے خوش ہوکر معانقہ کیا اور پھر کئی بار ملاقات ہوئی۔

مگر لطیفہ یہ ہے کہ عتیق صاحب اپنی سسرال ہونے کے باوجود کبھی ایک بار بھی امروہہ نہ جاسکے۔

شادی کے بعد اگرچہ خانگی اور معاشی ذمہ داریاں بڑھ گئیں مگر انہوں نے اپنی وضع قلندری کو نہ چھوڑا۔ کچھ دنوں کے لیے آل احمد سرور صاحب کے بلانے سے انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ سے وابستہ ہوئے۔ شاید ''ہماری زبان'' کی ادارت کا کام ان کے ذمہ کیا گیا، مگر ایک ڈیڑھ سال سے زیادہ نہ نبھا سکے۔

۱۹۶۹ء میں مختصر سی مدت کے لیے غالبؔ اکیڈمی بستی حضرت نظام الدینؒ میں بھی سکریٹری کے عہدے پر کام کیا۔ یہاں سے بھی مستعفی ہوگئے۔

ان کا زیادہ تر وقت تصنیف و تالیف میں گذرتا تھا۔ اردو قلمکار اردو میں لکھ کر اتنا بھی نہیں کما سکتا کہ جسم و جاں کا رشتہ باقی رکھ سکے، مگر عتیق صدیقی مرحوم اس تھوڑی سی آمدنی میں بھی مگن تھے جو انھیں قلم فرسائی کی بدولت مل جاتی تھی۔

ان کے مزاج میں جلد بازی بہت تھی۔ غصہ بھی ناک پر رکھا رہتا تھا۔ اس لیے ہر شخص سے ان کا نبھاؤ نہ ہوتا تھا۔ مگر ان میں حسِ مزاح تھی اچھی اور پُر مذاق گفتگو کا لطف لیتے تھے ان کی مسکراہٹ بڑی معنی خیز ہوتی تھی بعض بے تکلف احباب خصوصاً مکتبہ جامعہ کے جنرل منیجر شاہد علی خاں صاحب ان سے چھیڑ خانی بھی کرتے رہتے تھے اس سے عتیق صاحب خود بھی لطف اندوز ہوتے تھے۔

عتیق صاحب کے دوستوں کا حلقہ زیادہ وسیع نہیں تھا مگر ان کے بہت اچھے دوستانہ تعلقات سروجنی نائڈو، غلام محمد صادق اور میر قاسم جیسی شخصیات سے تھے اپنے سیاسی خیالات میں وہ کانگریس کے ترقی پسند گروپ سے تعلق رکھتے تھے اور ان کے ذہن کا جھکاؤ مارکسزم کی جانب تھا۔

مذہب سے انہیں زیادہ شغف نہیں تھا۔ ممکن ہے کسی ابتدائی زمانے میں صوم وصلاۃ کا مشغلہ بھی رہا ہو۔ میں نے انہیں مذہبی مسائل میں کسی دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا۔

انہوں نے دہلی میں نہ کوئی زمین خریدی نہ مکان بنایا حالانکہ ذاکر نگر جہاں آج زمین کی قیمت بیس ہزار روپے گز تک پہنچ چکی ہے اس وقت پانچ روپیہ گز کا بھاؤ تھا مگر ان کی ادائے قلندری کو اس سرائے فانی میں قیامگاہ بنانے کا کبھی خیال نہیں آیا۔ بٹلا ہاؤس کے ایک چھوٹے سے کرائے کے مکان میں اسی درویشانہ وضع سے رہتے رہے اور صرف قلم فرسائی سے تعلق رکھا۔

فروری ۱۹۸۲ء میں ان کے قلب پر حملہ ہوا اور ۷ رفروری ۱۹۸۲ء مطابق ۱۴ ربیع الثانی ۱۴۰۲ھ اتوار کے دن ان کا انتقال ہوا۔ جامعہ ملیہ کے قبرستان (نزد عظیم ڈیری) میں جو اولڈ بوائز کا قبرستان کہلاتا ہے دفن کیے گئے۔

ان کی جسمانی اولاد میں تین بیٹے اور ایک بیٹی یادگار ہیں: جامی، سعدی، کہکشاں اور امیر حسرو۔

کہکشاں کی شادی محمد خلیق مرحوم کے صاحبزادے سے ہوئی ہے۔ سعدی کو محمد مبین فارقی (ایڈوکیٹ) ردولی کی دختر منسوب ہیں۔ امیر خسرو کی نسبت ریحان احمد عباسی صاحب کی دختر صبیحہ سے ہوئی ہے۔

اب رہا معنوی اولاد کا احوال۔ تو محمد عتیق صدیقی مرحوم نے درجنوں مضامین رسالہ نگار (لکھنؤ) میں لکھے دوسرے اخباروں اور رسالوں میں بھی ان کی نگارشات اتنی شائع ہوئی ہیں جن کا شمار کرنا آسان نہیں۔

ان کی کتابوں کی تعداد بھی ایک درجن سے کم نہیں، مگر بعض کتابیں کہیں دستیاب نہیں۔ ان کا مختصر سا ذاتی کتب خانہ ان کے انتقال کے بعد نہرو میوزیم نئی دہلی کو دے دیا گیا تھا ممکن ہے کہ بعض کتابیں وہاں موجود ہوں۔

جن کتابوں کو دیکھ اور پڑھ کر کچھ معلومات فراہم کر سکا ہوں وہ یہ ہیں:

محمد عتیق صدیقی کی پہلی کتاب جس سے ان کے تحقیقی مزاج کا اندازہ ہوا اور جس کا علمی دنیا میں چرچا ہوا ''ہندوستانی اخبار نویسی'' ہے۔ سوا پانچ سو صفحات پر مشتمل یہ کتاب انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ نے دسمبر ۱۹۵۷ء میں شائع کی تھی۔ اس موضوع پر ابھی تک یہ کتاب نہایت جامع اور منفرد خصوصیات کی حامل ہے۔

یہاں ایک لطیفہ بھی درج کرنا بے محل نہ ہوگا۔ عتیق صاحب نے اس کتاب کا نام ''صحافت کمپنی کے عہد میں'' رکھا تھا۔ جب کاتب صاحب اس کی کچھ کاپیاں کتابت کر کے لائے تو انہوں نے صحافت کو ہر جگہ حماقت بنا دیا تھا اس کا ایک سبب عتیق مرحوم کا انداز تحریر بھی تھا انہوں نے سوچا میں کہاں تک حماقت کی اصلاح کروں گا، اس لئے نام ہی تبدیل کر دیا اور اب یہ ''ہندوستانی اخبار نویسی'' ہو گیا۔

ان کی دوسری اہم کتاب ''گلکرسٹ اور اس کا عہد'' ہے۔ اس میں فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے بارے میں اصلی ماخذ اور دستاویزوں سے ایسی اہم اور مستند معلومات جمع کر دی گئی ہیں کہ اس موضوع پر کام کرنے والا اس کتاب سے بے نیاز ہو کر گزر نہیں سکتا۔

تیسری کتاب ''اٹھارہ سو ستاون: اخبار اور دستاویزیں'' مکتبہ شاہراہ دہلی نے مئی ۱۹۶۶ء میں شائع کی تھی ۴۴۷ صفحات کی اس کتاب میں ۱۸۵۷ء سے متعلق خبریں اور دستاویزیں جمع کر دی گئی ہیں جو سیکڑوں فائلوں کی ورق گردانی کرنے کے بعد حاصل ہوئی تھیں۔

مذکورہ بالا تینوں کتابیں نیشنل آرکائیوز آف انڈیا کے خزانہ دستاویزات سے استفادہ کرنے کے بعد عالم وجود میں آئیں۔ محمد عتیق صدیقی نے آرکائیوز کے رکارڈ سے جتنا فائدہ اٹھایا اتنا اردو کے کسی دوسرے اہل قلم نے نہیں کیا۔ بہت سے اردو والوں کو تو شاید یہ بھی معلوم نہ ہوگا کہ آرکائیوز کہاں واقع ہے! غالباً کشمیر کے سابق وزیر اعلیٰ غلام محمد صادق کے ایماء سے ایک ادارہ ''نہرو انسٹی ٹیوٹ آف ڈیموکریٹک سوشلزم'' NEHRU INSTITUTE OF DEMOCRATIC SOCIALISM بنایا گیا تھا۔ اس کی تاریخ اور جغرافیہ تو مجھے معلوم نہیں مگر اس نے کچھ کتابیں ضرور چھاپی تھیں۔ اس ادارے کے لیے محمد عتیق صدیقی نے پنڈت نہرو کی کتاب ''باپ کے خط بیٹی کے نام'' کا ترجمہ کیا تھا جو چھوٹے سائز کے ۲۰۸ صفحوں پر آفسیٹ سے چھپا تھا اس میں بعض تصویریں بھی شامل تھیں اس کا پیش لفظ غلام محمد صادق نے ہی لکھا تھا۔

اس انسٹی ٹیوٹ سے شائع ہونے والی دوسری کتاب بھی جواہر لال نہرو کی ہی تھی۔ یہ نہرو کی بھی پہلی تصنیف تھی جو ۱۹۲۹ء میں ''سوویت روس'' کے نام سے چھپی تھی۔ غلام محمد صادق نے اس کا از سر نو اردو ترجمہ محمد عتیق صدیقی سے کرایا۔ یہ ۱۴ر نومبر ۱۹۶۹ء کو پنڈت نہرو کے یوم ولادت پر شائع کی گئی۔ یہ بھی ۲۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔

عتیق صاحب کے کاموں میں ایک مجموعہ مقالات ''آئینہ ابوالکلام آزاد'' کی اشاعت بھی

Marfat.com

شامل ہے۔ ۲۰۸ صفحات پر مشتمل اس کتاب کا خوبصورت ایڈیشن انجمن ترقی اردو (ہند) شاخ دہلی کے اہتمام سے نومبر ۱۹۷۶ء میں چھپا تھا اس کا پیش لفظ اس وقت صدر جمہوریہ ہند فخر الدین علی احمد مرحوم نے لکھا تھا اور انہوں نے ہی ۱۹ رجنوری ۱۹۷۷ء کو راشٹر پتی بھون میں اس کتاب کی رسم اجراء انجام دی تھی اس کتاب میں ڈاکٹر سید عبداللہ، مولانا عبدالماجد دریا آبادی، رشید احمد صدیقی اور یاض الرحمٰن خاں شیروانی جیسے معتبر حضرات نے مضامین کے علاوہ خود مولانا آزاد کی دو تحریریں شامل تھیں۔ ان کے علاوہ نوائے ابوالکلام کے نام سے ان کے بعض اہم خطوط اور لکھنؤ مسلم کانفرنس کا خطبہ صدارت بھی اس کتاب کا حصہ ہے۔

ان کی دوسری تصانیف میں ''شیخ عبداللہ کشمیر اور ہم''۔ مشرقی مغربی مطبوعات، بابا فرید، بنگلہ دیش میں بارہ دن۔ بیگم حسرت موہانی بھی ہیں۔ ایک کتاب گلشن نو بہار کا نام بھی معلوم ہوا، مگر سر دست ان کتابوں تک نہ دسترس ہے نہ وقت میں گنجائش ہے۔

اس مضمون کے بارے میں یہ اظہار کر دینا بھی ضروری ہے کہ اس میں بعض معلومات محمد عتیق صدیقی مرحوم کی اہلیہ اسماء بیگم صاحبہ سے حاصل ہوئی ہیں اور لکھنے کے بعد یہ مضمون انہیں سنا دیا گیا تھا تا کہ کوئی واقعاتی غلطی اس میں نہ رہ جائے۔

محمد عتیق صدیقی مرحوم کی فوج میں ملازمت، پھر اسے تیاگ کر، آزادی و قلندری سے سنجوگ اور مختلف موضوعات پر ڈھیر ساری علمی کتابوں کی تصنیف و تالیف، کج کلہی کے ساتھ قناعت کی زندگی، پر ایک نظر بازگشت ڈالتا ہوں تو میر کا یہ شعر بار بار یاد آتا ہے۔

تب تھے سپاہی، اب ہیں جوگی، آہ جوانی یوں کاٹی
ایسی تھوڑی رات میں ہم نے کیا کیا سوانگ بنائے ہیں

☆☆☆

Marfat.com

شیخ محمد عمر لیس والے

دہلی کے ہندو مسلمان اگرچہ عرصہ دراز سے گھل مل کر رہتے آئے ہیں لیکن پھر بھی اپنے تشخص کے اعتبار سے مختلف برادریوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ مسلمانوں کی مشہور برادریوں میں قریشی ہیں۔ راعی ہیں۔ صدیقی ہیں۔ حکیم ہیں۔ عطار ہیں۔ سلفی ہیں اور پنجابی سوداگر ہیں۔ ان برادریوں کے افراد و خاندان اگرچہ ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں لیکن شادی بیاہ، لین دین، خوشی غمی اور عید بقرعید کی تقریبات میں آپس میں ہی شریک ہوتے ہیں۔ جس طرح ہر برادری کی اپنی اپنی خصوصیات ہیں اسی طرح دہلی کی پنجابی سوداگر برادری بھی اپنی چند خصوصی باتوں کی وجہ سے منفرد ہے۔

پنجابی سوداگر برادری کوئی بہت قدیم برادری نہیں بلکہ ہندوستان میں دورِ شاہ جہانی میں دینِ اسلام قبول کرنے والوں کی ایک مختصر جماعت ہے جس نے تجارت کے معزز پیشے کو عمومی معاش کے بطور اختیار کیا۔ خدمتِ خلق کو اپنا شعار بنایا اور مذہب و اخلاق کی ترویج میں اپنی بہترین صلاحیتیں اور توانائیاں صرف کیں۔ اس برادری کے افراد نے معاشرت اور بود و ماند میں صاف ستھرے طریقے اختیار کئے جس کے باعث یہ جہاں بھی رہے اور جس مقام پر بھی پہنچے الگ سے پہچانے گئے اور عزت و احترام کے مستحق قرار پائے۔

پنجابی سوداگر برادری ایک تجارت پیشہ برادری ہے۔ تاجروں کے بارے میں ایک عمومی تاثر یہ ہے کہ ان کے سر میں مغز اور پہلو میں دل نہیں ہوتا۔ وہ تو بس تین کے تیرہ اور نوے کے سو بنانا جانتے ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ ان میں تخلیقی صلاحیت بالکل نہیں ہوتی۔ ان کے جذبات سرد ہوتے ہیں اور ان کے محسوسات پر گرد جمی ہوتی ہے۔ لیکن پنجابی سوداگر برادری نے

Marfat.com

ان مفروضات کو غلط ثابت کر دیا ہے۔ اس برادری کے افراد نے جس جس میدان میں قدم رکھا ہے وہاں اپنی کارکردگی لا لوہا منوایا ہے۔ اگر چہ فیکٹریاں بھی لگائیں اور تجارتی ایجنسیاں بھی حاصل کیں لیکن ساتھ ہی ساتھ جنگ آزادی کے سپاہی بھی بنے ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ چاہے وہ ۱۸۵۷ء کے بعد کا پرآشوب زمانہ ہو چاہے ۱۹۴۷ء کے فسادات اور اس کے بعد کا دور۔ یہ لوگ ٹوٹ ٹوٹ کر جمے ہیں۔ غربت و افلاس کے سمندر میں ڈوب کر پھر سے ابھرے ہیں۔ انہوں نے خاص طور سے مسلمانوں کی معاشی اور معاشرتی پستی دور کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ اصلاح معاشرہ اور خدمت خلق کے لئے مسلسل اور ان تھک کام کیا ہے۔ تعلیمی حالت بہتر بنانے کے لئے مدارس اور اسکول قائم کئے ہیں اور اس کے افراد نے جہد مسلسل کی مثالیں قائم کی ہیں۔ اس برادری کے ایسے ہی منفرد افراد میں سے ایک فرد کا نام نامی شیخ محمد عمر لیس والے ہے۔

شیخ محمد عمر پنجابی برادری کے ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتے تھے جو کہ صوفی منش اور نیکو کاروں کا خاندان کہلاتا تھا۔ آپ کے والد حاجی رفیع الدینؒ انیسوی صدی کے آخر تک برادری کے روایتی سوداگروں کی طرح صوبہ جات متحدہ موجودہ یوپی کے مختلف شہروں اور قصبات میں ہونے والے میلوں ٹھیلوں میں پارچہ جات اور بیل فیتے کا سامان فروخت کرنے کے لیے لیکر جاتے تھے اور اسی وجہ سے پہلے بیل فیتے والے اور پھر لیس والے مشہور ہوئے۔ ان کی بیوی جو کہ بہت خوبصورت اور نرم گو خاتون تھیں اپنے گھر میں محلوں کی بچیوں اور بچوں کو قرآن شریف اور دینی تعلیم کا درس دیتی تھیں۔ بعد میں جب اللہ تعالیٰ نے تجارت میں برکت فرمائی تو پہلے دہلی کے صدر بازار میں اور پھر چاندنی چوک میں اپنی دکان کی۔ جائیداد خریدی اور خوش حالی کے اس دور میں بھی دیانت، سادگی اور خدمت خلق کو اپنا شعار بنائے رکھا۔

ان کے بارے میں مشہور ہے کہ ایک بار جب دہلی میں قحط سالی کا دور ہوا اور سفید پوش لوگ غربت کے جال میں پھنس گئے تو حاجی رفیع الدینؒ نے ان کی مدد کا ایک نیا طریقہ اپنا لیا۔

اپنے پاس سے مہنگے داموں والے دال چاول آٹا وغیرہ تھوک میں خرید کر لاتے تھے اور اپنی قیمت خرید سے چوتھائی اور اس سے بھی کم قیمت پر ان سفید پوشوں اور محلے کے تمام افراد کو شام کے دھندلکے میں فروخت کرتے تھے تا کہ ان کی عزت نفس مجروح نہ ہو اور وہ اپنے آپ کو فقیروں اور خیرات مانگنے والوں کے زمرے میں نہ شامل کریں۔

Marfat.com

اسی طرح ان کی دیانت داری کے بہت سے واقعات میں سے ایک واقعہ برادری کے بزرگوں سے سینہ بسینہ چلا آتا ہے کہ چاندنی چوک کی دکان پر ایک بیوپاری ان سے مال خریدنے آیا اور دکان پر بیٹھ کر اس نے اپنے پھٹے ہوئے کرتے کو سینے کے لیے حاجی صاحب سے سوئی اور دھاگے کی فرمائش کی۔ انہوں نے دھاگوں کے ایک نئے ڈبے کو کھول کر ایک نئی گٹی نکالی اور اس بیوپاری کو دے دی۔ اس نے پیکٹ میں سے تقریباً ایک گز دھاگا نکال کر حاجی صاحب کو گٹی واپس کر دی۔

حاجی صاحب اس گٹی کو علیحدہ اپنے ڈیسک میں رکھنے لگے تو بیوپاری نے کہا حاجی صاحب اسے واپس اس کے ڈبے میں کیوں نہیں رکھتے۔ میں نے تو صرف ایک گز دھاگا لیا ہے۔ دوسرے خریدار کو کیا پتہ چلے گا۔ حاجی صاحب نے فرمایا کہ بھائی اس کے ریپر پر لکھا ہے پانچ سو گز دھاگا اور اسے معلوم ہو یا نہ ہو مجھے تو معلوم ہے کہ اس میں پانچ سو گز نہیں ہے بلکہ اس سے کم ہے۔ خریدار تو میرے بھروسے پر ہی مجھ سے مال لینے آتا ہے۔ میں جانتے بوجھتے اس کے بھروسے کو ٹھیس نہیں پہنچا سکتا۔

غرض اسی طرح کے بہت سے واقعات برادری اور تجارتی حلقوں میں مشہور ہیں۔ اِسی خانوادہ کے ایک فرد تھے محمد عمر جنہوں نے ایک دِین دار اور دیانت دار تاجر گھرانے میں ۱۹۱۲ء میں آنکھ کھولی۔ اس زمانے میں ان کا خاندان دہلی کے ایک نسبتاً نئے علاقے باڑہ ہندوراؤ میں رہتا تھا۔ اس دور میں دہلی میں چلنے والی ٹرام لائن باڑہ ہندوراؤ پر جا کر ختم ہو جاتی تھی گویا وہ حصہ شہر کے آخری سرے پر تھا۔ وہاں سے چاندنی چوک اور جامع مسجد کی طرف جانے والی سواریوں کے تانگے والے ''شہر چلو شہر چلو'' کی آوازیں لگاتے تھے۔

محمد عمر صاحب کی روایتی تعلیم کا آغاز پہلے مسجد کے مولوی صاحب کے ذریعے قرآن شریف کے دور سے ہوا اور پھر مِشن اسکول موری گیٹ سے ہائی اسکول پاس کر کے ۳۱۔۱۹۳۰ء میں اینگلو عربک کالج، اجمیری گیٹ میں انٹرمیڈیٹ میں داخلہ لیا۔ اس وقت تک آپ کے والد اور والدہ کا انتقال ہو چکا تھا اور آپ اپنے بڑے بھائیوں حاجی محمد دین صاحبؒ اور حاجی فضل الدین صاحبؒ کی سرپرستی میں تھے۔ ان لوگوں کے اسرار پر ۱۹۳۲ء میں تعلیم چھوڑ کر کاروبار میں حصہ لینے لگے۔ اس وقت تک آپ کا خاندان کاروباری ساکھ اور دیانت داری کے لیے بہت مشہور ہو چکا تھا۔ آپ کے چھوٹے بھائی کا شمار اپنی برادری کے دس بڑے صاحب جائیداد لوگوں میں ہوتا تھا۔ ۱۹۳۳ء میں آپ کی شادی پنجابی برادری کے ایک انتہائی رئیس اور

Marfat.com

مشہور و مخیّر خاندان یعنی حاجی جیون بخشؒ کی پوتی اور حاجی محمد ابراہیم صاحبؒ جاپان والوں کی چوتھی صاحبزادی رضیہ بیگم سے ہوگئی۔ اگر چہ اس خاندان سے پہلے سے ہی رشتہ داری ہوتی تھی لیکن آپ کے خسر نے آپ کا انتخاب بطور داماد قدیمی رشتہ داری کی وجہ سے کم بلکہ خود آپ کی ذات وصفات، اخلاق واخلاص، بردباری، انکساری اور جذبۂ خدمت خلق جس کی وجہ سے آپ نوجوانی میں شہرت پا چکے تھے کیا۔

دورانِ تعلیم محمد عمر صاحب کا شمار درمیانہ درجے کے طالب علموں میں ہوتا تھا لیکن اس وقت بھی آپ کو اعلیٰ ادبی کتابیں اور رسائل پڑھنے اور اپنی لائبریری بنانے کا بہت شوق تھا۔ لاہور اور دہلی سے شائع ہونے والے مشہور ادبی رسالے جیسے نیرنگ خیال، ساقی وغیرہ کی جلدیں آج بھی ان کے مجموعے میں محفوظ ہیں۔ عبدالرحمٰن چغتائی کے مرتبہ دیوانِ غالب باتصویر مرقع چغتائی کے اولین ایڈیشن کا نسخہ بھی میں نے ہوش سنبھالنے کے بعد اسی ذخیرے میں دیکھا اور پڑھا۔

ان کے دوستوں کی زبانی ہی سنا ہے اور پھر اس کا نمونہ بھی دیکھا ہے کہ اپنے علاقے باڑہ ہندوراؤ میں اپنے چند دوستوں کے ساتھ مل کر کیفی لائبریری اور نیشنل لائبریری اور ریڈنگ روم کی بنیاد ڈالی جہاں ادبی مجالس اور مشاعرے منعقد ہوتے تھے۔ اس کے ذریعے نہ صرف ادیبوں اور شاعروں کی پذیرائی ہوتی تھی بلکہ بہت سے مالی حیثیت سے کمزور ادب کے خدمت گاروں کی باعزت طریقے سے پرورش بھی ہوتی تھی جس کا دیگر حضرات کو کانوں کان تک پتہ نہ چلتا تھا۔ اور یہ سب محمد عمر صاحب اپنے جیب خرچ اور اپنے ساتھیوں کے فیض سے انجام دیتے تھے۔

شیخ محمد عمر کے رفاہِ عامہ کے کاموں میں شرکت کا سلسلہ بارہ، چودہ سال کی عمر سے ہی شروع ہوگیا تھا۔ یہ اس صدی کی بیسویں دھائی کی بات ہے جب قرول باغ میں جامعہ ملیہ کا دفتر قائم کیا گیا تھا اور ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحبؒ اور ان کے رفقاء ہر ذرائع سے چندہ اور امداد حاصل کرنے کے لئے کوشاں رہتے تھے۔ اسی دور میں یہ نوعمر محمد عمر شہر کی گلی گلی میں گھومتا نظر آتا تھا اور گھر گھر اور دکان دکان سے ایک ایک روپیہ، آدھا آنہ، ایک آنہ، دو آنے اور چار آنے جمع کرتا تھا اور جمعہ کی چھٹی میں یہ تمام جمع شدہ رقم قرول باغ جا کر جمع کرا آتا تھا۔ اس دور میں ان کے تعلقات بہت سے قدیم جامعی حضرات سے ہوگئے جو کہ تاحیات قائم رہے۔

تعلیمی کاموں میں شرکت کا یہ ذوق اس وقت سے ایسا پروان چڑھا کہ تازندگی قائم رہا۔ اگر چہ خود اعلیٰ تعلیم کے مراحل طے نہ کر پائے لیکن اپنی اولاد اور خواہش مند لڑکے اور لڑکیوں کو تعلیم

کے زیور سے آراستہ کرنے کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ مال سے قال سے، ذات سے عمل سے اور حد تو یہ ہے کہ مرتے مرتے وصیت فرما گئے کہ ان کے آبائی مکان کو بطور وقف انجمن وکیل قوم پنجابیان دہلی کی تحویل میں دے دیا جائے اور اس کی آمدنی سے بلا تخصیص تعلیم حاصل کرنے والوں کی امداد کی جائے۔ خیال رہے کہ اس وقت وہ اور ان کا خاندان کرائے کے مکان میں رہتے تھے اور ان کے انتقال کے بعد بھی رہتے رہے مگر وہ مکان ان کی خواہش کے مطابق بعد وفات فوری طور پر وقف علی اللہ کر کے مذکورہ ادارے کی تولیت میں دے دیا گیا۔

اپنی نوجوانی کے دور میں شیخ محمد عمر دہلی میں قائم سینٹ جانس ایمبولینس بریگیڈ (ST.JOHN'S AMBULANCE BRIGADE) کے ممبر بنے جس کے ذمے ہسپتالوں میں جا کر زخمیوں کی تیمارداری کرنا اور شہر سے مالی امداد اور کپڑے وغیرہ جمع کر کے لانا تھا۔

دہلی میں پنجابی سوداگر برادری کی واحد نمائندہ جماعت ''انجمن وکیل قوم پنجابیان'' ہے جو کہ ۱۹۰۶ء میں رجسٹرڈ ہوئی۔ اس کے مقاصد میں صرف قومی اوقاف کو تولیت و تنظیم، قومی قبرستان کا انتظام و انصرام، اسکول و مدارس کا قیام، زکوۃ کی وصولی و تقسیم، تعلیمی وظائف کی تقسیم اور بیوگان کی امداد وغیرہ ہیں۔ غرض خالص تعلیمی، فلاحی اور معاشی بہبود پہنچانے والی تنظیم ہے۔ کسی بھی قسم کے تجارتی لین دین اور سودی مفاد سے اپنے آپ کو علیحدہ رکھتی ہے۔ محمد عمر صاحب ۳۱۔۱۹۳۰ء میں ہی اس کے ممبر بن گئے تھے اور پھر اپنی محنت اور کام کی لگن کے باعث ۱۹۳۹ء میں جوائنٹ سکریٹری اور ۱۹۴۰ء میں پہلی بار آنریری جنرل سکریٹری بنے۔ ۱۹۴۷ء جماعتی مصلحتوں کے پیش نظر پھر جوائنٹ سکریٹری بنے تقریباً ۱۷ سال اس عہدہ پر رہے۔ اس کے بعد وقتاً فوقتاً کئی بار جنرل سکریٹری بنے۔ بعد ازاں اسی انجمن کے نائب صدر اور جنوری ۱۹۸۴ء میں صدر اعلیٰ منتخب ہوئے اور اسی عہدہ پر رہتے ہوئے ۱۳ر دسمبر ۱۹۸۴ء کو انتقال فرمایا۔

اپنی تیرپن، چون سالہ وابستگی کے دور میں انہوں نے اپنی اس جماعت کی تن من دھن سے خدمت کی۔ ان کو جماعت اور اس کے ہر ادارے اور کام سے عشق تھا۔ قطب روڈ پر واقع سنگھاڑے پر پنجابی اسلامیہ ہائر سیکنڈری اسکول کے قیام کے بنیادی ستون بنے۔ ۱۹۴۷ء کے فسادات کے دور میں جب قطب روڈ پر ہی قائم انجمن کا دفتر لٹ گیا تو اپنے ساتھیوں کے ہمراہ جان ہتھیلی پر رکھ کر بچے کھچے فائل اور کاغذات نکال کر لائے اور ایک بار پھر انجمن کی بنیادیں جمانے میں لگ گئے۔ اس دوران ۱۹۴۸ء میں ایک سہ نفری وفد لیکر مولانا ابوالکلام آزادؒ

وزیر تعلیم حکومت ہند کی خدمت میں گئے اور اسکول بلڈنگ کی واگذاری کے لئے اپنے کیس کی وکالت کرنے کے بعد فرمایا کہ ''سب کچھ ٹوٹ پھوٹ گیا ہے اب اس کا جوڑنا ہی ہمارا کام ہے۔''

مثال یہ میری کوشش کی ہے کہ مرغ اسیر
کریں قفس میں فراہم خس آشیاں کے لئے

حکومت وقت کی مہربانی سے اسکول بلڈنگ آج تک واگذار نہ ہوسکی۔ نا ہی اس کا معاوضہ ملا۔ اگر چہ ان کے بعد بھی انجمن کی کوششیں جاری ہیں۔

اسی انجمن کے پلیٹ فارم سے انہوں نے اپنی برادری کی سرشماری کا کام ۱۹۵۴ء میں شروع کرایا۔ نیت یہ تھی کہ ایک طرف تو برادری کے بقایا افراد کی تعداد معلوم ہو اور دوسری طرف غریبوں اور بیوگان کی امداد کے لیے بنیادی اعداد وشمار وکوائف معلوم ہوں۔ تعلیم حاصل کرنے والے بچوں اور بچیوں کی تعداد کا علم ہوتا کہ ان کی ضروریات کا بندوبست کرنے کے لیے' تگ ودو کی جا سکے۔ الحمد اللہ مردم شماری بھی ہوئی اور اس کے مقاصد بھی حاصل ہوئے۔ آج بھی دس دس سال کے وقفہ سے یہ کام انجمن کے پلیٹ فارم سے ہو رہا ہے۔ آج تک کسی اور برادری نے اس طرف توجہ نہ دی۔ اگر ایسا ہو جائے تو برادریوں کی مابین قربت اور رشتے ناطے کرنے کا اہم ذریعہ بن سکتا ہے۔

شیخ محمد عمر صاحب کے مزاج کی قناعت پسندی اور مستغنی ہونے کی ایک مثال ہے کہ جب ۱۹۴۷ء کے فسادات میں جان بچانے کے لیے گھر سے نکلے تو اپنے پر آسائش اور بھرے پُرے مکان میں ریڈیو کی میز پر یہ رقعہ لکھ کر چھوڑ گئے۔

''اے آنے والو تم کو یہاں آنا مبارک ہو۔ یہاں کی ہر شے تمہارے استعمال کے لیے ہے۔ ہم کو بہت خوشی ہوگی اگر یہ اشیاء تمہارے کام آسکیں اور تم کو آرام وآسودگی پہنچا سکیں۔ خدا تعالیٰ تمہاری مصیبتوں اور پریشانیوں کو دور کرے۔''

اور پھر جب بہت سے خاندان دہلی سے ہجرت کر کے پاکستان گئے تو یہ بھی اپنے بال بچوں کے ساتھ وہاں گئے لیکن جب وہاں دیکھا کہ مہاجرین جھوٹے اور مبالغہ آمیز کلیم (CLAIM) داخل کر کے بیش از بیش کوٹھیاں، دکانیں اور گودام الاٹ کرانے میں مصروف ہیں تو بہت دل گرفتہ ہوئے اور واپس آ گئے۔ اس وقت کے حالات کو یاد کر کے فرماتے تھے کہ'' جب

Marfat.com

شدّ اداور نمرود کی دولتِ بے اندازہ ان کے کام نہ آسکیں تو ہم کس کھیت کی مولی ہیں۔ خدا کا شکر ہے۔ اس نے کیا کچھ نہیں دیا۔ ایک دن بھی بھوکا نہیں سلایا۔ بندہ کو اور کیا چاہیے۔"

مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھے رہیں۔ لاکھوں کی مالیت کی لٹی ہوئی اور غیروں کے قبضے میں گئی ہوئی دکان و جائیداد واپس لینے کے لیے تگ و دو شروع کی۔ جن لوگوں نے کسٹوڈین کے محکمہ کے طریق کار اور داؤ پیچ کا سامنا کیا ہے وہ بخوبی واقف ہیں کہ مفروضہ الزامات سے بچنے کے لیے کیا کیا ثبوت مہیا کرنے پڑتے تھے۔ اس پرآشوب دور میں جیب سے تنگ محمد عمر سر پہیہ اور پیر گاڑی بنے ہوئے گھر سے کسٹوڈین کے دفاتر، کچہری عدالت اور وکیلوں کے چکر میں گھومتے پھرتے تھے۔ اپنی جائداد کے لیے نہیں بلکہ اکثر و بیشتر غیروں کے لیے۔ روٹی روزی اور کاروبار کی فکر چھوڑ اسی فکر میں سرگرداں رہتے تھے کہ کسی طرح دہلی کے مسلمانوں کی ابتری ختم ہو۔ کسی طرح جو لاکھ والے خاک ہو گئے ہیں ان کو پھر سے جینے کا حوصلہ اور رہنے کا ٹھکانا ملے۔ جو آتا اس یقین کے ساتھ آتا کہ ان کے پاس سے مشورہ، اعانت، امداد، بھروسہ، حوصلہ غرض کچھ تو ملے گا اور واقعہ یہ ہے کہ کوئی مایوس نہ گیا۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی دور و نزدیک کے اپنے اور پرائے ان کو یاد کر کے آتے ہیں اور ان کی کوئی نہ کوئی اعانت کی بات سنا کر یادیں دہرا جاتے ہیں۔

محمد عمر صاحب خود صاحب جائیداد تھے اور بہت سے بیرونِ دہلی کے رہنے والے رشتے داروں اور عزیزوں کی جائیداد کا انتظام و انصرام کرتے تھے۔ ان کی دکان پر سامانِ کاروبار تو کم فائلوں کا ایک باترتیب انبار موجود تھا۔

نیا آنے والا اچنبھے میں پڑ جاتا تھا کہ یہاں کاروبار ہوتا ہے یا یہ کوئی سرکاری دفتر ہے اور اگر تھوڑی دیر خاموش بیٹھ کر قیام کرتا تو دیکھتا کہ یہاں آنے والوں میں شاعر، ادیب، استاد، نادار خواتین و مرد و بے روزگار نوجوان اور حاجت مند ہندو مسلمان آرہے ہیں اور شیخ صاحب پتہ نہیں کہاں سے اور کیسے ان کے حاجت روا بنے ہوئے ہیں۔ یہ تو خدا کا کرم ہے کہ وہ کس سے کیا کام لے۔ اس نے دلّی کے اس کونے میں شیخ صاحب کو ہی ان ضرورت مندوں کی امداد کا ذریعہ بنایا اور انہوں نے اپنا یہ فرض بغیر کسی ستائش، پبلسٹی، خودنمائی اور خود پرستی کے نبھایا۔

ان کی دیانت داری اور غریب پروری کا ایک عجیب و غریب نمونہ ان کے انتقال کے بعد چند کرایہ داروں کے فائل نظر سے گزرے تو ملا۔ دہلی میں ایک وہ دور بھی گذرا ہے جب کرایہ

دار مالک جائیداد کی عزت بھی کرتے تھے کبھی دل سے کبھی مجبوری سے۔ مگر جو دل سے محبت کرتے تھے اور اچھے تعلقات کے خواہاں رہتے تھے وہ مالک جائیداد کو کرایہ کے علاوہ تیج تہوار کے موقع پر پھل مٹھائی یا اپنی کسی کاروباری اشیا کا نذرانہ بھی دیتے تھے۔ شیخ محمد عمر صاحب کے بھی چند کرایہ دار ایسے تھے اور گاہے گاہے موسم کے پھل یا قصبے سے آتے ہوئے گھی کا ٹین یا اناج کی بوری تحفے میں لاتے تھے۔ اب یہ تو کسی کا تحفہ تھا۔ شیخ صاحب انکار تو نہ کر پاتے۔ خوش اسلوبی سے قبول فرماتے مگر اس کے جانے کے بعد اس کرایہ دار کے فائل میں اس شے کے بارے میں لکھتے اس کی قیمت کا تخمینہ بھی نوٹ کرتے اور پھر اتنی رقم اس کے کرائے میں مجرا کر دیتے۔ جب کبھی حساب ہوتا تو اسے بقایا رقم ہی بتاتے۔ آج کے اس دور میں جب کہ ہر طرف کرایہ دار اور مالک جائیداد کے مابین تناتنی رہتی ہے اس قسم کی خاموش اور ایک طرفہ رعایت کا کا تصور بھی ممکن نہیں۔

''انجمن وکیل قوم پنجابیان'' کے علاوہ شیخ صاحب کی خدمت خلق کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ پنجابی اسکول، فتح پوری اسکول، امینیہ گرلز اسکول، مدرستہ البنات، زہرہ گرلز اسکول، مدرسہ عالیہ فتح پوری، مدرسہ امینیہ کشمیری گیٹ، مدرسہ عبدالرّب موری گیٹ وغیرہ کے اہتمام میں بطور عہدیدار یا ممبر منتظمہ شریک رہے اور زبانی جمع خرچ نہیں بلکہ ہر ادارے کے ہر جلسے میں شریک ہوتے اور اس کی ضروریات پوری کرنے میں بھرپور کوشش کرتے۔ وقف نواب قطب الدینؒ بلبلی خانہ، وقف عبدالقیوم کشمیری گیٹ، مسجد نئی دہلی ریلوے اسٹیشن، عیدگاہ آر. کے. پورم، چھوٹی مسجد باڑہ ہندوراؤ وغیرہ کی کمیٹیوں کے صدر یا ممبر ہر وقت رہے اور ہمہ وقت ان کی بہتری کے لیے کام کرتے رہے۔ بچوں کا گھر دریا گنج، اور دہلی وقف بورڈ کی مختلف سب کمیٹیوں کے ممبر رہے اور ان اداروں کو جب کسی اہم کام یا مسئلہ کا سامنا ہوتا تو ان کی نگاہیں شیخ صاحب کی صائب رائے اور عملی کوشش کے لیے ان کی طرف اٹھتیں اور ہمیشہ بامراد واپس ہوتیں۔

محمد عمر صاحب کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے کا بہت شوق تھا اس آرزو میں وہاں تک گئے بھی لیکن پھر گھریلو ذمہ داریوں نے مجبور کیا اور واپس آ گئے۔ مگر اپنی خواہش کی تکمیل اپنے دونوں بیٹوں انیس عمر اور راقم الحروف ریاض عمر کو وہاں بھیج کر کی۔ اس سلسلے میں ان کی دور اندیشی کی اہمیت اب سمجھ میں آتی ہے۔

آج سے پینتالیس سال قبل انہوں نے اندازہ لگایا تھا کہ کامرس کے مضمون کی تعلیم کا چلن

Marfat.com

بہت بڑھے گا۔ نیز گلف ممالک میں اس مضمون کے ماہرین کی بہت ضرورت ہوگی۔ سوداگر بچے تھے اور ساتھ ہی قوم کے نباض بھی۔ اس خادم کو اصرار کر کے پہلے بی۔ کام پھر ایم۔ کام اور ایل۔ ایل۔ بی تک تعلیم حاصل کرنے کے مواقع دیئے۔ بعد میں میں نے یونیورسٹی آف ہوائی ہونولولو امریکہ سے ایم بی اے کی ڈگری بھی لی چاہے اس مضمون سے گہری دلچسپی نہ ہو۔ مگر اس سے ایک فائدہ ضرور ہوا۔ اُن کی تقلید میں پنجابی برادری کے جو خاندان اسکولی تعلیم کے بعد اپنی اولاد کا تعلیمی سلسلہ منقطع کر دیتے تھے انہوں نے کامرس کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے اپنے بچوں کے واسطے کالج اور یونیورسٹی کی تعلیم کے دروازے کھول دیئے۔

آج ملک کی اکثر دانش گاہوں اور معاشی حالات پر سرسری سی نظر بھی ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ ہر طرف کامرس، بزنس، مارکیٹنگ، فائنانس اور اس سے متعلق مضامین کے جاننے والوں کی طلب ہے اور اس کے ماہرین ہی ملک کی معیشت کو آگے بڑھانے اور خود اپنی ترقی میں سب سے آگے ہیں۔

شیخ محمد عمر صاحب کی دلچسپی کا ایک خانہ معاشرہ میں اصلاح رسوم کا بھی تھا۔ نوجوانی سے اپنی برادری کی اس تحریک میں عملی طور سے شریک تھے اور تمام قبیح اور اصراف کی رسموں سے نہ صرف خود پرہیز کرتے تھے بلکہ دوسروں کو بھی ان رسومات کو ترک کرنے کی تبلیغ کرتے تھے۔

محمد عمر صاحب کے تعلقات اپنے دور کے بزرگوار اور عالموں سے بہت قربت کے تھے حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مرحوم و مغفور ۱۹۴۷ء کے فسادات سے قبل برابر ان کی دکان پر تشریف لاتے تھے اس کے بعد جب بھی دہلی آنا ہوتا تو خیر خیریت ضرور دریافت فرماتے۔ حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب مرحوم اور حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی صاحب مرحوم سے گہرے مراسم تھے اور وہ لوگ جملہ مسلم مسائل کے معاملات میں ان کی رائے کو معتبر مانتے۔ ان کی دیانت داری، معاملہ فہمی اور حساب فہمی کی شہرت کو دیکھتے ہوئے جب مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی صاحب مرحوم مسلم مجلس مشاورت کے صدر بنے تو انہوں نے شیخ صاحب کو خازن منتخب کیا اور وہ تادم آخر اس عہدہ پر قائم رہے۔ اسی طرح جب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے اقلیتی کردار کو ختم کرنے والے بل کی مخالفت کے لئے اولڈ بوائز نے تحریک شروع کی اور حضرت مولانا محمد یوسف صدیقی صاحب مرحوم (آف جماعت اسلامی) کی سربراہی میں ایک کانفرنس کا انعقاد ہوا تو اس وقت بھی شیخ صاحب کو ہی خازن چنا گیا۔

Marfat.com

انہوں نے ایک طرف تو پیسہ پیسہ کا حساب درست رکھا اور دوسری طرف ان کو کبھی مالیات کی کمی محسوس نہ ہونے دی۔

ان کی دکان پر شام کو مستقل آنے والوں میں دلّی کالج کے استاد سید حسن صاحب مرحوم تھے۔ گاہے گاہے مہدی صاحب بھی تشریف لاتے تھے۔ خواجہ احمد فاروقی صاحب مرحوم جب جب یونیورسٹی سے شہر کی طرف آتے تو شیخ صاحب کے پاس حالِ دل کہنے اور سننے ضرور آتے۔ شہر کے مشہور وکیل نواب سلطان یار خان صاحب مرحوم بھی اکثر و بیشتر آتے تھے۔ ان کی اور کسی بھی دیگر آنے والے کی خاطر مدارت کے لئے اپنی دکان کے سامنے کوچہ گھاسی رام سے گرم گرم جلیبیاں اور فتح پوری کے چائنا رام حلوائی کے یہاں سے سموسے یا سردیوں میں کاجو منگواتے تھے۔ چائے کا دور بھی چلتا تھا ساتھ ساتھ حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ ہوتا رہتا تھا۔

مرزا محمود بیگ صاحب مرحوم اور منظور الحسن موسوی صاحب مرحوم اگرچہ ان کے استاد نہیں تھے لیکن اس وقت جب محمد عمر صاحب نے اینگلو عربک کالج (سابق دہلی کالج اور حال ذاکر حسین کالج) میں داخلہ لیا تو یہ دونوں اساتذہ کی حیثیت سے کالج میں آ چکے تھے اور اسی نسبت سے ان کو اپنے اساتذہ میں شمار کرتے تھے اور بہت احترام سے ان کا ذکر کرتے۔

بیگ صاحب مرحوم سے ایک بار اولڈ بوائز کی ایک میٹنگ میں اختلاف رائے ہو گیا۔ اینگلو عربک اسکول اور اس کی بلڈنگ کی حالت ناگفتہ بہ تھی اور روز بروز بد سے بدتر ہوتی جا رہی تھی۔ بیگ صاحب دلی کالج کے پرنسپل اور اینگلو عربک اسکول چلانے والی دہلی ایجوکیشنل سوسائٹی کے سکریٹری تھے۔ کھلے اجلاس میں شیخ صاحب نے کہا کہ "حضور والا آپ یعنی دلّی کالج اینگلو عربک اسکول کی جگہ پر ناجائز قابض ہے یہ جگہ واقف نے مدرسے کے لیے وقف کی تھی۔ یا تو دلّی کالج اس جگہ کو اسکول کو واپس کرے یا مناسب کرایہ دے تاکہ اسکول کی حالت بہتر بنائی جا سکے ورنہ میں آپ کو عدالت تک لے جاؤں گا اور اسکول کو اس کا جائز حق دلواؤں گا۔" اب بیگ صاحب خاموش۔ بات خدا لگتی اور انصاف کی تھی۔ کیا کرتے۔ لیکن اب کہنے اور سننے والے دونوں ہی آگے گئے۔ لیکن شیخ صاحب نے نجی محفل ہو یا جلسہ عام ہمیشہ بڑے احترام سے انہیں یاد کیا اور تعلیم کے میدان میں ان کی خدمات کو سراہا۔

اس کے علاوہ جناب مسلم احمد نظامی صاحب پسر زادہ ڈپٹی نذیر احمد صاحب مرحوم خود دلی والے اور دلّی کی تہذیب کے عاشق گاہے گاہے شیخ صاحب کے پاس تشریف لاتے رہتے۔

Marfat.com

بقول ان کے ۱۹۴۷ء کے بعد کی ویران و برباد دلّی میں شیخ محمد عمر صاحب کے پاس بیٹھ کر یہ احساس ہوتا تھا کہ ہم دلّی میں دلّی والے کے پاس بیٹھے ہیں۔ نرم گفتاری میں وہ شیخ صاحب کا شمار حضرت مفتی مظہر اللہ صاحبؒ اور اپنے بھائی شاہد احمد دہلوی مدیر ساقی سے کرتے تھے ایک جگہ ان کے بارے میں تحریر کرتے ہیں کہ" اوقاف کی تباہی کا المیہ ان کو کھائے جاتا تھا مگر کیونکہ سیاسی آدمی نہ تھے خوشامد پسند نہ تھے خوددار تھے اس لئے حق کو برابر ظاہر کرتے رہتے۔ اور جب بھی موقع ملا بڑے خلوص سے۔ ناممکن کو ممکن کر دینے کا طریقہ شیخ صاحب کو خوب آتا تھا۔ صاحب اقتدار اور سیاسی گروہ ان کی وجاہت سے آنکھ مچولی کھیلتا رہتا تھا مگر ان کے ماتھے پر شکن نہیں آتی تھی۔ ہر خیال کے لوگ ان کے پاس آتے تھے۔ دل کھول کر شیخ صاحب سب کی خاطر مدارت عاجزانہ طریقے پر بڑی انکساری سے کرتے تھے۔ ہر طرح رچا بچا انسان، شرافت کی قدروں کا شناسا دوسروں کے غم میں پگھلتا رہتا تھا۔ وہ ہر محفل میں اپنا مخصوص مقام پیدا کر لیتے تھے۔ ان کی ہمہ دانی پر تعجب ہوتا تھا۔ ہر معاملے پر ان کی بچی تلی رائے حرفِ آخر ہو جاتی تھی۔"

چہرے مہرے سے شیخ صاحب درمیانہ قد، سرخ و سفید رنگ، چھریرا اور متناسب بدن اور انتہائی نازک اندام نقوش کے مالک تھے۔ ۱۹۶۵ء میں سفر حج کے دوران چھوٹی سی ڈاڑھی بھی رکھ لی تھی جس نے ان کی وجاہت میں مزید اضافہ کیا۔ آپ گرمیوں میں ململ کا کرتا، کھلی مہری کا پاجامہ اور واسکٹ پہنتے۔ سر پر کبھی دوپلی ٹوپی اور کبھی گاندھی کیپ۔ سردیوں میں گرم کرتہ، گرم پاجامہ یا پتلون اور گرم شیروانی زیب تن رہتی۔ نوجوانی میں ٹرکش کیپ اوڑھتے تھے مگر ۱۹۴۷ء کے بعد ہمیشہ گرم گاندھی کیپ ہی سر کی زینت رہی۔ نرمی و شفقت اور چہرے پر نفاست و شرافت پھوٹی پڑتی تھی۔ ان کے چہرے پر نظر ڈالتے ہی یہ مصرعہ یاد آتا تھا:

کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جاست

تمام افرادِ خانہ اور رشتہ داروں کے ساتھ انتہائی محبت سے پیش آتے تھے۔ اپنی اولاد سے بھی بے انتہا محبت کرتے تھے مگر روایتی باپ کی طرح اس کا اظہار کم کرتے تھے۔ اولاد کو کبھی کسی چیز کی کمی نہ محسوس ہونے دی لیکن ڈسپلن کا بہت خیال رکھا۔ کھلا یا سونے کا نوالہ مگر دیکھا شیر کی نگاہ سے شام کو گھر میں ان کی آمد پر ہم بھائی بہن ان کی نظروں کے سامنے آنے سے کتراتے تھے دسترخوان پر خاموشی سے بیٹھتے۔ ان کے رعب سے دم خطا ہوتا تھا۔ وہ رعب آج انتقال کے بعد بھی دلوں پر غالب ہے۔

Marfat.com

اس کے مقابلے میں ۱۹۴۷ء سے پہلے جب محلہ کٹڑہ گھی، پھاٹک حبش خاں میں رہائش تھی تو محلے کے بچوں کو کھلی چھوٹ تھی کہ وہ ان کے گھر آتے اور محمد عمر صاحب خود ان کے ساتھ مل کر مختلف کھیل ترتیب دیتے۔ جب دسمبر ۱۹۵۵ء میں حویلی حسام الدین حیدر۔ بلیماران میں رہائش منتقل کی تو یہاں بھی نوجوانوں کو تنظیم بنانے کی ترغیب دیتے تھے۔ اپنے پوتے پوتیوں اور نواسے نواسیوں سے بہت محبت کرتے تھے اور ان کے ہم عمر بچوں اور بچیوں کو بلا کر کھیل کود اور ڈرامے کرنے اور تقریر کے لیے اکساتے تھے۔ چھوٹی چھوٹی کامیابیوں پر اپنی جیب سے انعام بھی دیتے تھے۔ یہی وطیرہ وہ اس وقت بھی اپناتے جب کسی اسکول یا دینی مدرسے کے سالانہ فنکشن میں جاتے اور وہاں اچھی تقریر کرنے والے، اچھی قرأت کرنے والے اور اچھی نظمیں پڑھنے والے طلبا و طالبات کو اسی وقت رقمی انعامات دیتے۔ گھر سے لفافے تیار کر کے لے جاتے اور ہر موقع پر طلباء کی حوصلہ افزائی کرتے۔

ہماری والدہ محترمہ (اللہ انہیں تا دیر سلامت رکھے۔) بڑے رئیس گھرانے کی بیٹی ہیں۔ مگر بے انتہا خدمت گذار۔ محمد عمر صاحب بے انتہا نرم مگر مضبوط لب و لہجے سے ان سے گفتگو فرماتے اور ان کی ہر فرمائش کو حتی الامکان پورا کرتے۔ خطاب کے طور پر ان کو خانم کہتے تھے اور ان کے ہر چھوٹے بڑے رشتے دار اور عزیز کی انتہائی تکریم کرتے تھے۔ ۱۹۴۰ء میں اپنی خوشدامن صاحبہ کے انتقال کے بعد اپنی سب سے چھوٹی سالی بعمر چھ سال کو اپنے گھر لے آئے۔ اگرچہ ان کی بیوی کے شادی شدہ بڑے بھائی اور بڑی بہنیں موجود تھیں لیکن انہوں نے بھی اس چھوٹی سی بچی کو خود پالنے کی بجائے چھوٹی بہن کی نگرانی میں دینا منظور کیا۔ شیخ صاحب نے اسے اپنی سب سے بڑی بیٹی کی طرح سمجھا اور اپنی اولاد سے بڑھ کر چاہا۔ اعلیٰ سے اعلیٰ لباس اور خوراک اور تعلیم کا اہتمام کیا اور دمِ آخر تک اپنی سگی بیٹی کا درجہ دیتے رہے۔ اگرچہ اسے بھی اپنے باپ کے ورثہ میں سے لاکھوں کی جائیداد اور نقد ملا تھا لیکن وہ سب اس کے بڑے بھائی کی تحویل میں تھا لیکن شیخ صاحب نے کبھی ایک پیسہ کا مطالبہ نہ کیا بلکہ اپنی بیٹی کی طرح زیور کپڑا اور دوسری آسائشیں مہیا کیں۔ مالی پریشانی کے اوقات میں بھی ایک وقت اپنی اولاد کی ضروریات کو پسِ پشت کر دیا مگر اس یتیم و یسیر بچی کو ماں باپ کی کمی کا احساس نہ ہونے دیا۔ یہ ان کے حسن سلوک کا ایک اعلیٰ نمونہ تھا۔

ایک بار ایک رسالے کے مدیر اعلیٰ نے ان کے انٹرویو کے لیے درخواست کی تو بالکل ٹال

Marfat.com

گئے اور فرمایا کہ ''میں ایک معمولی سا آدمی ہوں۔ انٹرویو وغیرہ تو اہم شخصیات کے لیے جاتے ہیں۔'' پھر بھی جب ان سے سوال کیا گیا کہ آپ کی مقبولیت کا کیا سبب ہے۔ تو فرمایا اللہ کی دین ہے اور بس۔

مگر سب نے دیکھا ہے کہ لوگ ان سے ٹوٹ کر ملتے تھے۔ ایک بار جو ملتا تو پتہ نہیں کیا گھول کر پلاتے ان کا کلمہ پڑھتا ہی چلا جاتا۔ بار بار ملنے کی کوشش کرتا اور یہ ممکن نہ ہوتا تو ان کے عزیزوں رشتے داروں یا اولاد سے جب بھی ملتا تو ان کی باتوں اور ان کی تواضع کو ضرور یاد کرتا۔ ایسے ہوتے ہیں دلّی والے اور دلّی کی تہذیب کے نام لیوا۔

کہیں پڑھا ہے کہ اگر کسی شخص کی موت کے بعد اس کی مقبولیت کا صحیح اندازہ لگانا ہو تو یہ دیکھو کہ اس کے جنازے کے ساتھ کتنے آدمی تھے۔ شیخ صاحب کا انتقال ۱۳ر دسمبر ۱۹۸۴ء میں صبح دس بجے سینٹ اسٹیفنز ہسپتال میں ڈاکٹری معائنہ کے دوران ہوا۔ انا للہ و اِنا اِلیہ راجعون۔ عصر کے وقت جنازہ اٹھایا گیا اور مسجد فتح پوری میں لایا گیا۔ وہاں نماز جنازہ کے لیے ایک بھاری اجتماع موجود تھا۔ اس وقت جہاں ان کی برادری کے لاتعداد افراد شامل تھے وہاں دیگر دلّی والوں کی کمی نہیں تھی۔ ایسے مواقع پر عام طور پر محدود طریقے پر لوگوں کو مطلع کیا جاتا ہے مگر پھر بھی کسی نہ کسی طرح جس کو پتہ چلا وہ سیدھا مسجد فتح پوری پہنچا۔ پھر راستے میں جس کو معلوم ہوا تو اس نے بھی آخری منزل تک پہنچانے میں ساتھ دیا۔ میت کی تدفین قوم پنجابیان کے قبرستان شیدی پورہ میں ہوئی اور اس وقت بھی وہاں سینکڑوں مسلمانوں اور غیر مسلموں کا مجمع تھا۔ بعد تدفین دعاؤں کے لیے بے شمار ہاتھ اٹھے اور لوگ یہ کہتے ہوئے واپس ہوئے کہ:

سبزہ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے
آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

شیخ محمد عمر مرحوم کے انتقال کے بعد ان کے ایک دوست نے اپنے تعزیتی پیغام میں ان کی زندگی کی ایک قلمی تصویر مندرجہ ذیل الفاظ میں کھینچی۔

عمر مرحوم و مغفور کی زندگی پاکیزہ، طبیعت نفیس، صورت و سیرت دونوں اچھی، ظاہر و باطن یک، قوت ارادی قوت فیصلہ اور قوت عمل کا پیکر، سادگی اوڑھنا بچھونا، خدمت کی دھن، برادری کا م خوار، دیندار اور دیانت دار، پہلے تولنا پھر بولنا، باتیں کم عمل زیادہ، ایک عملی انسان، سلیقہ شعاری کا مجسمہ، اپنی ذات میں ایک انجمن، با اصول اور شرافت کا مجسمہ، اعلیٰ صلاحیت کا مالک، با فیض

اور خوش مزاج انسان اخلاق و اخلاص کا امتزاج، باہمت باعزم، اور جذبۂ خدمت کی ایک مضبوط چٹان۔

میں اس مضمون کو اس دعا پر ختم کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں ان اعلیٰ اقدار کی تقلید کرنے کی توفیق دے۔

جو رکے تو کوہِ گراں تھے ہم
جو چلے تو جاں سے گذر گئے
رہ یار ہم نے قدم قدم
تجھے یاد گار بنا دیا

☆☆☆

Marfat.com

کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ

کنور مہندر سنگھ بیدی کا نام سنتے ہی ایک دلکش تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ دراز قد، چوڑا چکلا سینہ، بھرے بھرے گال، کشادہ پیشانی اور ہلالی ابرو ان کی مردانہ شخصیت کے آئینہ دار تھے۔ ان کی روشن آنکھوں کی شربتی پتلیاں اور سرخ ڈورے ان کی ذہانت اور طباعی کا مظہر تھیں۔ جہاں ان کے چہرے سے غزل کی آبرو جھلکتی تھی وہیں ہندوستان کی مشترکہ گنگا جمنی تہذیب کے عناصر کی کارفرمائی بھی نظر آتی تھی۔

بیدی صاحب شاعر بھی تھے اور شکاری بھی، سرکاری افسر بھی تھے اور بڑے زمیندار بھی، گھوڑسوار بھی تھے اور بازوں اور شکروں کے رسیا بھی۔ غریبوں کے ہمدرد بھی تھے اور امیروں کے دوست بھی۔ شاعر ہونے کے علاوہ بیدی صاحب ادب نواز بھی تھے اور ادیب نواز بھی، ادیبوں اور شاعروں میں سے بعض نے انہیں فریب بھی دیا لیکن وہ ہمیشہ خندہ پیشانی سے برداشت کرتے رہے۔ ستم ظریفی یہ کہ مصیبت کے وقت یہ لوگ پھر ان کے پاس پہنچتے بیدی صاحب سب کچھ جانتے ہوئے بھی ان کے ساتھ سفارش کے لئے چل پڑتے۔ کنور مہندر صاحب کی بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ ہر ایک کو اپنا سمجھتے تھے اپنا گردانتے تھے وہ ہر ایک کی خوشی اور غم میں شریک، ہر ایک کے مسائل کو حل کرنے کے لئے کوشاں، ہر ایک کی ترقی اور بہتری کے خواہاں رہتے تھے۔ بقول مالک رام" اگر یہ صحیح ہے کہ خداوند تعالیٰ نے ہر ایک کو اس کی صلاحیت کے مطابق کام تفویض کیا ہے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ کنور صاحب کو دنیا میں خوشیاں بکھیرنے اور محبت تقسیم کرنے کا کام تفویض کیا تھا۔" امیر غ ، مخلص و مکار ہر طرح کے لوگ ان کی بزم میں آتے اور گوہر مقصود سے اپنا دامن بھر کر واپس جاتے تھے۔ جو ان سے ملتا اس کا گرویدہ ہو جاتا اور ساری عمر کے لئے ان

Marfat.com

کو گلے لگا کر ان کے گلے لگ جاتا۔

بیدی صاحب نے ۹ مارچ ۱۹۰۹ء کو منٹگمری میں آنکھ کھولی، کنور صاحب کا سلسلہ حضرت بابا گرونانک دیو سے ملتا ہے یہ ان کی سولہویں پشت میں تھے۔ ان کے والد بابا ہردت سنگھ بیدی سماجی رتبے اور معاشی حیثیت کے اعتبار سے بہت بلند مرتبہ رکھتے تھے، ہزاروں ایکٹر کے رقبہ میں پھیلی ہوئی اراضی اور بے پناہ جائداد کے مالک تھے۔ بیدی صاحب کی ابتدائی تعلیم گاؤں کے اسکول میں ہوئی، پھر چیفس کالج لاہور میں داخلہ لیا، جہاں صرف نوابوں یا راجاؤں مہاراجاؤں کے بچے ہی داخلہ لے سکتے تھے۔ ۱۹۲۵ء میں وہاں سے سینئر کیمبرج کا ڈپلوما لیا اور ۱۹۲۹ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے بی۔اے کی سند لی۔ والد محترم کی خواہش کے پیش نظر ۱۹۳۴ء میں ملازمت اختیار کی اور پہلی تعیناتی بطور (E.A.C) ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر لائل پور میں ہوئی۔ ۲۳ سالہ سرکاری ملازمت کے دوران بیدی صاحب بطور مجسٹریٹ جالندھر، ملتان، افسر مال کانگڑہ، جہلم وروہتک، انچارج نیشنل وار فرنٹ اور سٹی مجسٹریٹ دلّی کے علاوہ ڈپٹی کمشنر گوڑگاؤں، سنگرورو کرنال رہے۔ اور ڈائریکٹر پنچائت پنجاب کے عہدہ سے ۱۹۶۷ء میں سروس سے ریٹائر ہوئے۔ اس کے بعد دلّی میں رہائش اختیار کی اور ۱۷ر جولائی ۱۹۹۲ء کو ۸۳ سال کی عمر میں دارِ فانی سے کوچ کیا۔

آغاز ملازمت میں پہلی دفعہ عدل وانصاف کی ترازو ان کے ہاتھ میں دی گئی تو کنور صاحب اس وقت کے تاثرات اپنی خودنوشت ''یادوں کے جشن'' میں لکھتے ہیں:

> ''چارج لے کر اس کمرے میں گیا، جو میری عدالت کے لئے مقرر کیا گیا تھا۔ وہاں میرا عملہ یعنی پیش کار اور چپڑاسی میرے انتظار میں کھڑے تھے۔ میں نے انہیں اپنا تعارف کرایا اور ڈائس پر چڑھا، کرسی پر بیٹھنے سے پہلے میں ذرا جذباتی سا ہوگیا۔ عدالت کی کرسی ایک مقدس چیز ہوتی ہے اس پر بیٹھنے کے بعد اکثر دماغ بگڑ جاتا ہے، انسانیت کنارہ کر جاتی ہے اور انسان اپنے آپ کو انسان سے بالاتر سمجھنے لگتا ہے۔ میرے پیش کار ایک مولوی نما بزرگ تھے میں نے ان سے گزارش کی آپ میرے لئے پہلے دعا کیجئے کہ اس کرسی پر بیٹھ کر حق و انصاف کا نام اونچا کرسکوں چنانچہ انھوں نے دعا مانگی اور اس کے بعد میں کرسی پر بیٹھا''۔

Marfat.com

کچھ لوگ شاعر بڑے ہوتے ہیں لیکن ضروری نہیں کہ بحیثیت انسان بھی بڑے ہوں مگر بیدی صاحب عظیم انسان ہونے کے علاوہ بڑے شاعر بھی تھے۔ دوست نوازی اور دل نوازی کے باعث وہ اپنی ذات میں ایک انجمن کا درجہ رکھتے تھے ایسی انجمن جہاں ادب، ثقافت، تہذیب، شرافت اور انسانیت ایک مسند پر جلوہ گر ہوں۔ ان کے لہجے کا خلوص اور گفتگو کا انداز دل کے سوئے ہوئے نغموں کو جگا دیتا خوش پوش، خوش بیان اور خوش گفتار کنور صاحب جس محفل میں ہوتے اپنی خصوصیات کے باعث سب کی توجہ کا مرکز بنے رہتے۔ ان کی شخصیت میں ایسا سحر تھا جو مخاطب کو پہلی ملاقات میں گرویدہ بنالیتا تھا۔ انسان دوستی۔ سیکولر روایات اور خاکساری و انکساری انہیں اپنے خاندان سے ورثے میں ملی تھی، ان کی انہیں خصوصیات سے متاثر ہوکر جوش ملیح آبادی نے کہا تھا:

اگر نظارہ مجسم کی تمنا ہے
مہندر سنگھ کو اے ناظرین دیدور دیکھو

اردو کے ایک اور نامور شاعر دلاور فگار لکھتے ہیں:

شرافت میں مروت کو ملایا
سیاست کو پھر اس سے نکالا
محبت سے پھر اس کو ضرب دے دی
جو اب آیا مہندر سنگھ بیدی

بیدی صاحب کی دوست نوازی کے مداح ان کے حریف بھی تھے ایک دفعہ حفیظ جالندھری نے نہایت جذباتی انداز میں دیوان بریندر ناتھ ظفر پیامی سے کہا" بیٹا بریندر جوشؔ کی سب سے بڑی خوش نصیبی یہ ہے کہ اُسے بیدی صاحب جیسا دوست ملا ہے"۔

بیدی صاحب دیگر مشاغل کے علاوہ شکار کے بھی رسیا تھے۔ وہ نہ صرف نئے شکاریوں سے شکار کی خوبیاں بیان کرتے بلکہ شکار کے داؤ پیچ بھی سکھاتے۔ اپنی خودنوشت میں لکھتے ہیں:

"شکار کا شوق ہمارے خاندان میں پشتوں سے ہے۔ شکار کرنا ہمارے خون میں رچا ہوا ہے، یہاں تک کہ ہمارے خاندان کے بچے ہوش سنبھالتے ہی بندوق کی مانگ کرتے ہیں۔"

مرحوم دیوان بریندر ناتھ ظفر پیامی" ہمارے کنور صاحب" میں لکھتے ہیں:

Marfat.com

''گو آخری دنوں میں بیدی صاحب شیر وغزال اور کبوتر کا شکار نہیں کرتے تھے بلکہ
ان دنوں وہ قلب ونظر سے کچھ اس طرح شکار کر رہے تھے:
کہ شکار دعا کرتا تھا شکار ہونے کی''

کنور صاحب نہ صرف بزم ادب کی محفلوں کو اپنے برجستہ فقرے سے زعفران زار بنا دیتے بلکہ روزمرہ معمول میں بھی ان کے مزاج میں مزاح شامل تھا۔ اس لیے موقع ملنے پر وہ مزاح سے نہیں چوکتے تھے۔ کشمیری لال ذاکر'' ہمارے کنور صاحب میں رقمطراز ہیں:

''یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں گوڑگاؤں میں ڈسٹرکٹ ایجوکیشن آفیسر تھا فرید آباد کے اسکول میں ایک ڈرائنگ ماسٹر تھے اس اسکول میں ان کی بیوی بھی پنجابی پڑھاتی تھی۔ ان دونوں نے اسکول کے پرنسپل کو بہت پریشان کر رکھا تھا۔ میں نے دو ایک بار ڈرائنگ ماسٹر کو سمجھایا لیکن اس نے اپنا رویہ نہیں بدلا، چنانچہ میں نے خاوند کو ایک دور کے اسکول میں اور اس کی بیوی کو اتنے ہی فاصلہ پر کسی دوسرے اسکول میں ٹرانسفر کر دیا۔ میری اطلاع یہ تھی کہ ان دونوں نے فرید آباد کے اسکول سے چارج دینے کے بعد نئے اسکولوں میں رپورٹ نہیں کیا تھا۔ اس بات کو قریب قریب ایک ماہ ہو گیا تھا۔ دفتر والوں نے ان دونوں کے خلاف ڈسپلنری کاروائی کرنے کے لئے فائل بھیجی تھی۔ جس پر دوسرے ارجنٹ کاموں کی وجہ سے کوئی ایکشن نہیں لے سکا تھا۔ ایک صبح میں اپنے دفتر میں آیا ہی تھا کہ ڈرائنگ ماسٹر اجازت لے کر کمرے میں داخل ہوا اور میرے سامنے ایک بند لفافہ رکھ دیا، لفافے پر میرا ایڈریس لکھا تھا۔ ہینڈ رائٹنگ میں نے پہچان لی یہ کنور مہندر سنگھ بیدی کا خط تھا۔ میں نے لفافہ کھولا اور نہایت ہی مختصر خط پڑا۔ لکھا تھا یہ میاں بیوی اس وقت پریشانی میں ہیں آنے والے جاڑے کے پیش نظر انہیں اکٹھا کر دیجئے اور ان کی دعائیں حاصل کیجئے۔ خط پڑھ کر میں مسکرا دیا، ڈرائنگ ماسٹر نے بڑی جرأت کر کے پوچھا'' کیا لکھا ہے سر'' آپ کے فائدے کی بات ہے آپ جائیے۔ میں نے جو فائل میرے پاس پنڈنگ پڑی تھی، فائلوں میں سے نکالی اور میاں بیوی کو فرید آباد کے قریب ایک اسکول میں ٹرانسفر کر دیا''۔

جن دنوں دوسری جنگ عظیم زوروں پر تھی حکومت نے کنور صاحب کو دلّی لا کر'' نیشنل

Marfat.com

وارفرنٹ'' کا چارج دے دیا۔ گوکہ اس محکمے کا مقصد جنگ کے لئے رائے عامہ کو ہموار کرنا تھا۔ چونکہ کانگریس اس کی تائید وحمایت کی مخالف تھی اور خود بیدی صاحب بھی قومی تحریک کے لئے اپنے دل میں نرم گوشہ رکھتے تھے، لیکن پھر بھی یہ ذمہ داری انہوں نے قبول کر لی اور اس سے کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ بھی ہو گئے۔ اس سلسلے میں ان کا اندازِ فکر ملاحظہ ہو:

''میں سرکاری ملازم ضرور تھا لیکن میری ہمدردی ان کے ساتھ تھی جو ملک کی آزادی کے لئے جدوجہد کر رہے تھے البتہ میں محسوس کرتا تھا کہ جنگ جیتنے پر ممکن ہی نہیں اغلب ہے انگریز ہندوستان کو آزاد کریں''۔

نیشنل وارفرنٹ کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے اور دلّی کے دوسرے نظامی امور انجام دینے کے لئے انہیں شہر کی برگزیدہ ہستیوں اور جملہ علوم وفنون سے متعلق افراد سے کثرت سے ملنے جلنے کے موقعے مل رہے تھے، دلّی کی ان فضاؤں میں بیدی صاحب کی شاعری کو بھی پروان چڑھنے کا موقعہ مل رہا تھا، اور کنور صاحب نیشنل وارفرنٹ کے اغراض ومقاصد کے ساتھ ساتھ ہر روز مشاعرے، قومی دربار اور کوی سمیلن بھی منعقد کرتے رہتے۔ ان کی ثقافتی مشغولیات صرف شعر وادب یا رقص ونغمہ کی محفلوں تک محدود نہیں تھیں۔ ان محفلوں کے علاوہ مرغوں، بٹیروں یا تیتروں کی پالیاں ہوں یا پہلوانوں کی کشتیاں، کنور صاحب ہر جگہ بہ نفس نفیس ان کی سرپرستی فرماتے ہوئے ملتے تھے۔

دوسری جنگ عظیم ختم ہوئی کچھ مدت بعد ہندوستان انگریزوں کے تسلط سے واقعی آزاد ہو گیا اور آزادی کے ساتھ ساتھ کشت وخون کا بازار بھی گرم ہو گیا۔ ۱۹۴۷ کا پرآشوب زمانہ تھا۔ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان حد فاصل کھینچ چکی تھی۔ پاکستان مشرقی پنجاب اور دلّی میں انسان گاجر مولی کی طرح کٹ رہے تھے۔ اس پرآشوب دور میں بیدی صاحب نے دلّی میں امن وامان بحال کرنے۔ فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور خیر سگالی کی فضا قائم کرنے کے لئے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی۔ یہ ان کے خلوص، لگن سوجھ بوجھ، جانفشانی اور نیک نیتی کا نتیجہ تھا کہ شہر میں امن وامان قائم ہوا۔ بیدی صاحب کو گورنانک دیو جی سے جو صوفیانہ فطرت اور فقیری ملی تھی وہ ان کے مزاج سے کبھی نہیں گئی وہ رتبہ میسر ہونے پر بھی نہایت سادہ زندگی بسر کرتے رہے۔ گو تقسیم وطن کی وجہ سے ان کے خاندان کو بھی اپنی جائداد اور جاگیریں چھوڑ کر ترک وطن کرنا پڑا لیکن انہوں نے کبھی اس عظیم نقصان کا افسوس نہیں کیا۔ کنور صاحب کی خدمات اور مذہبی تعصب سے بالاتر ہونے کے باعث ہندوستان ہی نہیں پاکستان

Marfat.com

میں رہنے والے مسلمان بھی انہیں اپنا مربی سمجھتے تھے۔

بیدی صاحب پورے استغراق سے روزانہ عبادت کرتے وہ ایک مذہبی انسان تھے۔ عقیدے کی پختگی اور پابند وضع ہوتے ہوئے بھی دوسرے مذہب کا پورا احترام کرتے تھے۔نمائش کا شائبہ تک نہ تھا ریاکاری اور نمائش سے انہیں نفرت تھی۔وہ مذہب کی نمائش سے ہمیشہ بیزار رہتے: یادوں کے جشن میں لکھتے ہیں:

"جب کوئی مذہب کو درمیان میں لاکر بات کرتا ہے تو مجھے ناگوار گزرتا ہے اور میں اس قدر صاف گوئی سے کام لیتا ہوں کہ اس پر میرے یا دوسرے مذہب سے تعلق رکھنے والے کبھی کبھی ناخوش بھی ہو جاتے ہیں۔لیکن میں مذہب دین دھرم، پنتھ سب کو ایک ذاتی اثاثہ سمجھتا ہوں جسے نمائش کے لئے منظر عام پر لانا کسی صورت میں بھی مجھے پسند نہیں"۔

بیدی صاحب مذہب کے معاملے میں بہت فراخ دل تھے۔تنگ نظری اور تعصب ان کے نزدیک بھی نہیں پھٹکتے تھے۔وہ تمام مذاہب کی یکساں قدر کرتے اور کسی کی دل آزادی کو گناہ جانتے تھے۔ بیدی صاحب کو اسلام سے محبت اور رسول کریم سے عقیدت تھی۔شری کرشن جی کی گیتا سے فیض حاصل کرتے اور شری رام چندر جی کی تعلیمات کا احترام کرتے تھے۔گورو گوبند سنگھ جی سے شجاعت اور حضرت یسوع مسیح سے امن و امان کا درس حاصل کرتے رہے۔ان کی شاعری میں تمام مذاہب سے متاثر ہونے کا رنگ کس قدر نمایاں ہے ایک بند ملاحظہ ہو:

ہندوؤں سے تجھے لینا ہے ذہانت کا کمال
اور سکھوں سے شجاعت کہ نہ ہو جس کی مثال
اہل اسلام سے لینا ہے عبادت کا جلال
اور عیسائیوں سے صبر، لگن، استقلال

بیدی صاحب کے شاگردوں کی تعداد بھی خاصی تھی۔ہر شاگرد ان کی سرپرستی میں اس لئے چلا آتا تھا کہ ایک طرف تو اس کی تربیت کر کے اچھا شاعر بناتے اور دوسری طرف اس کو معاشی سہولتیں بھی بہم پہنچاتے۔غرضیکہ اس کے لئے روزگار تلاش کرنا، اس کی رہائش کا انتظام کرنا اور اس کے حالات کو بہتر بنانا ان کی ذاتی ذمہ داریاں بن جاتی تھیں۔

بیدی صاحب کی بزم ہمیشہ آراستہ رہتی نہ صرف شاعر وادیب بلکہ تیتر باز، بٹیر باز، مینڈھے لڑانے والے اور پہلوانی سے تعلق رکھنے والے لوگ بھی ان کے گرد جمع رہتے۔ان کی محفلوں سے متاثر ہوکر ایک دفعہ فراق گورکھپوری نے کہا تھا:

''عجیب شخص ہے شاعروں کو پہلوان بنا رہا ہے اور پہلوانوں کو شاعر''۔

ان کی محفل کی رونقوں کے بارے میں مجتبیٰ حسین لکھتے ہیں:

''کنور صاحب کے اطراف نہ صرف شاعر اور ادیب جمع رہتے ہیں بلکہ پہلوان اور فن پہلوانی سے تعلق رکھنے والے افراد بھی جمع رہتے ہیں،۔اس لئے ان کی محفل میں بہت محتاط رہتا ہوں، کیوں کہ برابر بیٹھے ہوئے شخص کے بارے میں یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ یہ مطلع عرض کرے گا یا گھونسہ رسید کرے گا کسی اچھی بات پر مصافحہ کرے گا یا پنجہ لڑائے گا''۔

بیدی صاحب کے شب وروز مشاعروں، مجلسوں اور جلسوں کی ترتیب اور تنظیم، مختلف کھیلوں اور فنون سے دلچسپی کے علاوہ ادبی، سماجی، فلاحی اور مذہبی اداروں کے لئے وقف تھے۔ انہوں نے مشاعروں کے لئے دور دور تک لوگوں کو ترغیب دی، جس سے نہ صرف زبان کی خدمت ہوتی رہی بلکہ شاعروں کو مالی فائدہ بھی پہنچتا رہا۔اس طرح سے انہوں نے جن شاعروں کو گوشۂ گمنامی سے نکال کر دنیائے ادب سے روشناس کرایا اس کی تعداد سینکڑوں تک پہنچتی ہے۔ بیدی صاحب نے شاعری کو کبھی ذاتی عزت، شہرت اور ذریعہ معاش کا وسیلہ نہیں بنایا اور نہ ہی انہوں نے مشاعرے کے نام پر کبھی معاوضہ لینا گوارا کیا۔لیکن اپنے ساتھ لائے ہوئے شاعر دوستوں کو ہمیشہ معمول سے زیادہ رقم دلواتے اس طرح نامعلوم انہوں نے کتنے لوگوں کی مدد کی لیکن اس کے متعلق کبھی ایک لفظ زبان پر نہیں آنے دیتے تھے۔

ان کی شاعری میں ایک طرف روحانی فضا ہے تو دوسری طرف زندگی کے تلخ تجربات کی عکاسی بھی ملتی ہے۔ بیدی صاحب کے کلام میں جہاں سلاست، سادگی اور زبان و بیان کی دیگر خوبیاں پائی جاتی ہیں وہیں روزمرہ کی بات چیت میں استعمال ہونے والوں محاوروں کا برمحل استعمال بھی قاری کو متاثر اور متوجہ کرتا ہے۔چند اشعار ملاحظہ ہوں:

حسن پھر محو خود نمائی ہے
ٹل نہیں سکتی جس کی آئی ہے

Marfat.com

نا امیدوں کے دل میں آس کہاں
چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں

کہہ چکے ہیں یہ قول اہلِ خرد
آج کے کام کو تو کل پر نہ چھوڑ

شیخ اچھے ہیں اور برے ہم
بد اچھا بد نام برا ہے

سحر صاحب نہ صرف خدا کے قائل تھے بلکہ اس سے اپنی نیاز مندی کا اظہار خوف اور امید و رحمت کی صورت میں کرتے:۔

تیری رحمت نے سنبھالا سرِ محشر ورنہ
ہم تو کچھ لائے نہ تھے دامن عصیاں کے سوا

رحمت نے لپک کر جنھیں بخشا سرِ محشر
اے زاہدِ خود بین وہ گنہگار ہمیں تھے

بیدی صاحب کی شاعری میں قوس قزح کی سی رنگا رنگی ہے، ان کی غزلوں میں جذبہ کی شدت بھی ہے اور انسان کے دل کی دھڑکنوں کا سنگم بھی:

جام و ساقی جو دیکھا تو کہا واعظ نے
زندگی اتنی حسیں تھی مجھے معلوم نہ تھا

جوانی میں قدم رکھا ہے اس بت نے خدا رکھے
میری دنیا میں بندے کے خدا ہونے کا وقت آیا

کسی ایک آدھ میکش سے خطا کچھ ہوگئی ہوگی
کیوں میکدے کا میکدہ بدنام ہے ساقی

ان شوخ حسینوں کی نرالی ہے ادا بھی
بت ہو کے سمجھتے ہیں کہ جیسے ہیں خدا بھی

Marfat.com

کنور صاحب میں مشاعروں کی نظامت کا خاص سلیقہ تھا ان کو سینکڑوں اشعار یاد تھے، بے شمار لطیفے نوکِ زبان تھے۔ اس وجہ سے سامعین اُن سے بیحد خوش رہتے خواہ وہ مشاعرے سے کتنے ہی ناراض کیوں نہ ہوں۔ کچھ سامعین تو اس انتظار میں رہتے کہ کب شاعر اپنا کلام ختم کرے اور وہ بیدی صاحب کا کمال دیکھیں۔ کنور صاحب نہ صرف فقروں سے محفل کو زعفران زار بنادیتے بلکہ بگڑی ہوئی محفلوں کو سدھارنے کا سلیقہ بھی رکھتے تھے لیکن وہ اتنا عرصہ تک خشک نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ خاص کر جب ان کے کندھوں پر گرتے مصرعوں اور گرتے شاعروں کو سنبھالنے کی ذمہ داری ہو۔ کنور صاحب رند مشرب اور وسیع القلب انسان تھے، ان کا یہ دعوی بیجا نہیں کہ وہ بادہ پرست ہیں شراب خور نہیں۔ یادوں کے جشن میں رقمطراز ہیں:

''شراب کے بارے میں صرف ایک بات کہنا چاہوں گا اور وہ یہ کہ ہماری تمام مذہبی کتابوں میں شراب کی تشبیہ دی گئی ہے مثلاً قرآن کریم میں ''شرابِ طہور'' کا ذکر ہے۔ وید پرانوں میں ''روم نام کی مدرا'' پینے کی تلقین کی جاتی ہے۔ انجیل میں بھی ''ڈیوائن وائن'' کا تذکرہ ہے۔ ہمارے ہاں گورو گرنتھ صاحب میں بھی ''نام خماری'' کی بات کی گئی ہے۔ اگر یہ چیز اس قدر مکروہ ہے تو اس کا نام تک کسی شکل میں ہماری مذہبی کتابوں میں نہیں آنا چاہیئے تھا۔ مذہبی کتابوں میں یہ بھی کہا جاسکتا تھا کہ رام نام کا دودھ پیئیں، واہ گورو کے نام کا کڑاہ پرشاد کھائیں یا یادِ اللہ کی بریانی نوش فرمائیں یا مسیحی کردار کا شربت چکھیں۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شراب بذات خود بری نہیں ہے، کم ظرف شراب نوش اسے بدنام کردیتے ہیں''۔

یادوں کے جشن میں مزید کہتے ہیں کہ:

''شراب خوری رسوائی حاصل کرنے کا نام ہے اور بادہ پرستی مئے سے لطف اندوز ہونے کو کہتے ہیں۔ چنانچہ مجھے ان لوگوں سے سخت نفرت ہے جو شراب کو برا کہتے ہیں''۔

ہمہ وقت غرق مئے رہنے کی لت بھی انہیں ناپسند تھی۔ آگے چل کر یادوں کے جشن میں لکھا ہے:

''میں جانتا ہوں کہ شراب اور شعر میں گہرا تعلق ہے مگر یہ تعلق جائز ہونا چاہیئے یعنی مئے کے ساتھ اپنی منکوحہ بیوی سا سلوک ہونا چاہیئے نہ کہ معشوقہ کا کہ ہر وقت اسے

Marfat.com

لپٹائے رکھیں"۔

بیدی صاحب کو ہر طرح کی محفلوں میں نہایت عزت و احترام سے دیکھا جاتا تھا ان پر خود انہیں کا یہ شعر صادق آتا تھا۔

میکدے میں وہ ہے نصیب کسے
جو سحر کا مقام ہے ،ساقی

ان کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

گھٹا ہے، ابر ہے، مئے ہے، سبو ہے، جام ہے ساقی
یہی شاید علاجِ گردشِ ایام ہے ساقی

جوانی بے خطا بے عیب ہوسکتی تو ہے لیکن
یہ جینا بھی تو خود جینے پہ اک الزام ہے ساقی

یہ بجا کہ گردشِ وقت ہے
ابھی تیز گردشِ جام سے

تیرے رند پھر بھی ہیں مطمئن
تیرے میکدے کے نظام سے

جنابِ شیخ شراب اس لیے نہیں پیتے
یہ وہ گناہ ہے جو با وضو نہیں ہوتا

کنور مہندر سنگھ بیدی ایک ممتاز شاعر اور اردو تحریک کی ایسی قد آور شخصیت تھے ، جو ہندوستان اور پاکستان کے عوام میں ہی نہیں بلکہ احباب وصاحبان اختیار میں بھی یکساں مقبول اور محبوب تھے۔ دونوں ملکوں کے درمیان کنور صاحب ایسا تہذیبی پُل تھے، جس کی کوئی مثال قیامِ پاکستان کے وقت سے آج تک نہیں ملتی۔ وہ واحد معتبر ہستی تھے جنہیں دونوں ملکوں میں یکساں عزت کا مقام حاصل تھا۔ پنڈت نہرو، مولانا آزاد، ڈاکٹر ذاکر حسین اور سینکڑوں سیاسی لیڈر

Marfat.com

ہندوستان میں ان کے مدّاح تھے تو پاکستان میں جنرل ایوب، ذوالفقار علی بھٹو اور جنرل ضیاء الحق ان کے گرویدہ تھے۔صدر پاکستان جنرل ضیاء الحق صاحب ہندوستان تشریف لائے تو ایک انٹرویو میں دیوان بریندر ناتھ سے کہا کہ کنور صاحب ہندوستان کے بہترین سفیر ہیں۔اور یہی رائے گیانی ذیل سنگھ، صدر ہندوستان نے راشٹر پتی بھون میں تشریف لائے ایک ادبی وفد سے ظاہر کی تھی کہ بیدی صاحب جہاں بھی جائیں گے ہندوستان کے بہترین سفیر ثابت ہونگے کنور صاحب بطور ادیب بھی پاکستان تشریف لے جاتے رہے اور بحیثیت شاعر بھی، وہاں لوگ ان کی راہ میں اس طرح آنکھیں بچھاتے کہ معلوم ہوتا وہ کسی سربراہ مملکت کا استقبال کر رہے ہیں۔ان کی مقبولیت کا پاکستان میں کھلا ثبوت یہ ہے کہ ان کے انتقال کے دوسرے ہی دن پاکستان کے قریباً سبھی اخبارات میں ان کی وفات کی خبر تصویر کے ساتھ صفحۂ اول پر شائع ہوئی۔

بیدی صاحب پر کام کرنے کی دھن ہر وقت سوار رہتی۔ترقی اردو بورڈ کے وائس چیرمین تھے اس کی بہتری کے لئے حکومت کے ایوانوں میں پہنچتے تھے۔دہلی اردو اکیڈمی کے وائس چیرمین تھے یا مشاعرہ کمیٹی کے چیرمین تو نت نئے پروگرام بناتے اور اس کو بہتر طور پر سرانجام دینے کیلئے مشغول نظر آتے تھے۔غالب انسٹی ٹیوٹ کی ایوارڈ کمیٹی کے سربراہ تھے تو ہر وقت نئے ایوارڈ جاری کرنے کے لئے کوشاں نظر آتے تھے۔کنور صاحب آخر تک رونق انجمن بنے رہے۔کتنی انجمنیں تھیں جو ان کو سرپرست بنا کر فخر محسوس کرتی تھیں۔آج یہ انجمنیں ان کے غم میں سونی نظر آتی ہیں۔بیدی صاحب کی وفات سے ہماری ادبی دنیا میں ایسا خلا پیدا ہو گیا کہ جس کا پُر ہونا بظاہر ممکن نہیں۔

بیدی صاحب گو ہمارے درمیان نہیں رہے لیکن ان کی ادبی شخصیت، انسان دوستی، رواداری اور ادب نوازی دنیا کو ہمیشہ یاد رہے گی۔میں جگر مرادآبادی کے ایک شعر پر اس مضمون کو ختم کرتا ہوں اور اس میں معمولی سی تبدیلی کی جسارت بھی کر رہا ہوں تا کہ شعر موقعہ کی مناسبت سے صحیح استعمال ہو سکے۔

جان کر منجملۂ خاصانِ میخانہ تجھے
مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ تجھے

☆☆☆

ناز انصاری

مصور فطرت شمس العماء خواجہ حسن نظامیؒ کا قول ہے کہ چار پیشے ایسے ہیں جو ولی بھی بنا سکتے ہیں اور شیطان بھی۔ پولیس، پیر، پلیڈر اور حکیم ڈاکٹر کہ اپنے فرض کو دیانت داری سے ادا کریں تو بغیر کسی اور عمل کے ولی بن جائیں ورنہ بغیر کسی گناہ کے شیطان بن جائیں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ مصور فطرت کی روح سے معافی مانگ کر اس میں صحافت کے پیشہ کا بھی اضافہ کردوں اور پانچویں پیشہ کے طور پر ایڈیٹر کو بھی شامل کردوں۔ چلئے میں نے چار پیشوں میں ایڈیٹر کا اضافہ کردیا اور اس اضافہ کے بعد پانچ پیشوں کی جو بھیڑ وجود میں آئی اس میں جن چند ولیوں کا دیدار ہوگا ان میں ناز انصاری قیادت کا جھنڈا اٹھائے ہوئے نظر آئیں گے۔

جھنڈے سے تو نہیں جھنڈی سے ناز انصاری کا گہرا تعلق رہ چکا ہے کہ وہ صحافت کے پیشہ میں آنے سے پہلے ریلوے میں گارڈ تھے۔ ہری اور لال جھنڈی کے استعمال کا موقع اور محل اچھی طرح سے جانتے تھے۔ جس سے انہوں نے اپنی ۴۵ سالہ صحافتی زندگی میں بھی کام لیا۔ آزادی سے پہلے جب ناز انصاری ریلوے میں گارڈ تھے ان کا نام سید اغفار احمد انصاری تھا کہ ان کے والدین نے ۱۹۲۴ء میں ان کی ولادت کے بعد ان کا یہی نام رکھا تھا لیکن ادب و صحافت سے رشتہ جوڑنے کے بعد سید اغفار احمد انصاری کا نام ناز انصاری ہو گیا۔ ان کے نام کے ساتھ ''انصاری'' کے لاحقہ سے ذہن فوراً شٹل اور کرگھے کی جانب منتقل ہو جاتا ہے لیکن کرگھے اور شٹل سے ان کا کوئی تعلق نہ تھا بلکہ یہ'' انصاری'' کا لاحقہ وہی تھا جو حیات اللہ انصاری اور ظ۔ انصاری کے ناموں کے ساتھ بھی جڑا ہوا ہے۔

ان کا گھرانہ سہارنپور کے محلہ قاضیان میں آباد ابو ایوب انصاری کی نسل کے لوگوں کا گھرانا

Marfat.com

تھا۔ناز صاحب ۱۹۴۷ء میں قوم کی اصلاح کا جذبہ لے کر دہلی میں آئے تھے مگر سچ یہ ہے کہ قوم کو ہری اور لال جھنڈی دکھانے کے شوق میں انہوں نے اپنے پاؤں پر کلہاڑی مار لی تھی۔ جس کی ضربوں کے زخم زندگی کے آخری سانس تک نہ بھرے ''انصاری'' کے ادارہ تحریر میں شامل ہو کر انہوں نے غالباً سوچا ہوگا کہ قوم کو ہری جھنڈی دکھانے کا شوق بھی پورا ہو جائے گا اور ریلوے کی نوکری چھوڑ کر جو اقتصادی نقصان ہوا ہے انصاری کے شعبہ ادارت میں شامل ہو کر اس کی تلافی بھی ہو جائے گی۔ مگر یہاں ان کے دونوں اندازے غلط ثابت ہوئے۔ ''نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم'' والی کیفیت سے دو چار ہو گئے۔ نہ قوم کو جھنڈی دکھانے کا موقع ملا نہ اقتصادی نقصان کی تلافی کا سامان کر سکے اور انصاری بند ہو گیا یہاں سے اندازوں کی غلطی کا جو سلسلہ شروع ہوا وہ عرفات کے میدان میں آخری سانس لینے کے وقت ہی ختم ہو سکا۔

حضرات یہاں آخری سانس کی بات بے وقت آ گئی ہے۔ ابھی تو اس سے پہلے کی تمام باتیں باقی ہیں۔ ناز صاحب کو میں نے نوجوانی میں تو نہیں دیکھا مگر جوانی میں ضرور دیکھا اور بڑھاپے تک دیکھتا رہا۔ جوانی میں وہ بڑی باوقار شخصیت کے مالک تھے۔ لمبا قد سر پر انگریزی بال، ناک کے نیچے مشہور ریاضی دان، ڈاکٹر ضیاء الدین احمد مرحوم کی ڈاڑھی جیسی مونچھ، بڑی بڑی آنکھیں، رنگ زیادہ گورا تو نہ تھا مگر سانولہ بھی نہیں کہا جا سکتا تھا چہرے پر ہر وقت سنجیدگی اور متانت طاری رہتی اور اس کو وہ مسکراہٹ پر اسرار بناتی رہتی جو ان کی شخصیت کا خاص حصہ تھی۔ پہلے ٹھنڈی یا گرم شیروانی موسم کی مناسبت سے زیب تن کرتے تھے۔ مگر بعد میں پتلون اور بوشرٹ اور بند گلے کا کوٹ ان کا مستقل لباس ہی نہیں اوڑھنا اور بچھونا بھی بن گیا تھا۔ ان کے دوستوں کا حلقہ مٹیا محل سے اردو ناہال تک تھا۔ بالکل اسی طرح جس طرح شاہ عالم کی سلطنت از دہلی تا پالم تھی۔ شاید دوستوں کا حلقہ زیادہ وسیع نہ ہونے ہی کی وجہ سے ان کے دشمنوں کی تعداد کم تھی۔ میرے اس خیال کی تائید صرف وہی حضرات کر سکتے ہیں جن کے دوستوں کی تعداد زیادہ ہے۔ یا خود میں کر سکتا ہوں کے مجھے اپنے حلقۂ احباب کی وسعت پر کسی زمانہ میں بڑا ناز تھا۔

اس سے پہلے کہ روزنامہ انصاری کے بند ہونے کے بعد ناز انصاری مرحوم جس جوکھم بھرے سفر پر نکلے تھے اس کا حال بیان کروں میں ایک بار پھر ان کی مسکراہٹ کا ذکر کروں جو ان کی شخصیت کا ناقابلِ تسخیر، معصوم حصہ تھی۔ میں نے مشکل ترین حالات میں بھی ان کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھی ہے۔ ناگواری کا اظہار بھی وہ مسکرا کر ہی کرتے تھے، سخت غصے کی حالت میں بھی

Marfat.com

مسکراہٹ ان کا پیچھا نہ چھوڑتی تھی۔ ان کی اس مستقل مسکراہٹ کو دیکھ کر مجھے رشید احمد صدیقی کے مضمون ''جینے کا سلیقہ'' کا ایک پیراگراف یاد آجاتا تھا جو کچھ یوں تھا کہ ایک صاحب پٹتے جارہے تھے اور ہنستے بھی جارہے تھے جس قدر بے تحاشا پٹتے تھے اسی قدر بے تحاشا ہنستے تھے۔ دریافت حال کرنے پر موصوف نے بڑی مشکل سے بتایا کہ پیٹنے والا غلط آدمی کو پیٹ رہا تھا اس لیے وہ اس کی حماقت سے لطف اندوز ہورہے تھے۔ میں نے کبھی ناز صاحب سے ان کے مسلسل مسکراتے رہنے کے عمل کا سبب تو دریافت نہیں کیا مگر مجھے یقین ہے کہ اگر کبھی میں یہ سبب پوچھتا تو اس کا کوئی اور جواب دینے کی بجائے وہ صرف مسکرا دیتے اور مسکراتے ہی رہتے۔ ناز صاحب کی یہ مسکراہٹ دراصل ان زخموں کی مرہم پٹی تھی جو قوم کی خدمت کے شوق میں انہوں نے اپنے دل پر کھائے تھے۔

وہ بہت کم گو تھے۔ شاید لکھتے لکھتے بولنا بھول گئے تھے۔ جس بات کے لیے پوری ایک تقریر ناکافی ہوتی وہی بات وہ ایک یا دو مختصر جملوں میں کہہ کر مسکرا دیتے تھے پرانے تعلقات کا ہمیشہ خیال رکھتے تھے۔ حکمرانوں سے محفوظ فاصلہ برقرار رکھنا ان کی فطرت ثانیہ تھی۔ اپنی لگ بھگ ۴۵ سالہ صحافتی زندگی میں انہوں نے خود کو کسی وزیر کے دربار، کسی سیاست داں کے حجرہ اور کسی بااثر شخصیت کی مجلس کے مستقل حاضر باشوں میں شامل نہیں کیا۔ سیاستدانوں میں صرف میر مشتاق احمد سے ان کے گہرے تعلقات تھے اور ان تعلقات کی حفاظت کے لیے انہوں نے اپنے عہد کی دوسری اہم شخصیتوں کی خفگی بھی مول لی۔ برسوں میر صاحب کے ایشیا ویکلی کی ترتیب وتدوین کی ذمہ داریاں انجام دیں جو اچاریہ نریندر دیو، جے پرکاش نارائن اور ڈاکٹر رام منوہر لوہیا کے نظریات کا ترجمان تھا۔

یہ بات میں پہلے ہی عرض کرچکا ہوں کے ناز صاحب نے ۱۹۴۷ء میں دہلی کے روزنامہ انصاری سے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز کیا مگر یہ اخبار تقسیم کے بعد پیدا ہونے والے حالات کا سامنا نہ کرسکا اور بند ہوگیا۔ انصاری بند ہونے کے بعد ناز صاحب روزنامہ الجمعیۃ سے وابستہ ہو گئے جو قوم پرست علماء کی تنظیم جمعیۃ العلماء ہند کا ترجمان تھا اور ۱۹۲۵ء میں ایک ہفت وار اخبار کی صورت میں جاری ہوا تھا تحریک ترک موالات کے زمان میں الجمعیۃ سہ روزہ ہوگیا تھا اور آزادی کے بعد روزنامہ ہوا تھا۔

یہ ہندوستان کی آزادی کا ابتدائی دور تھا، تقسیم کے زخم تازہ تھے۔ بڑے پیمانہ پر آبادی کا

تبادلہ ہو چکا تھا اور جامع مسجد کے منبر سے مولانا آزاد کی اس تاریخی تقریر کے بعد بھی مسلمان غول درغول ہجرت کر رہے تھے جس میں انہوں نے مسلمانوں کی عقل پر ماتم بھی کیا اور انہیں ہندوستان میں جینے اور مرنے کی دعوت بھی دی تھی۔

ناز انصاری نے اس انقلاب کو بہت قریب سے دیکھا تھا اور انقلاب کے اچھے اور برے تمام اثرات بھی قبول کئے تھے۔ ان کے اندر ملک وملت کی خدمت کا جذبہ موجیں مار رہا تھا اور وہ اپنے اس جذبہ کو صفحہ قرطاس پر اتارنے کے لیے بے چین تھے۔ چونکہ الجمعیۃ میں ان کا کام صرف خبروں کا ترجمہ کرنا، سرخیاں لگانا اور مراسلات کی نوک پلک درست کرنا تھا اور اداریہ نویسی کی خدمت مولانا عثمان فارقلیط کے سپرد تھی اس لیے وہ کسی وسیع میدان کے متلاشی تھے۔ اتفاق سے ۱۹۵۲ء میں مولانا عبدالوحید صدیقی نے الجمعیۃ سے علیحدگی اختیار کر کے حویلی حسام الدین حیدر بلی ماران سے ''نئی دنیا'' کے نام سے اپنا اخبار شروع کیا اور ناز انصاری کو اس اخبار کے وسیلہ سے وہ وسیع میدان مل گیا جس کی تلاش میں وہ سرگرداں تھے۔ اس اخبار کے مینیجنگ ایڈیٹر مولانا عبدالوحید صدیقی تھے، ایڈیٹر مولانا عبدالباقی تھے، اور اسسٹنٹ ایڈیٹ ناز انصاری تھے۔ اسی ترتیب سے ان تینوں کے نام بھی اخبار کی پیشانی پر شائع ہوا کرتے تھے۔ مولانا عبدالباقی نے جب چند ہفتوں کے بعد ہی ''نئی دنیا'' سے قطع تعلق کر لیا تو ناز صاحب کے میدان کو اور وسعت حاصل ہوگئی۔ اب مولانا عبدالوحید صدیقی مینیجنگ ایڈیٹر تھے اور ناز انصاری ایڈیٹر۔

ناز انصاری کی فطرت کی معصومیت، رواداری اور وضع داری کا قائل میں اس وقت ہوا جب مولانا عبدالوحید صدیقی کے انتقال کے بعد انہوں نے ایک مضمون '' مجاہد صحافت مولانا عبدالوحید صدیقی'' میں لکھا کہ ... '' مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی شرم نہیں کہ مولانا عبدالوحید صدیقی نے میری صلاحیتوں کو اجاگر کرنے اور مجھے ایک عملی صحافی بنانے میں بڑا اہم رول ادا کیا ہے۔ میں ابتدا میں نہ صرف اداریوں کے سلسلے میں ان سے مشورہ اور مباحثہ کیا کرتا تھا بلکہ لکھ کر ان سے اصلاح بھی لیتا رہا ہوں'' اس طرح کا اعتراف کوئی بڑا آدمی ہی کر سکتا ہے۔

مجھے لگ بھگ ڈیڑھ یا دو سال ناز صاحب کی ماتحتی میں کام کرنے کا شرف حاصل رہا ہے اس دوران میں نے دیکھا کہ ناز صاحب وقت کے پابند تھے۔ بات سے بات پیدا کرنے انگریزی اخباروں کی خبروں کو اپنے قارئین کے مزاج کے مطابق بنانے میں بڑی مہارت کا مظاہرہ کرتے تھے، مقامی خبروں کو وہ قومی اور بین الاقوامی خبروں سے زیادہ اہمیت دیتے تھے اور

Marfat.com

اکثر ان خبروں کو شائع کرتے تھے۔ ''سنبھل یا امروہہ کے قاری کو اپنے قصبہ کی نالیوں اور سڑکوں کی بدحالی یا اپنے علاقہ کے کسی جیب کترے کی گرفتاری سے جتنی زیادہ دلچسپی ہوسکتی ہے اتنی دلچسپی اقوام متحدہ میں کی گئی کسی تقریر یا جواہر لال نہرو کے کسی وعدے سے نہیں ہوسکتی''۔

نئی دنیا میں رہتے ہوئے ناز صاحب نے دو بڑی تحریکیں بھی چلائیں ایک تحفظ ناموس رسول کی تحریک جس نے نئی دنیا کو ایک بیباک مسلم اخبار کی حیثیت دی اور دوسری جمعیۃ العلماء کے انگریزی اخبار ''دی میسج'' کے خلاف ''اہانت اصحاب رسول'' کی تحریک۔ جس کے نتیجہ میں جمعیۃ العلماء کے زعما اور نئی دنیا کے بانی مولانا عبدالوحید صدیقی کے درمیان مفاہمت کا وہ معاہدہ ختم ہوگیا جو نئی دنیا کے اجراء کے فوراً بعد چائے کی ایک دعوت کے دوران ہوا تھا۔

جب دی میسج میں شراب کے بارے میں ایک ایسا مضمون شائع ہوا جس کے چھینٹے اصحاب رسولؐ پر بھی پڑتے تھے تو نئی دنیا نے دی میسج کے اس شمارہ کو واپس لینے اور جمعیۃ العلماء کے زعماء کے ذریعہ مسلمانوں سے غیر مشروط معافی مانگنے کا مطالبہ کر دیا۔ ناز صاحب کی شعلہ فشاں تحریروں کا اتنا اثر ہوا کہ جامع مسجد پر شاید عین اسی جگہ جہاں ڈپٹی نذیر احمد کے ترجمہ قرآن کو نذر آتش کیا گیا تھا دی میسج کی ہولی بھی جلائی گئی اور جمعیۃ العلماء کے خلاف زوردار مہم چلائی جس کے ایڈیٹر وشاکھاپٹنم کے رہنے والے ایک صحافی غالب فدائی تھے جنہوں نے دی میسج بند ہونے کے بعد دہلی سے اپنا انگریزی پندرہ روزہ "Siraath" جاری کیا اور برسوں اس اخبار کو چلانے کے بعد دو حج بھی کئے مگر اب بہت ضعیف ہو چکے ہیں اور اپنے وطن میں گم نامی کی زندگی گزار رہے ہیں۔

نئی دنیا میں ناز انصاری صرف اداریے اور شذرات ہی نہیں لکھتے تھے، افسانے، انشائیے اور علامہ روحانی کے نام سے ایک مزاحیہ کالم ''جام بکف'' بھی لکھتے تھے۔ ان کے اس کالم میں علامہ اخلاق حسین قاسمی کی ''استری'' کی گم شدگی کا اس حد تک مذاق اڑایا گیا کہ علامہ نے نئی دنیا پر ازالہ حیثیت عرفی کا مقدمہ دائر کر دیا جس کے نتیجہ میں مولانا عبدالوحید صدیقی کو برائے نام سزا بھی ہوگئی۔ اس کے بعد ناز انصاری نئی دنیا چھوڑ کر صاحبزادہ محمد مستحسن فاروقی کے اشاعتی ادارہ سے منسلک ہوگئے۔ اس اشاعتی ادارہ کے کامیاب رسالہ ماہنامہ ''آستانہ'' میں ناز صاحب بہت سخت لب ولہجہ میں حالات حاضرہ پر تبصرے کیا کرتے تھے۔ پھر اسی ادارہ سے ایک ہفت روزہ ''پیام مشرق'' بھی جاری کیا گیا جو آزاد ہندوستان میں اردو کا پہلا "Illustrated" ویکلی تھا۔ اس پرچے میں بھی ناز انصاری نے اپنے قلم کی کاٹ دکھائی اور مستحسن فاروقی صاحب پر نہ صرف

Marfat.com

فرقہ وارانہ منافرت پھیلانے کے الزام میں کئی مقدمات قائم ہوئے بلکہ انہیں نظر بند بھی کیا گیا۔ ''کرے کوئی اور بھرے کوئی اور'' کی یہ ایک ایسی مثال ہے جس کا سامنا متعدد اردو اخبارات کے مالک ایڈیٹروں کو بار بار کرنا پڑا۔ صاحبزادہ مستحسن فاروقی کے ادارے سے بڑے اچھے مگر غریب صحافی اور قلم کار وابستہ تھے جیسے مولانا جلالی، مولانا عبدالباقی، اشرف بھوپالی، مہدی نظمی اور زاہد رضوی۔ ان پریشان حال قلم کاروں نے اپنی محنت، قابلیت اور لیاقت سے آزاد ہندوستان کی اردو صحافت کو بہت سہارا دیا مگر آج ان کا کوئی نام لیوا بھی نہیں ہے۔

جب فاروقی صاحب کی علالت اور پھر ان کے انتقال کے بعد ان کے اشاعتی ادارے کو طرح طرح کی دشواریوں اور زوال کا سامنا کرنا پڑا تو ناز صاحب نے خود اپنا اشاعتی ادارہ قائم کرنا چاہا۔ انہوں نے فوری طور پر اپنا کوئی اخبار تو نہیں نکالا مگر کچھ کتابیں ضرور شائع کیں اور کئی سال تک بچوں کے ماہنامہ ''پھلواری'' کے ساتھ جنتریاں بھی چھاپتے رہے لیکن وہ صرف دوسروں کے لیے اپنے قلم کی کاشت کرنے کے لیے پیدا ہوئے تھے اس لیے اپنے کاروبار میں گھاٹے کے علاوہ ان کے حصہ میں کچھ نہ آیا۔ ناز صاحب نے شیخ محمد عبداللہ کے اخبار ''محاذ سرینگر'' میں بھی ادارتی ذمہ داریاں انجام دیں۔ یہ ہفتہ وار اخبار رائے شماری محاذ کا ترجمان تھا۔ محاذ کے ایک جلوس میں شرکت کے دوران وہ بری طرح زخمی بھی ہوئے اور کشمیر کی جنت کو چھوڑ مٹیا محل کے دوزخ میں واپس آ گئے۔

مولانا عثمان فارقلیط کی علالت کے بعد ناز صاحب نے روزنامہ الجمعیۃ کی ادارت سنبھالی۔ پھر ایک اسلامی کانفرنس میں شرکت کے لیے بغداد گئے۔ وہاں سے انہوں نے ایسی رپورٹ فائل کی جس کے نتیجہ میں الجمعیۃ سے برطرف کیے گئے۔ اپنی اس برطرفی کے خلاف انہوں نے پریس کونسل سے فریاد کی۔ اس سلسلہ میں وہ پرتاپ کے ایڈیٹر شری کے نریندر، سویرا کے ایڈیٹر شری جمنا داس اختر، اور کچھ دوسرے معروف صحافیوں کی مدد حاصل کرنے میں کامیاب رہے۔ کے نریندر نے تو ان کے حوالے سے پرتاپ میں ایک اداریہ بھی سپرد قلم کیا۔ پریس کونسل نے ان کے حق میں فیصلہ دے دیا معاضہ اور تنخواہ کی صورت میں انہیں کافی رقم ملی اور روزنامہ الجمعیۃ بند ہو گیا۔ اس سے قبل ناز صاحب نے مدینہ بجنور کی بھی ادارت کی تھی مگر یہ اخبار ان کے دورِ ادارت ہی میں ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔ انہوں نے روزنامہ تیج میں بھی چند سال کام کیا۔ اگرچہ ان کی یہ ملازمت ان کے مرتبہ کے لحاظ سے بہت چھوٹی تھی مگر وہ خود کو مصروف رکھنا چاہتے تھے اس لیے تیج

سے وابستہ ہو گئے تھے۔ان مصروفیات کے ساتھ وہ ایشیا ویکلی بھی چلاتے رہے کہ اب یہی ہفتہ وار اخبار ان کے تخلیقی ذہن کی تسکین کا ذریعہ رہ گیا تھا۔ انہوں نے بیسوی صدی میں بھی تیر و نشتر اور بہت سے سیاسی لیڈروں کے قلمی چہرے لکھے لیکن یہ تخلیقات ان کے نام سے نہیں شائع ہوئیں۔ کچھ چھوٹے موٹے اخبارات اور رسائل کی بھی انہوں نے در پردہ ادارت کی۔ ناز صاحب نے ۱۹۸۰ء کے دہے میں روزنامہ مشرقی آواز کے دہلی ایڈیشن کی ادارت بھی کی۔ پھر اپنی ملکیت میں روزنامہ انتباہ جدید شروع کیا لیکن روزنامہ نکالنا کوئی آسان کام تو ہے نہیں اور وہ بھی ایک ایسا روزنامہ جو آزادی صحافت کا علمبردار۔ جس کی دست غیب سے کوئی اعانت نہ ہوتی ہو اور جس کے خریداروں کا حلقہ زیادہ بڑا نہ ہو۔ وسائل کی کمی نے اس روزنامہ کو بھی چلنے نہ دیا مگر ناز انصاری چلتے رہے۔ کبھی گرے، کبھی اٹھے۔ ۱۹۹۲ء میں ناز صاحب سے ایک دعوت افطار میں ملاقات ہوئی۔ بہت بجھے بجھے نظر آئے۔ اب ان کے چہرے پر ڈاڑھی کا اضافہ ہو چکا تھا۔ ماتھے پر سجدہ کا نشان زیادہ گہرا ہو چکا تھا اور ان کے شفاف چہرے پر ہمیشہ بکھری رہنے والی مسکراہٹ ماند پڑ چکی تھی۔ دنیا جہان کی باتیں ہوئیں۔ میرے مسلک کے حوالہ سے وہ ہمیشہ کچھ ہلکے پھلکے فقرے چست کرتے تھے۔ دعوت افطار کی اس ملاقات کے دوران بھی انہوں نے فقرے چست کئے۔ پھر نہ جانے کیوں بہت سنجیدہ اور رنجیدہ ہو گئے اچانک کہنے لگے ''اب بس ایک تمنا یہ رہ گئی ہے کہ موت آئے تو ارض مقدس میں آئے'' میں نے ہنس کر کہا '' آمین'' انہوں نے گھور کر مجھے دیکھا تو میں نے ان سے کہا '' مگر میری بھی یہی تمنا ہے کہ میں آپ کے جنازہ کی نماز میں شرکت کروں''۔ناز صاحب نے یہ سن کر میری پیٹھ پر ایک گھونسا جڑا اور کہا '' تم نے یہاں بھی اپنے فائدہ کی بات سوچ ہی لی۔ مگر میں آمین کہتا ہوں''۔

بات آئی گئی ہو گئی۔ میں اپنی تمنا اور ناز صاحب کی تائیدی '' آمین'' کو بھول بھی گیا۔ پھر یوں ہوا کہ وہ بھی ۱۹۹۲ء میں حج بیت اللہ کے لیے گئے اور میں بھی اپنی اہلیہ کے ساتھ پہلے حج کے لیے گیا۔ مگر ہم دونوں کو ایک دوسرے اس کے روحانی سفر کا علم نہیں تھا۔ جب ۲۱ رمئی ۱۹۹۲ء مسجد الحرام میں ظہر کی نماز کے بعد خانہ کعبہ کا طواف کر کے میں باب المدینہ سے باہر نکلا تو مسلم لیگ کے لیڈر سلیمان سیٹھ ایم پی سے ملاقات ہو گئی جو سرکاری وفد میں آئے تھے اور طواف عمرہ کے لیے حرم میں جا رہے تھے انہوں نے بتایا کہ ناز انصاری بھی شاہ فہد کی دعوت پر تشریف لائے ہیں۔ یہ اطلاع ملنے کے بعد قدرتی طور پر ناز صاحب کی تمنا بھی یاد آئی اور اپنی تمنا بھی۔ جی چاہا

Marfat.com

کہ ان سے ملاقات کروں۔ مگر وہ شاہی مہمان خانہ میں، جو حرم سے بالکل متصل ہے ٹھہرے ہوئے تھے جہاں جانا آسان نہ تھا اس لیے ان سے ملاقات نہ ہوسکی۔ ارکان حج ادا کر کے جب مکہ سے مدینہ گیا تو ۲۰ رجون کو مسجد نبویؐ میں ایک حاجی سے معلوم ہوا کہ" ۱۰ رجون کو عرفات کے میدان میں دہلی کے ایک ایڈیٹر کا انتقال ہوگیا۔ قیام عرفات کے دوران ظہر اور عصر کی نماز ملا کر پڑھی، دل کا دورہ پڑا، کلمہ پڑھا اور احرام باندھے ہوئے چل بسے"۔ اس خبر کے ملنے کے بعد نہ جانے کیوں دل نے کہا" کہیں ناز صاحب کی آخری تمنا" پوری تو نہیں ہوگئی؟ اور قیام گاہ پر واپس آنے کے بعد اعتقاد پبلشنگ ہاؤس کے مالک اعتقاد حسین سے معلوم ہوا کہ عرفات میں جس ہندوستانی حاجی کے انتقال کی خبر گشت کر رہی تھی وہ ناز انصاری ہی تھے۔

مجھے یقین تھا کہ ان کے جنازے کی نماز میں بھی شریک تھا کیونکہ مکہ میں قیام کے دوران مسجد الحرام میں جماعتوں کی ہر نماز میں نے پڑھی اور چونکہ وہاں ہر فرض نماز کے بعد ایام حج میں فوت ہونے والے حاجیوں کی نماز جنازہ بھی ہوتی تھی جس میں میں بھی شریک ہوا کرتا تھا اس لیے ناز صاحب کی نماز جنازہ میں میری شرکت ضرور ہوئی ہوگی۔ مگر بعد میں معلوم ہوا کہ ان کی نماز جنازہ عرفات میں ہوئی تھی اور تدفین مکہ مکرمہ میں۔

ارض مقدس کی خاک میں سہارنپور کی یہ خاک کچھ اس انداز سے ملی کہ ان کی موت پر نہ پورے غم کا اظہار کیا جاسکتا ہے نہ پوری خوشی کا مگر اپنی بدقسمتی پر ماتم تو کیا ہی جاسکتا ہے۔ کیونکہ دوبار حج پر جانے سے قبل میرے ایک قریبی دوست نے نہ جانے کس جھونک میں مجھے یہ دعا دی کہ تم وہاں سے زندہ واپس نہ آؤ گے اور ہر بار میں نے آمین بھی کہی مگر نہ میرے دوست کی دعا قبول ہوئی نہ میری آمین باریاب ہوئی۔

☆☆☆

Marfat.com

نریش کمار شاد

کون سمجھائے ان بزرگوں کو
شاعری زندگی کا حصہ ہے
ضرب و تقسیم کا سوال نہیں

نریش کمار شاد نے شعر کہنا کس عمر میں شروع کیا اس کے بارے میں تو کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن جب وہ اچھے اور برے شعر کی پرکھ کرنے کے قابل ہونے لگے تو اسی وقت اردو شاعری میں قافیہ پیمائی اور فاعلاتن مفاعلن فعلن کی گردان کرنے والے بہت زیادہ تھے اور اچھا سلیقے کا شعر کہنے والے گنتی کے تھے۔ شاؔد کی جس نظم کے آخری بند کے تین مصرعے میں نے اوپر درج کئے ہیں وہ انہی عروض بند تک بندوں کے بارے میں تھے، یہ لوگ، دلّی کی گلیوں میں اب بھی کہیں نہ کہیں موجود ہوں گے، اس بارے میں میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔

شاد مجھ سے عمر میں چار سال بڑے تھے، اس ناطے شاد اور میں لگ بھگ ہم عصر تھے۔ شاد کا جنم ۱۱ر دسمبر ۱۹۲۷ء کو مشرقی پنجاب کے ایک گاؤں یحییٰ پور (ٹانڈہ) میں ہوا تھا۔ شاؔد سے میری پہلی ملاقات ظفر ادیب کے ادبی میگزین "ماحول" کے دفتر میں آنجہانی جے رام داس فلک کے ذریعے ہوئی تھی۔ آنجہانی فلک علم عروض کے بے پایاں سمندر تھے۔ جب مرزا یگانہ جیسی ہستی ان کے علم و عروض کی معترف تھی تو اس سے زیادہ اور عزت کسی کو کیا مل سکتی تھی۔ "شاہراہ"، "ماحول" اور دیگر ادبی جرائد میں شاد کے نام اور کام سے میں اچھی طرح واقف تھا۔ میں بھی ان جرائد میں چھپ رہا تھا لیکن کیونکہ میں ترقی پسند تحریک سے وابستہ نہیں تھا اس لیے دماغ میں ایک احساس سا ضرور تھا کہ جانے یہ معتبر شاعر مانتے ہیں یا نہیں، یا شاعر بھی مانتے ہیں یا نہیں۔

Marfat.com

جب فلک صاحب نے شاؔد کو میرا نام بتایا تو اس کی آنکھوں میں ایک چمک سی پیدا ہوئی۔ 'اچھا تو تم ہو من موہن تلخ۔ میں سمجھا تھا کوئی سن رشیدہ شخص ہوگا۔ جب میں نے تیسری یا چوتھی بار شاؔد صاحب' کہا تو شاؔد نے فلک کو دیکھتے ہوئے کہا۔ یہ! کیا مجھ پر طنز کر رہا ہے۔؟ فلک نے مسکرا کر کہا۔ 'دل کا صاف آدمی ہے۔' اور شاؔد نے کہا تھا۔ 'مجھے تو دماغ کا بھی صاف نظر آتا ہے۔'

شاد کا بے انتہا پیارا قہقہہ فضا میں گونج اٹھا۔ میرا ہاتھ کس کر پکڑ کر بولے۔ میری عمر کے ہو یار۔ تم کہہ کر بلاؤ۔ یہ آپ اور صاحب کیا لگا رکھی ہے۔ میرے دل میں اجنبیت کی جو اور جیسی دیوار تھی وہیں ڈھ گئی۔

میں نے شاؔد کو کئی پہلوؤں سے ملنگ پایا۔ صحیح معنی میں ملنگ۔ میں اور فلک تو میلوں پیدل چلتے ہی تھے شاد بھی پیدل چلنے میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ جوش ملیح آباد کا دفتر اولڈ سکریٹریٹ میں تھا۔ اردو آج کل میں میری غزلیں چھپتی چھپاتی تھیں۔ سودن میں ان کے پاس جا بیٹھتا تھا۔ فلک صاحب کا دفتر بھی وہیں پاس میں تھا سو شام کو میں فلک اور شاد اکثر اولڈ سکریٹریٹ سے پیدل چلتے ہوئے اردو بازار تک تو آ ہی جاتے تھے۔ مالک رام صاحب نے تذکرۂ معاصرین ادب میں لکھا ہے کہ شاد نے چند غزلیں جوؔش ملیح آبادی کو بھی دکھائیں۔ شاؔد نے مجھ سے کبھی اس کا ذکر نہیں کیا، نہ ہی کبھی جوؔش صاحب نے بھی ایسی کوئی بات کہی۔ ہاں ایک بار شاؔد نے جوؔش صاحب کے بارے میں ایک ایسی بات ضرور کہی تھی جس سے جوؔش صاحب کے لئے شاؔد کی بے پناہ عقیدت ضرورت جھلکتی تھی۔ ہم سب جوش صاحب کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ جوش صاحب مجھ سے اور شاد سے بولے۔ آپ چاہیں تو یہیں تشریف رکھیں ہم ساڑھے چار بجے تک آتے ہیں اور شاد نے کہا تھا۔ ساڑھے چار بجے تک تو جوش صاحب یہاں انقلاب آجائے گا شاعر انقلاب کیسے نہیں آئے گا۔ اور جوش صاحب کے جانے کے بعد شاد نے کہا تھا۔ کیا شاعر ہے تلخ! لفظ اس کے سامنے غلاموں کی طرح ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں کہ کہیں ہمیں بھی استعمال کرو۔ یہ سلیقہ ہمیں نہیں آیا۔ اور شاد زیر لب ذوق کا یہ مصرعہ گنگنانے لگے:

ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

شاد یہ کہنے میں کوئی جھجک محسوس نہ کرتے تھے کہ وہ صرف دسویں تک پڑھے ہیں۔ وہ جانتے تھے کہ انگریزی ادب میرا اوڑھنا بچھونا ہے۔ کئی بار مشرقی یورپ کے انقلابی شعرا کی نظمیں میرے سامنے رکھ کر کہتے تھے۔ یار لفظی ترجمہ نہیں چاہیے، جیسے تم کیٹس کے نظموں کا مطلب

Marfat.com

بتاتے ہو نا! بس وہ نچوڑ بتا دو، ترقی پسند تحریک یا کمیونزم شاد کے نزدیک محض ایک نعرہ نہ تھے میں نے اپنی آنکھوں سے انہیں کئی بار دوسروں کا دکھ بانٹتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔ ایک شام میں اور شاد بالکل خالی جیب ظفر ادیب کے دفتر سے نکل کر افضل پشاوری کے ہوٹل کی طرف جا رہے تھے کہ سامنے سے فکر تونسوی آتے نظر آئے۔ چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ گھر میں ایک دانہ نہیں تھا بیوی بچوں نے بھی کچھ نہ کھایا تھا فکر بھی خالی پیٹ تھے۔ فکر نے بس اتنا کہا:

"یار گھر جانے کی ہمت نہیں پڑ رہی۔ کیا منہ لے کے جاؤں! افضل کے ہوٹل سے بھی خالی ہاتھ لوٹ رہا ہوں"۔

شاد گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ نہیں بھئی۔ تمہارے تو چھوٹے چھوٹے بچے ہیں اور پھر اچانک شاد کی آواز میں جیسے زندگی ہمک آئی۔ فکر سے بولے۔ تم میرے ساتھ چلو! آج ہم ادب برائے زندگی کا پہلا قدم اٹھاتے ہیں۔ یہ کہہ کر شاد فکر کو لیے لیے دریبہ کلاں پہنچے۔ مجھے نیچے رکنے کو کہا اور خود فکر کو لے کر کسی دوکان کی برابر والی سیڑھیاں چڑھ گئے۔ آدھ گھنٹے بعد دونوں واپس آئے تو دونوں کے چہرے پر زندگی کی چمک موجود تھی۔ تھے کوئی صاحب جو شاد سے ایک عرصہ سے ماہنامہ نکالنے کی بات کر رہے تھے۔ شاد ان سے فکر کو پیشگی سوا سو روپے دلا لائے تھے۔ شاد نے فکر سے صرف اتنا کہا تھا اب یہاں سے تم کسی شراب خانے میں نہیں جاؤ گے۔ سیدھے گھر جاؤ بیوی بچوں کے لیے راشن پانی کا انتظام کرو اور اس آدمی سے جو وعدہ کیا ہے ایک طنزیہ اسے لکھ کر دے جانا۔ آگے کا بھی سلسلہ بنا رہے گا۔

شاد کی شراب نوشی اپنی جگہ درست ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ شراب انھیں پینے لگی تھی۔ لیکن فکر سے ان کا یہ کہنا کہ تم یہاں سے کسی شراب خانے نہیں جاؤ گے اس سے ان کے اندر کی انسانیت کا پتہ چلتا ہے۔ رہی شاد کی شراب نوشی کی بات تو مجھے بھی زندگی میں بالکل پہلی بار شاد ہی نے شراب پلائی تھی۔ شاد کئی دنوں سے مجھے بجھا بجھا سا پا رہے تھے۔ ایک دوپہر مجھ سے ملے تو ان کے منہ سے شراب کا بھبکا آ رہا تھا میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولے۔

بڑی ذلیل فضاؤں سے جی کے آیا ہوں
پہاڑ گنج کے ٹھیکے سے پی کے آیا ہوں

جب میرے چہرے پر کوئی متوقع ردعمل نہ پایا تو مجھے ہاتھ سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے بولے۔ "چلو! آج زندگی سے تمہاری ملاقات کراؤں۔ شاد مجھے فوارے کے کسی ڈھابے میں

Marfat.com

لے گئے جہاں میں نے زندگی میں پہلی بار رم لی۔ دوپہر سے شام فوارے میں ڈھل گئی۔ فوارے سے ہم پیدل چلتے چلتے پل بنگش پہنچے جہاں تلوک چند محروم کے گھر میں فراقؔ ٹھہرے ہوئے تھے۔ یہ وہی مکان تھا جہاں پہلے جوش ملیح آبادی رہتے تھے۔ اب نیچے کی منزل میں محروم صاحب اپنے بیٹے جگن ناتھ آزاد کے ساتھ تھے اور اوپر پہلی منزل پر ساحر ہوشیار پوری تھے۔ وہاں رات کے گیارہ بج گئے۔ دسمبر کا مہینہ تھا۔ جب دونوں خالی جیب نشے میں دھت وہاں سے نکلے تو شاد نے اتنا ہی کہا۔ تم اس حالت میں اپنے گھر کہاں جاؤ گے۔ ''آج رات میرے گھر کاٹ لو''۔

میں اور شاد پل بنگش سے پیدل چلتے ہوئے شاہدرہ پہنچے سردی اور تھکان۔ دونوں کا برا حال تھا۔ شاید رات کے دو یا ڈھائی بج چکے تھے۔ شاد نے دروازے پر دستک دی۔ بیوی کو آواز دی۔ دروازہ کھلا تو میرے لیے بستر کا انتظام کر کے بولے۔ کچھ تو کھاؤ گے؟ میں نے کہا۔ یہ کیا کھانا بنانے یا کھانے کا ٹائم ہے۔؟ شاد ہنسے اور بولے۔ ویسے گھر میں کچھ ہے بھی نہیں۔ بڑی غیور اور خودداری بیوی ہے میری۔ بھوکی رہ لے گی، پڑوسی سے آٹا نہیں مانگے گی۔

مالک رام صاحب نے شاد کی گھریلو زندگی کا بھی ذکر کیا ہے۔ اب اس عمر کو پہنچ کر میں یہ بات کہنے کے قابل ہوا ہوں کہ ہندوستانی عورت روٹی کے لیے ہی گھر میں کلیش کرتی ہے، ورنہ نہیں۔ شاد حالانکہ سرکاری ملازم تھے، لیکن جو تنخواہ ملتی تھی، ان کے اپنے خرچ کے لئے کافی نہ تھی۔ بیوی کے لئے ان کے دل میں درد تھا۔ اسی دکھ کا انہوں نے غلط مداوا چنا۔ یعنی شراب، پھر ان کے والد دردنکودری کا اچانک گھر سے لاپتہ ہو جانا، ان کی تلاش میں شاد کا ایک عرصہ تک جگہ جگہ بھٹکتے پھرنا، ان سب باتوں سے جتنا ان کا غم بڑھا، اتنی ہی ان کی شراب نوشی بڑھی، آخر ایک شام اور یہ میری شاد کے آخری ملاقات تھی وہ کناٹ پلیس میں ٹی ہاؤس کے باہر نشے میں دھت ہو کر ریلنگ پر بیٹھے تھے کہ نیچے کیچڑ میں لڑھک گئے۔ میں نے انہیں لت پت حالت میں اٹھایا اور ان کے مانگنے پر بھی انہیں پیسہ نہ دیا کہ وہ اس کی بھی شراب پئیں گے۔ شاد دوبارہ ریلنگ پر بیٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے یہ مصرعہ پڑھ رہے تھے:

ہوئے مر کے ہم جو رسوا، ہوئے کیوں نہ غرق دریا

میں وہاں سے چل دیا۔ میں ان دنوں روزانہ اخبار پرتاپ میں میگزین ایڈیٹر تھا۔ اگلے دن ۲۱ مئی کی دوپہر کو میرے ایک ساتھی سنتوش کمار نے بتایا کہ شاد کی لاش جمنا سے ملی ہے۔ سنتوش

Marfat.com

نے کہا تھا۔ میں ابھی ابھی لاش کی شناخت کر کے آ رہا ہوں۔

شاد کے سینے میں ایک درد بھرا دل تھا۔ ایک انتہائی ذہین حساس اور بہت اچھے شاعر کی ایسی دردناک موت اس ماحول کے لیے دل میں نفرت بھی پیدا کرتی ہے، جسے بدلنے کی چاہ میں ایک تخلیقی ذہن اس بری طرح برباد ہوا کہ زندگی بے معنی نظر آنے لگتی ہے۔

شاد کے شعری مجموعے بھی کئی ہیں اور نثری کتابیں بھی۔ شعری مجموعوں میں ''بتکدہ'' ''فریاد''، ''دستک''، ''للکار آہیں''، ''قاشیں''، ''آیاتِ جنوں''، ''پھوار''، ''سنگم''، ''میرا منتخب کلام''، ''دوآتشہ کلام''، ''نو بہ نو'' اور ''وجدان'' شامل ہیں۔

نثری تصنیفات میں ''ڈارلنگ''، ''راکھ تلے''، ''سرخ حاشیے''، ''سرقہ اور توارد''، ''مطالعے''، ''جان پہچان''، ''غالب اور اس کی شاعری''، ''پانچ مقبول طنز و مزاح نگار''، ''محاوراتِ غالب''، ''آوازِ غالب''، ''پانچ مقبول شاعر اور ان کی شاعری'' شامل ہیں۔ شاد نے بچوں کے لیے بھی کتابیں لکھی ہیں۔ ''شام نگر میں سنیما آیا''، ''چینی بلبل اور سمندری شہزادی''۔

شاد خود بھی اپنی سوانح عمری لکھ رہے تھے وہ مکمل ہوئی یا نہیں میں کچھ نہیں جانتا۔ ہاں جناب راج نارائن رازؔ کا کہنا ہے کہ شاد کی خودنوشت سوانح حیات کے کچھ نوٹ ان کے ایک شاعر دوست کے پاس محفوظ ہیں۔ راز صاحب نے مجھے ایک بات اور بھی بتائی تھی کہ نریش کمار شاد علامہ بشیشور پرساد، منور لکھنوی سے بھی اصلاح لیتے تھے۔ مالک رام صاحب نے بھی لکھا ہے کہ شاد ایک عرصہ تک تلوک چند محروم سے بھی مستفید ہوتے رہے ہیں۔

لیکن میرے نزدیک ان باتوں کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اس دور میں شاد ایک منفرد آواز کے مالک تھے۔ میں انہیں صاحب اسلوب نہیں کہہ رہا۔ لیکن ان کا کلام انہی کا کلام ہے کسی اور کا نہیں۔ شاد عدم کے بہت معترف تھے۔ فراقؔ اور یگانہؔ کو بڑا شاعر مانتے تھے۔ احمق پھپھوندوی، سنجیدہ شاعری کے پرستار جنھیں حضرات مداح کے نام سے بھی جانتے ہیں، شاد ان کے علم و ہنر کے بھی قائل تھے۔ آخر میں شاد کے کچھ اشعار درج ہیں کہ آخر میں ایک شاعر کے بارے میں لکھ رہا ہوں:

زندگی گوش بر آواز ہوئی ہے جب سے
ہر نفس پہ تری آہٹ کا گماں رہتا ہے

Marfat.com

ہمیں نگاہ تمسخر سے دیکھنے والو
یہ حادثات جو تم پر گزر گئے ہوتے

وہ بھی روٹھی ہوئی مسرت ہے
جس کو ہم لوگ غم سمجھتے ہیں

جیسے مری نگاہ نے دیکھا نہ ہو تجھے
محسوس یہ ہوا تجھے ہر بار دیکھ کر

☆☆☆

Marfat.com

ہنسراج رہبر

۱۲ر مارچ ۱۹۹۴ء کو پاکستان کے بے باک اور نڈر شاعر حبیب جالب کی پہلی برسی کے موقعہ پر انہیں خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے میں نے کانسٹی ٹیوشن کلب نئی دہلی میں ان کی شاعری اور شخصیت سے متعلق عالمی اردو ادب کے ایک خصوصی شمارے کا اجراء کیا تھا اور اس کی پہلی جلد اردو ہندی کے معروف ادیب ہنسراج رہبر کو پیش کی تھی کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ ہندوستان میں حبیب جالب کی طرح بے باک اور بے خوف ادیب صرف ہنسراج رہبر ہی تھے جو ساری زندگی ادب و سیاست کے میدان میں چومکھی لڑائی لڑتے رہے اور انتہائی معاشی تنگدستی اور قید و بند کی صعوبتوں کے باوجود بھی اپنے راستے پر ہمت و استقلال سے چلتے رہے اور کسی بھی قیمت پر اپنے اصولوں اور عقیدوں سے نہیں ہٹے۔

اس میں شک نہیں کہ آزادی سے بیشتر ہمارے متعدد ادیبوں اور شاعروں نے برصغیر کی جنگ آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا اور صرف اپنی تخلیقات میں ہی آزادی کے ترانے پیش نہیں کرتے رہے تھے بلکہ قید و بند کی تکالیف برداشت کرتے رہے۔ حصول آزادی کے کچھ برسوں بعد تک انہوں نے ادھوری آزادی، فرقہ وارانہ فسادات تقسیم اور ہجرت کی کربنا کی اور تباہی پر خون کے آنسو بہائے اور ہمیں ایسی ادبی تخلیقات سے نوازا جنہیں تاریخ ادب اردو میں کبھی فراموش نہیں کیا جا سکے گا۔ مگر بعد میں انہوں نے غریب عوام کے استحصال اور ملک کی ناگفتہ بہ حالت پر آواز بلند کرنے کے بجائے شاید حالات سے مفاہمت کر لی اور وہ بے روزگاری، غریبی اور لوٹ کھسوٹ کے خلاف آواز احتجاج بلند کرنے کی بجائے پدم شری اور پدم بھوشن کے اعزازات پانے، سرکاری اداروں میں نمائندگی پانے اور سرکاری مراعات حاصل کرنے کی دوڑ

دھوپ میں لگ گئے، حتی کہ ایمرجنسی جیسے تاریک دور میں بھی اردو کے اکثر ادیب اس کے خلاف احتجاجی آواز بلند کرنے کی بجائے اس کی حمایت میں پیش پیش رہے ہاں بائیں بازو کے کچھ گنے چنے ادیبوں نے اس تاریک سیاسی دور کے خلاف احتجاجی آواز بلند کی اور کچھ ادیبوں نے حالات کی نزاکت کے پیش نظر مصلحتاً خاموشی اختیار کر لی۔

بائیں بازو کے اول الذکر ادیبوں میں غالباً ہنسراج رہبر سرفہرست تھے کیونکہ انہوں نے ایمرجنسی کے خلاف تحریر و تقریر سے ہی احتجاج نہیں کیا بلکہ قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں یہی نہیں اگر وہ چاہتے تو بطور مجاہد آزادی سرکاری پنشن، فرسٹ کلاس کا ریل ٹکٹ اور دیگر مراعات حاصل کر سکتے تھے مگر انہوں نے ان پیشکشوں کو ٹھکرا دیا حتی کہ تامرپتر تک لینے سے انکار کر دیا۔

رہبر کی ولادت ۹ مارچ ۱۹۱۲ کو سابق ریاست پٹیالہ کے ایک گاؤں ہربادسنگوا میں ہوئی۔ آٹھ نو برس تک وہ اپنے ہمجولیوں کے ساتھ یونہی آوارہ گھومتے رہے۔ پھر ان کے والد پربھودیال نے انہیں مقامی مدرسے میں داخل کرا دیا تا کہ وہ چند جماعتیں پاس کر کے پٹواری یا پنساری بن جائیں کچھ عرصے بعد وہ اپنے گاؤں سے بھاگ کر ٹوہانہ چلے گئے جہاں وہ پڑھائی کے ساتھ ساتھ گپتا اینڈ کمپنی نامی ایک ادارے میں جو جسونتھ سنگھ ٹوہانوی کے رامائن اور مہابھارت پر مبنی ڈراموں کی اشاعت کے علاوہ دوائیں بھی تیار کرتا تھا پیکٹوں اور بنڈلوں پر ایڈرس لکھنے اور انہیں ڈاک خانے میں پہنچانے کا جز وقتی کام بھی کرتے رہے۔ ان کی محنت اور لگن سے متاثر ہو کر کمپنی کے مالک دیوی رام گپتا انہیں کتابیں وغیرہ خریدنے کے لئے مالی امداد بھی دینے لگے۔ جسونتھ سنگھ ٹوہانوی اور نوبہار صابر کی صحبت میں رہ کر انہیں بھی شعر و شاعری کا شوق ہو گیا۔ اسکول میں جب بیت بازی ہوتی تو وہ پوری کلاس کو ہرا دیتے نتیجتاً لڑکے انہیں شاعر شاعر کہہ کر خطاب کرنے لگے لہٰذا دوسرے لڑکوں سے اپنے کو نمایاں کرنے کے لئے انہوں نے ساتویں درجے کی تعلیم کے دوران ہی رہبر تخلص اختیار کر کے تک بندی شروع کر دی۔

ٹوہانہ سے مڈل پاس کرنے کے بعد لدھیانہ کے آریہ ہائی اسکول میں داخل ہو گئے اور اسکول کے اخراجات پورے کرنے کے لئے پڑھائی کے ساتھ ساتھ بازاروں اور گلیوں میں اخبارات بھی بیچنے لگے، اس کام سے انہیں یہ فائدہ ہوا کہ اخبارات کے مطالعہ سے ان میں سیاسی شعور پیدا ہوا اور نتیجے میں وہ گاندھی جی کے نمک ستیہ گردہ سے متاثر ہو کر جنگ آزادی میں کود پڑے۔ انہوں نے بدیشی کپڑے جلا کر کھدر پہننا شروع کر دیا۔ اور ساتھ ہی کانگریسی رضا کاروں میں نام لکھوا کر

Marfat.com

شراب اور ولایتی کپڑے کی دکانوں پر پیکنگ کرنے اور جلسوں میں نظمیں پڑھنے لگے۔

لدھیانہ سے ہائی اسکول کرنے کے بعد انہوں نے لاہور جا کر ڈی اے وی کالج میں داخلہ لے لیا اور ٹیوشنوں سے گزر اوقات کر کے ۱۹۳۷ میں بی اے کا امتحان پاس کیا اور پھر ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔

لدھیانہ میں قیام کے دوران ہی ان کی ملاقات معروف اردو شاعر عرش ملسیانی سے ہوگئی جو کہ ان دنوں وہاں گورنمنٹ انڈسٹریل اسکول میں ڈرائنگ ٹیچر تھے۔ رہبر ان سے اپنے اشعار پر اصلاح لینے لگے، عرش صاحب نے انہیں عروض سے ہی آگاہ نہیں کیا بلکہ مشاعروں میں ساتھ لے جانے لگے۔ اس سے وہ بطور شاعر اچھے خاصے مشہور ہو گئے اور ان کا کلام مختلف رسائل میں شائع ہونے لگا۔ ۱۹۳۸ء میں ان کی ایک غزل مولانا تاجور نجیب آبادی کے موقر ادبی جریدے شاہکار میں شائع ہوئی جو ان دِنوں گوپال متل کی ادارت میں شائع ہو رہا تھا۔

بی اے پاس کرنے کے بعد وہ تلاش معاش میں دہلی چلے آئے۔ مگر انہیں کوئی خاطر خواہ کام نہ ملا۔ وہ کوئی مہینہ ڈیڑھ مہینہ ایک پریس میں جو ٹوہانے کے دیوی رام گپتا کی ملکیت تھی کام کرتے رہے مگر جلد ہی انہیں احساس ہو گیا کہ پریس میں سارا دن کام کرنے کا مطلب ان کی ادبی اور سیاسی سرگرمیوں کی موت ہے۔

۱۹۳۵ء میں وہ کانگریس سوشلسٹ پارٹی سے منسلک ہو گئے۔ اور ۱۹۳۷ء میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ پورا وقت سیاسی سرگرمیوں میں صرف کرنے لگے۔ انہوں نے ریاست جند میں پرجا منڈل قائم کیا جس کے تحت پہلی بار سنگرور میں ترنگا لہرایا گیا۔ بعد ازاں جب ۱۹۳۹ء میں کل ہند ریاستی پرجا منڈل کا لدھیانہ میں شری جواہر لال نہرو کی صدارت میں اجلاس ہوا تو انہیں پروپیگنڈا اسکریٹری کا کام سونپا گیا۔

یکم مارچ ۱۹۴۱ء کو پہلی بار گرفتار ہوئے اور انہیں ایک سال کے لئے عام قیدیوں کی طرح پاؤں میں بیڑیاں ڈال کر کچی بدبودار تنگ و تاریک کوٹھری میں بند کر دیا گیا جہاں مچھر اور کھٹمل ساری رات سونے نہ دیتے تھے۔ پاؤں میں بیڑیاں پہنانے کے خلاف انہوں نے بطور احتجاج تیرہ دن تک بھوک ہڑتال کی اور آخر کار سرکار کو ان کے مطالبے کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پڑے۔ نتیجتاً ان کی بیڑیاں ہلکی کر دینے کے علاوہ انہیں عام قیدیوں سے الگ صاف ستھرے کمرے میں منتقل کر دیا گیا۔

جیل سے رہائی کے بعد وہ ۱۹۴۲ء کے اوائل میں لاہور چلے گئے اور جب اگست ۱۹۴۲ء

Marfat.com

میں گاندھی جی نے بھارت چھوڑو کا نعرہ بلند کیا تو اس تحریک میں حصہ لینے کی پاداش میں انہیں دوسال کے لئے نظر بند کر دیا گیا۔ اس قید کے دوران انھوں نے ادب اور تاریخ کے ساتھ ساتھ گاندھی ازم اور مارکس ازم، لینن ازم اور نیشنل ازم جیسے موضوعات کا مطالعہ کیا اور ان کا جھکاؤ کمیونزم کی جانب ہو گیا۔ اسی جیل میں لال سنگھ نامی ایک کمیونسٹ قیدی اسٹڈی سرکل لیا کرتا تھا اس میں شرکت کا یہ نتیجہ ہوا کہ وہ جیل ہی میں سوشلسٹ سے کمیونسٹ بن گئے۔

تقسیم ملک کے بعد اُن کی سیاسی جدوجہد میں مزید تیزی آ گئی کیوں کہ وہ پندرہ اگست کو یوم آزادی نہیں مانتے تھے ان کا کہنا تھا کہ اس دن اقتدار کا انتقال ہوا ہے اور انگریزوں نے حکومت کی باگ ڈور کچھ ہندوستانیوں کے حوالے کر دی تھی۔ ۱۹۵۰ء میں جشن جمہوریت کے موقع پر انہیں گرفتار کر کے ایک مہینہ تک نظر بند رکھا گیا۔ ۱۹۶۴ء میں کمیونسٹ پارٹی کی تقسیم ہونے پر وہ مارکس وادی کمیونسٹ پارٹی میں شامل ہو گئے اور دسمبر ۱۹۶۴ء میں انہیں گرفتار کر کے سولہ مہینوں کے لئے جیل میں قید کر دیا۔ بعدازاں ۱۹۶۷ء میں وہ چارو مجمدار کی نکسل وادی پارٹی میں شریک ہو گئے اور انہوں نے دہلی میں پارٹی کو منظم کرنے کے لئے جدوجہد کی۔

رہبر صاحب نے ادبی زندگی کی ابتدا بحیثیت شاعر کی تھی مگر پھر ان کا رجحان کہانی اور ناول نویسی کی جانب ہو گیا ان کی پہلی کہانی خواب کی تعبیر ۱۹۳۸ میں سردار گورمکھ سنگھ کے معروف رسالے "پریت لڑی" میں شائع ہوئی اور جلد ہی ان کا شمار اس دور کے مشہور افسانہ نگاروں میں ہونے لگا۔ بطور صحافی وہ اردو اور ہندی کے کئی اخبارات سے وابستہ رہے۔ تقسیم سے قبل وہ روزنامہ "پرتاپ"، روزنامہ "ویر بھارت" اور ہندی روزنامہ "ملاپ" میں کام کرتے رہے۔ آزادی کے بعد چند ماہ وہ بنارس کے ہندی روزنامے "آج" سے منسلک رہے مگر جب کمیونسٹ پارٹی نے وہیں سے "نیا دور" کا اجراء کیا تو وہ دہلی آ کر اس اخبار سے منسلک ہو گئے، لیکن یہ سلسلہ بھی دیر پا ثابت نہ ہوا۔ اور اخبار کے مدیر ٹیکا رام سخن سے اختلافات کی بنا پر وہ اس سے الگ ہو گئے اس کے بعد انہوں نے کبھی کسی اخبار میں ملازمت نہیں کی اور بطور فری لانسر کام کرتے رہے۔ لگ بھگ چھیالیس سال تک دہلی میں رہ کر سیاسی اور ادبی میدانوں میں برسرپیکار رہے اور آخر یہیں دہلی میں چند ماہ صاحب فراش رہ کر ۲۳ر جولائی ۱۹۹۴ کو ان کی وفات ہو گئی۔

رہبر ترقی پسند تحریک کے سرگرم رکن تھے اور بحیثیت افسانہ نگار بھی ان کا نام کافی مشہور تھا اور کرشن چندر، بیدی اور احمد ندیم قاسمی کے ساتھ ان کا نام بھی بطور حوالہ لیا جاتا تھا مگر جب انہوں

Marfat.com

نے کرشن چندر کی افسانہ نگاری پر ایک تنقیدی مضمون لکھ کر نیا ادب بمبئی کو ارسال کیا تو اسے صرف شائع ہی نہیں کیا گیا بلکہ ان کے خلاف باقاعدہ محاذ آرائی کی گئی، اور کئی رسائل کے مدیروں کو بھی ان کی تخلیقات شائع کرنے سے منع کیا گیا۔ جب پرکاش پنڈت نے "شاہراہ" میں ان کی تخلیق شائع کی تو ان سے باز پرس کی گئی۔ یہی نہیں انہیں انجمن ترقی پسند مصنفین سے نکال دیا گیا بعد میں ان پر کچھ الزامات عائد کر کے کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا سے بھی باہر کر دیا گیا۔

اردو حلقوں میں جب ان کے خلاف اڑچنیں کھڑی کی گئیں تو انہوں نے اردو کے ساتھ ساتھ ہندی میں لکھنا شروع کر دیا۔ اور جلد ہی ہندی میں انہیں اچھی مقبولیت حاصل ہو گئی۔ اگرچہ ہندی میں ان کے سات افسانوں کے مجموعے، پندرہ ناول ایک درجن کے قریب ادبی اور سیاسی کتابوں کے علاوہ ان کی بعض کتابوں کے دیگر زبانوں میں تراجم بھی شائع ہو چکے ہیں مگر ان کی تین کتابوں گاندھی بے نقاب۔ نہرو بے نقاب اور غالب بے نقاب کو غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی اول الذکر کے تو کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور آج بھی لوگ اسے دلچسپی سے پڑھتے ہیں، ہندی کے کم ہی قارئین ہوں گے جو ان کی مذکورہ کتابوں کے نام سے واقف نہ ہوں گے۔

ان کتابوں کی اشاعت کے بعد اکثر ادیب ان کی غیر موجودگی میں مذاقاً کہا کرتے تھے کہ اب انہیں "رہبر بے نقاب" لکھنی چاہیئے مگر کسی میں اتنی جرأت نہ تھی کہ وہ ان کی موجودگی میں اس طرح کی بات کہنے کی جسارت کر سکتا۔ تاہم میں نے ان کی زندگی میں ان کے افسانوں سے متعلق ایک مضمون لکھا تھا۔ رہبر بے نقاب۔ مگر بے نقاب تو اسے کیا جاتا ہے جو نقاب یا موکھٹا پہنتا ہو مگر رہبر تو موکھٹے میں یقین نہیں رکھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ دوسروں کو بے نقاب کرنے کی جرأت و حوصلہ رکھتے تھے، وہ اس بات کی قطعی پروا نہیں کرتے تھے کہ کوئی ان کی باتوں سے خوش ہوگا یا ناراض وہ بغیر لاگ لپیٹ کے ہر بات منہ پر ہی کہہ دیتے تھے۔ ان میں مصلحت آمیزی نہیں تھی شاید کھری سچی اور تلخ انداز میں بات کرنے کی وجہ سے انہوں نے دوست کم اور دشمن زیادہ بنائے تھے۔

ان سے میری پہلی ملاقات ۱۹۴۹ء میں دہلی میں ہوئی تھی۔ ان دنوں میں ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھا۔ اور دہلی میں مقیم ترقی پسندوں میں رہبر صاحب ایک اہم ادیب تھے۔ اس ملاقات کے بعد ہماری دوستی اور قربت اتنی بڑھتی گئی کہ بعد ازاں سیاسی اختلافات کے باوجود اس میں کوئی فرق نہ پڑا۔ حتی کہ جب میری شادی ہوئی تو انہوں نے بغیر فرمائش کے خود اپنی مرضی سے میرا سہرا

Marfat.com

تک لکھ ڈالا۔ اِنہی قریبی تعلقات کی وجہ سے ہی جب میری شادی کے بعد مجھے موجودہ گھر سے بے گھر ہونا پڑا تو کرائے کا مکان لینے تک مہینہ ڈیڑھ مہینے میں ان کے گھر واقع نوین شاہدرہ میں ہی قیام پذیر رہا۔ اس لگاؤ کی وجہ ہی سے صحت ٹھیک نہ ہونے کے باوجود وہ حبیب جالب کی برسی میں شامل ہوئے تھے اور یہ آخری تقریب تھی جس میں وہ شریک ہوئے اور تقریر بھی کی تھی۔ ہندی میں شہرت و مقبولیت پانے کے باجود انہوں نے اردو میں لکھنا جاری رکھا مگر بوجوہ ان کی زیادہ کتابیں اشاعت پذیر نہ ہوسکیں۔ آزادی سے پیشتر ان کی صرف دو کتابیں ایک افسانوں کا مجموعہ ''نیا اُفق'' اور ایک ناول ''تارو'' ہی منظر عام پر آیا تھا۔ آزادی کے بعد ان کے دو انسانوی مجموعے ''اہم لوگ'' اور ''اب اور تب'' چار ناول ''پریڈ گراؤنڈ'' آنکے بانکے، بات کی بات اور پرکٹی تتلی نیز تحقیق و تنقید پر مبنی تین کتابیں پریم چند، ترقی پسند ادب، ایک جائزہ اور غالب حقیقت کے آیئنہ میں شائع ہوئیں۔ اول الذکر پریم چند پر پہلی تحقیقی کتاب تھی جس میں ان کا مطالعہ مارکسی نقطۂ نظر سے کیا گیا تھا۔ اس کے بارے میں ان کا کہنا تھا کہ'' نام نہاد ترقی پسندوں کا کہنا تھا کہ پریم چند اصلاح پسند تھا اس لئے ہم پریم چند سے سو قدم آگے ہیں مگر اس کے برعکس میں محسوس کرتا تھا کہ یہ لوگ گمراہ ہیں۔ پریم چند کی روایت سے ان کا کوئی لگاؤ نہیں۔ چنانچہ میں نے پریم چند پر کتاب لکھ کر اس کے فن اور شخصیت کو نمایاں کیا اس کتاب کی مقبولیت اور اہمیت کی بنا پر اس کا ترجمہ انگریزی اور روسی میں بھی شائع ہوا تھا، بعد ازاں پریم چند پر پی ایچ ڈی کرنے والے اسکالرز نے بھی اس سے استفادہ کیا ہے مگر مقام افسوس ہے کہ انہیں پریم چند پر ہونے والے سیمیناروں میں نظر انداز کیا گیا اور ان کے حوالے بھی بہت کم دیئے یہی نہیں ترقی پسند تحریک سے متعلق کتابوں میں بھی انہیں نظر انداز کیا یا سرسری سا ذکر دیا گیا۔ اس اجتماعی محاذ آرائی کے دوران وہ یک و تنہا سینہ سپر ہو کر مقابلہ کرتے رہے۔ بعد ازاں انہوں نے اپنے رویے اور ترقی پسند تحریک پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا:

''مادی جدلیات کے اصول کے مطابق صحیح رجحان کہیں آسمان سے نہیں ٹپکتا وہ غلط رجحانات کے خلاف جدوجہد ہی سے نشوونما پاتا ہے۔ جب کرشن چندر اور اس کا فن مضمون لکھا تو اس میں صحیح سمت ضرور تھی لیکن میرا شعور زیادہ واضح نہیں تھا۔ اب جب پورے گروہ کے خلاف جدوجہد شروع ہوئی اور میں نے ترقی پسند تحریک کا مجموعی جائزہ لیا تو مجھ پر اس حقیقت کا انکشاف ہوا کہ ترقی پسند تحریک کا قافلہ شروع ہی سے گمراہ ہو گیا تھا۔ ان لوگوں

Marfat.com

نے مغرب کی اندھی تقلید میں روایت دشمنی اور سماج دشمنی کا نام ہی ترقی پسندی رکھ دیا۔ انہوں نے اس بات پر کبھی دھیان نہیں دیا کہ نیا سماج پرانے سماج کے تعلق ہی سے پیدا ہوتا ہے۔اس لئے ہر نئے دور میں ہمیں ماضی کی روایت کو سمجھنا اور اسے تاریخی ارتقا کی سمت آگے بڑھنا ہوتا ہے۔روایت کی نفی خود گمرہی کی نشانی ہے"۔

(آج کل نئی دہلی ۱۹۷۲)

رہبران معدودے چند ادیبوں میں سے تھے جو ادبی اور سیاسی دونوں محاذوں پر چومکھی لڑائی لڑتے رہے۔ پہلے وہ کانگریس سوشلسٹ پارٹی کے رکن تھے۔لیکن جیل میں قید کے دوران اشتراکیت کا مطالعہ کرنے پر وہ کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا میں شامل ہوگئے اور کمیونسٹ پارٹی کی تقسیم کے بعد مارکس وادی کمیونسٹ پارٹی میں چلے گئے۔مگر اپنے مزاج اور نظریات کی وجہ سے وہ وہاں بھی نہیں ٹکے اور چارو مجمدار کی نکسل وادی پارٹی میں شامل ہوگئے اور آخر میں وہ بھگت سنگھ منچ قائم کر کے اپنے خیالات ونظریات کی تبلیغ کرنے لگے۔ان کے ان خیالات کی جھلکیاں ان کی تخلیقات میں بھی جابجا ملتی ہیں کہیں مزدوروں کی تنظیموں کا چرچا ہے تو کہیں کا ل کوٹھریوں میں مجاہدین آزادی کی داستان بیان کی گئی ہے۔کہیں غریب محنت کش مزدوروں کے استحصال پر خون کے آنسو بہائے گئے ہیں تو کہیں غیر ملکی حکمرانوں کے جبر وستم کی روح فرسا تصویر کشی کی گئی ہے۔کہیں غریب اور بے روزگار عوام سے ہمدردی کا اظہار کیا گیا ہے تو کہیں تو ہمات اور سماجی عدم مساوات کے خلاف آواز بلند کی گئی ہے۔اور کہیں بھی یہ احساس نہیں ہوتا کہ وہ حقیقت بیانی سے انحراف کر رہے ہیں۔دراصل وہ کہانی میں پریم چند کے مقلد ہیں اور انہی کی طرح انہوں نے اپنی کہانیوں کی بنیاد حقیقت پسندی پر رکھی ہے 'گڈولنا'، 'زخم'، 'لاکٹ'، 'جھوٹ سچ'، 'مہاوت' اور وہ ناچیز نہیں تھا، اس کا زندہ ثبوت ہیں۔

ان میں پائی جانے والی تلخی اور کڑواہٹ میں سماجی نابرابری کے تحت ان سے کیا جانے والا سلوک بھی ہے جس کا اظہار انہوں نے اپنی کہانی 'زخم' میں کیا۔بقول ان کے:

"زخم میرا دوسرا یا تیسرا افسانہ ہے۔اس وقت میں ترقی پسند اور افسانہ نگاری کے بارے میں واضح طور پر کچھ نہیں سمجھتا تھا۔البتہ زندگی کے ایک سچے واقعہ کو لے کر افسانہ کے طور پر پیش کر دیا۔اس واقعہ سے میری روح پر جو زخم آیا تھا۔وہ اب تک رس رہا ہے اور اس سماجی بربریت کے خلاف روح میں جو احتجاج پیدا ہوا تھا وہ اس افسانہ میں موجود ہے اور

Marfat.com

بربریت اصلاح طلب ہے۔

میں نے بہت چاہا کہ یہ زخم بھر جائے لیکن بھرا نہیں ذرا انگور آتا ہے کہ ایک نہ ایک نئی زد آ ن پڑتی ہے۔ میں بلبلا اٹھتا ہوں کریدنے والے یہ تلخی تو دیکھ لیتے ہیں، اپنے ناخن نہیں دیکھتے۔ تلخی میرے کردار اور تحریر کا حصہ بن چکی ہے"۔

اسی طرح فنون لاہور کے ۱۹۹۱ء کے سالنامے میں ان کی کہانی "وہ ناچیز نہیں تھا"۔ شائع ہوئی تھی۔ جس کا ہیرو جیون شیخ درحقیقت اردو کا ترقی پسند ادیب و شاعر تاجور سامری تھا جو زندگی بھر انقلاب اور خوشحال عہد کی آمد کے خواب دیکھتا رہا اور مفلسی اور تنگدستی کے باوجود اشتراکی نظام لانے کے لئے کوشاں رہا۔ اس نے صحیح معنوں میں اپنے آپ کو اردو کے لئے وقف کر رکھا تھا۔ وہ اپنے رسالے کے لئے گھوم گھوم کر چندہ ہی اکٹھا نہیں کرتا تھا بلکہ پرچے کے لئے پیسے جمع کرنے کی دھن میں ایک وقت کھانے کا ناغہ کر لیتا تھا۔ اس کے علاوہ لوگوں کو بنا کچھ لئے اردو پڑھانا اس کا مشن تھا مگر جب اس کی موت ہوئی تو نہ تو کوئی تعزیتی جلسہ کیا گیا اور نہ ہی کسی رسالے میں کوئی گوشہ شائع کیا گیا کیونکہ وہ ایک مفلس اور نادار ادیب تھا۔ رہبر کا مذکورہ بالا افسانہ اس مخلص ادیب کو ایک ناقابل فراموش خراجِ عقیدت ہے۔

رہبر صاحب کے سیاسی نظریات و خیالات میں اختلاف کی گنجائش ہے اور ان کے انتہا پسند خیالات سے بھی اکثر لوگ متفق نہیں تھے لیکن اس کے باوجود ان کی سیاسی اور ادبی میدان میں چومکھی لڑائی لڑنے کی زیادہ تر نے تعریف کی ہے۔ وہ آزادی کے بھی میدان سیاست میں سرگرم عمل رہے انہوں نے موقع پرستوں کی طرح سرکاری مراعات حاصل نہیں کیں اور تنگدستی اور مفلسی کے باوجود نڈرتا سے حالات کا مقابلہ کرتے رہے۔ وہ بغیر لاگ لپیٹ کے منہ پر بات کہنے سے نہیں جھجکے۔ چاہے اس کے لئے انہیں بڑی سے بڑی قیمت چکانی پڑی۔ انہیں ساٹھ سال کی مجموعی ادبی خدمات پر کوئی اعزاز نہیں دیا گیا۔ ان پر کسی یونیورسٹی پہ کوئی ریسرچ نہیں کی گئی۔ جلسوں اور سیمیناروں میں انہیں بلانے سے احتراز کیا گیا۔ تاہم وہ ایک ایسے مردِ مجاہد تھے جس نے مفلسی اور تنگدستی کے باوجود ارباب اقتدار کے سامنے جھکنے کا نام تک نہ لیا اور موقع پرست ادیبوں کی طرح سمجھوتہ بازی جس کی فطرت میں نہ تھی۔ ضرورت ہے کہ اردو محققین رہبر کو نظر انداز کرنے کی بجائے سنجیدگی سے ان کا مطالعہ کریں۔

☆☆☆

Marfat.com